ٹارگٹ اسرائیل

اے حمید





اے حمید



میں آپ کو اپنے ایک سمندر پار کے یادگار سفر کی کہانی سنانے چلا ہوں۔ یہ سفر بھی میرے دوسرے بے یارومددگار، حیرت انگیز، مصیبتوں سے بھرے مگر ایڈونچرس سفروں کی طرح ہی تھا۔ جب میں گھر سے بھاگ کر اس سفر پر روانہ ہوا تو مجھے معلوم تھا کہ میں ایک ایسی ان دیکھی دنیا میں داخل ہو رہا ہوں، جہاں قدم قدم پر مجھے مصائب کا سامنا ہو گا۔ کوئی دوست یا بھائی نہیں ہو گا۔ پھر بھی ان جانے شہروں، پراسرار جنگلوں اور نئی دنیا کی سیاحت کا شوق مجھے آگے ہی آگے لئے جا رہا تھا۔

یہ میں سن ۱۹۴۳ء کی بات کر رہا ہوں۔ میں نویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ اس وقت دوسری عالمی جنگ بڑے زوروں پر تھی۔ مگر یہ جنگ ابھی یورپ تک ہی محدود تھی اور جاپان ابھی اس میں نہیں کودا تھا جس کی وجہ سے جنوب مشرقی ایشیاء کا علاقہ پرسکون تھا۔ یہ وہی جنگ تھی جس میں امریکہ نے ہیروشیما پر ۱۹۴۵ء میں پہلا ایٹم بم گرایا تھا جس میں ڈیڑھ لاکھ انسان پل بھر میں جل کر راکھ ہو گئے تھے۔ مگر ابھی بنگال اور جنوب مشرق کے دوسرے علاقوں میں حالات نارمل تھے۔ اگرچہ اس بات کا خدشہ ضرور تھا کہ جاپان بھی اعلان جنگ کر دے گا۔ بہرحال میرا شوق سیاحت مجھے گھر سے نکال کر اس یادگار تاریخی سفر پر لے اڑا۔

میرے پاس سوائے تن کے کپڑوں اور کچھ روپوں کے اور کچھ نہیں تھا۔ میں سفر میں اپنے ساتھ سامان رکھنے کے خلاف تھا۔ سامان کے بغیر میں آزادی محسوس کرتا۔ کہ جب اور جہاں چاہے ریل گاڑی سے اتر کر جا سکتا تھا۔ میں ٹرین کے ذریعے کلکتہ پہنچا۔ یہ ساون بھادوں کے دن تھے۔ بارشیں ہو رہی تھیں۔ جدھر میں جا رہا تھا ان علاقوں میں

ساون میں بارشیں بہت زیادہ ہوتی ہیں۔ کئی کئی دن سورج نظر نہیں آتا۔ آسمان بادلوں سے ڈھکا رہتا ہے۔ بوندا باندی ہوتی رہتی ہے۔ مجھے اس حقیقت کا علم نہیں تھا کہ ساون بھادوں میں جنوب مشرقی ایشیاء کے سمندر چڑھے ہوتے ہیں' اور سمندری سفر بڑا خطرناک ہوتا ہے۔

بہرحال میں خضر پور کی جیٹی یعنی بندرگاہ سے ایک سمندری جہاز میں سوار ہو گیا۔ رنگون چونکہ انگریزوں کی عملداری میں تھا۔ اس لئے پاسپورٹ ویزے کی ضرورت نہیں تھی۔ بس خضر پور جیٹی پر مسافروں کو ٹیکے لگا کر ایک میڈیکل سرٹیفکیٹ دے دیا گیا۔ میں نے کلکتے سے رنگون تک سمندری جہاز کے تھرڈ کلاس کا ۲۵ روپے کرایہ ادا کیا تھا۔ یہ سمندر میں تین دن کا سفر تھا جس سمندر میں ہمارے جہاز کو سفر کرنا تھا' وہ خلیج بنگال کا سمندر تھا۔ جسے کالا پانی بھی کہا جاتا ہے' اس کی وجہ یہ ہے کہ اس سمندر کا پانی کالا سیاہ ہے۔ بالکل تارکول کی طرح۔ آپ چلو بھر کر دیکھیں تو وہ کالا نہیں ہوتا۔ عام پانی کی طرح سفید ہوتا ہے۔ مگر سمندر کو دیکھیں تو اس کا رنگ بالکل سیاہ ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ اس کی وجہ سمندر کی گہرائی اور تہہ میں اگی ہوئی سیاہ جھاڑیاں جنگل اور سیاہ چٹانیں ہیں۔

میں نے ابھی تک کالا پانی نہیں دیکھا تھا۔ یہ میرا پہلا موقع اور اس علاقے میں پہلا سفر تھا۔ میں بھی دوسرے مسافروں کے ساتھ جہاز کے عرشے یعنی ڈیک پر چڑھ گیا۔ تھرڈ کلاس کے مسافر ڈیک پر ہی بیٹھا کرتے تھے۔ مسافروں میں گجراتی' مارواڑی' صورتی میمن اور پوربیے ---- سبھی قوموں کے لوگ تھے۔ سب نے اپنا اپنا سامان ڈیک کے درمیان میں لگا کر اوپر چادریں وغیرہ تان لی تھیں' تاکہ بارش سے بچاؤ ہو سکے۔ میرے پاس نہ کوئی سامان تھا نہ چادر۔ پھر بھی میں بڑا خوش تھا۔ کہ سمندر میں سفر کروں گا' یہ میرا پہلا سمندری سفر تھا جب یہ خیال کرتا کہ کل ہمارا جہاز کھلے سمندر میں ہو گا۔ چاروں طرف پانی ہی پانی ہو گا تو دل مسرت سے لبریز ہو جاتا۔ یہ خبر نہیں تھی کہ اس وقت میری کیا حالت ہونے والی ہے۔

خضر پور جیٹی سے آپ رنگون کی طرف سفر کریں تو ایکدم سے سمندر نہیں آجاتا۔

جہاز دس بارہ گھنٹے کا سفر ایک دریا میں کرتا ہے جس کا نام دریائے ہگلی ہے۔ اس وقت بھی جہاز دریا میں ہی کھڑا تھا۔ جہاز کے نچلے اور اوپر والے ڈیک پر بڑے بڑے تختے لگے تھے جن پر سے گزر کر مسافر اور قلی سامان اٹھائے جہاز میں داخل ہو رہے تھے۔ میں ڈیک کے جنگلے کے ساتھ لگا یہ دلچسپ منظر دیکھ رہا تھا۔ آسمان بادلوں میں ڈھکا ہوا تھا مگر بارش رکی ہوئی تھی۔ آخر جہاز کے تختے نیچے کھینچ لئے گئے۔ جیٹی پر لوہے کے بڑے بڑے کھمبوں سے بندھے ہوئے رسے کھول کر جہاز کے اوپر اچھال دیئے گئے۔ جہاز نے ہارن بجانے شروع کر دیئے۔ پھر مجھے اپنے پاؤں کے نیچے لکڑی کے فرش میں لرزش محسوس ہوئی۔ جہاز کے انجن سٹارٹ ہو گئے تھے۔ میں بڑے شوق سے نیچے دیکھنے لگا۔ جہاز آہستہ آہستہ بندرگاہ کے پلیٹ فارم کو چھوڑ کر پیچھے ہٹنے لگا تھا۔ جب وہ کافی پیچھے ہٹ گیا تو پھر دریا میں بالکل سیدھ میں چلنے لگا۔ میں دوڑ کر جہاز کے سامنے والے حصے میں آگیا' جہاں جہاز کے دونوں پہلو آ کر ملتے تھے۔ یہاں ایک جھنڈا ہوا میں پھڑپھڑا رہا تھا۔

اس وقت دن کے دس گیارہ کا ٹائم ہو گا۔ جہاز شام تک دریا میں سفر کرتا رہا۔ ابھی تک سفر بڑا ہموار تھا اور جہاز بالکل نہیں ڈول رہا تھا۔ دونوں طرف کے کنارے آہستہ آہستہ دور ہوتے جا رہے تھے۔ شام کے وقت وہ اتنے دور ہو گئے کہ سیاہ لکیروں کی مانند دکھائی دیتے۔ اب جو میں نے نیچے جھک کر دیکھا تو دریا کے گدلے پانی میں سمندر کا پانی بھی گھل مل رہا تھا۔ میں بڑا خوش ہوا کہ سمندر قریب آرہا ہے۔

پھر اندھیرا چھا گیا۔ اگرچہ ادھر کے علاقے میں جنگ کا کوئی فوری خطرہ نہیں تھا اس کے باوجود جہاز پر رات کو بلیک آؤٹ کر دیا گیا۔ میں وہیں ڈیک پر ایک طرف پڑ کر سو گیا۔ صبح آنکھ کھلی تو جہاز ڈول رہا تھا مجھے چکر آنے لگے۔ جنگلے کو پکڑ کر دیکھا تو دل پر خوف طاری ہو گیا۔ چاروں طرف کالا سیاہ سمندر ہی سمندر تھا۔ اس قدر کالا حبشی ٹائپ کا سمندر میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ پہلا خیال جو دل میں آیا وہ یہ تھا کہ اگر جہاز ڈوب گیا تو میں زندہ نہیں بچوں گا۔ مجھے افسوس ہونے لگا کہ میں جہاز پر کیوں بیٹھ گیا۔ سفر کرنا ہی تھا تو کسی جنگل کسی صحرا کی طرف نکل جاتا۔ اس وقت مجھے خشک' زمین ماں کی گود کی طرح یاد

آنے لگی۔ مگر میں پھنس گیا تھا۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ جہاز ڈول رہا تھا' کھلے سمندر میں اگر طوفان نہ ہو تو سمندر میں بڑی بڑی لہریں نہیں اٹھتیں بلکہ سمندر اوپر نیچے ہوتا رہتا ہے۔ ہمارا جہاز تو اوپر نیچے بھی ہو رہا تھا اور دائیں بائیں ڈول بھی رہا تھا۔ میں دعائیں مانگنے لگا کہ یا اللہ کسی طرح جہاز خشکی کے ساتھ جا لگے۔

مگر یہ تین دن کا سفر تھا۔ ریل گاڑی ہوتی تو میں اتر جاتا۔ سمندری جہاز سے میں نیچے بھی نہیں اتر سکتا تھا۔ صبر کر کے بیٹھا رہا۔ دن گزر گیا جب رات آئی تو اچانک ہوائیں تیز ہو گئیں۔ بارش بھی شروع ہو گئی۔ میں ڈیک کے درمیان جہاں لنگر ڈالنے والی مشین تھی وہاں ترپال کے نیچے آ کر بیٹھ گیا۔ ہوا تیز ہوتی گئی۔ پھر سمندر میں جیسے طوفان آ گیا۔ جہاز دائیں بائیں بری طرح ڈولنے لگا۔ میں نے لنگر کی زنجیر کو پکڑ لیا۔ سمندری موجیں شور مچاتی آئیں اور جہاز سے ٹکرا کر اسے دوسری طرف دھکیل لے کر جاتیں۔ مسافروں میں افراتفری سی مچ گئی تھی طوفان بڑھتا چلا گیا۔ سمندری موجوں کا پانی ڈیک پر آنے لگا۔ ایک طرف سے سمندر کی لہر آتی اور جہاز کے ڈیک پر سے ہو کر دوسری طرف نکل جاتی۔ عین اسی وقت خطرے کا الارم بج اٹھا۔ مسافر چیخ و پکار کرتے نچلے ڈیک کی طرف بھاگنے لگے۔ مجھے معلوم تھا کہ اگر میں نے زنجیر کو چھوڑ دیا تو طوفانی موجیں مجھے اپنے ساتھ بہا کر سمند میں لے جائیں گی۔ میں وہیں زنجیر سے چمٹا طوفان میں بیٹھا رہا۔

===== ❑ ❑ =====

سمندر میں طوفان آیا ہوا تھا اور میں سمندری جہاز کے ڈیک پر لنگر ڈالنے والی مشین کی زنجیر پکڑے سہما ہوا بیٹھا تھا۔ بارش تیز ہواؤں کی چیخیں اور موجوں کے تھپیڑے ----- لگتا تھا جہاز اب ڈوبا کہ ڈوبا۔ مجھے جتنی دعائیں یاد تھیں پڑھ ڈالیں۔ سخت پچھتا رہا تھا کہ اس موسم میں سمندری سفر پر کیوں نکل پڑا۔ خوامخواہ مجھے الف لیلیٰ والے سند باد جہازی کا خیال آنے لگا کہ ہر بار جب وہ سفر پر نکلتا تو اس کا جہاز ڈوب جاتا تھا۔ میں نے دل میں کہا یا اللہ مجھے سند باد کے انجام سے بچانا۔ وہ تو جہاز ڈوبنے کے بعد کسی نہ کسی جزیرے پر جا پہنچتا تھا اور یہاں تو سمندر کی پہاڑ پہاڑ جتنی طوفانی موجیں ہم سب کو تنکوں کی طرح بہا کر لے جائیں گی۔

خدا جانے کس نیک آدمی کی دعا قبول ہوئی اور طوفان کا زور کم ہونا شروع ہو گیا۔ دن نکلا تو طوفان گزر گیا تھا مگر سمندر میں بڑی بڑی موجیں اسی طرح اٹھ رہی تھیں۔ خدا خدا کر کے وہ دن بھی گزر گیا۔ تیسرے دن سمندر میں قدرے سکون ہو گیا۔ مگر سمندر چڑھا ہوا تھا اور اس کی موجیں جہاز کے ڈیک کے ساتھ لگ کر گزر رہی تھیں۔ ایک دیہاتی قسم کے مسافر نے کیا کیا کہ بالٹی ہاتھ میں لے لی اور ڈیک پر جھک کر سمندر میں سے پانی بھرنے لگا۔ جونہی بالٹی بے پناہ دباؤ اور طاقت والی سمندری موجوں سے ٹکرائی اچھل کر اس کے ہاتھ سے نکلی اور خدا جانے سمندر میں کہاں کی کہاں چلی گئی۔ مسافر بے حد خوش قسمت تھا کہ بالٹی اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی تھی' ورنہ بالٹی کے ساتھ وہ بھی سمندر کی گہرائیوں میں غائب ہو چکا ہوتا۔ دوسرے مسافروں نے اسے کھینچ کر پیچھے گرا دیا اور یوں اس کی جان بچ گئی۔

اس جہاز پر ہی میری ملاقات وزیر آباد کے ایک لڑکے سے ہو گئی جس کا نام احمد تھا۔ وہ بھی میری عمر کا تھا اور اس کا باپ رنگون میں پھلوں کا کاروبار کرتا تھا وہ وزیر آباد اپنے نانا سے ملنے آیا تھا اور اب واپس رنگون جا رہا تھا۔ جب اسے پتہ چلا کہ میں پہلی بار رنگون جا رہا ہوں اور وہاں میرا ٹھکانہ بھی کوئی نہیں تو اس نے کہا تم ہمارے گھر چلے چلنا۔ میرے ابو تمہیں کہیں نہ کہیں کوئی کام بھی دلا دیں گے۔ میرے لئے یہی بہت تھا کہ سمندر پار اجنبی جگہ پر مجھے دربدری نہیں کرنی پڑے گی۔

تیسرے دن دوپہر کے وقت ہمارا جہاز برما کے دریائے اراوتی میں داخل ہو گیا۔ کالا پانی پیچھے رہ گیا تھا۔ دریا کے کنارے آہستہ آہستہ قریب آ رہے تھے۔ سورج غروب ہونے لگا تو جہاز رنگون کی بندرگاہ میں داخل ہو گیا۔ یہاں کئی ملکوں کے بحری جہاز کھڑے تھے۔ میں جہاز سے اترا تو زمین بھی ڈولتی ہوئی محسوس ہوئی۔ یہ تین دن کے طوفانی سمندر کے سفر کا اثر تھا۔ احمد کے والد صاحب اسے لینے آئے ہوئے تھے۔ اونچے لمبے آدمی تھے چھوٹی داڑھی تھی سر پر آدھی ٹوپی رکھی تھی۔ احمد نے میرا تعارف کروایا اور بتایا کہ میرا رنگون میں کوئی جاننے والا نہیں ہے۔ احمد اپنے والد کو میاں جی کہتا تھا۔ میاں جی نے تیز نظروں سے مجھے گھورا اور کہا۔

"یہاں کوئی جاننے والا نہیں تھا تو گھر سے کیوں نکل پڑے؟ گھر سے بھاگ کر آئے ہو"

میں نے کہا۔ "ہاں جی اسکول میں مار پڑتی تھی"

میاں جی مسکرائے پھر ایک دم سنجیدہ ہو گئے اور بولے۔

"سب سے پہلے اپنے ماں باپ کو خط لکھ کر انہیں بتاؤ کہ تم خیریت سے ہو خدا جانے آج کل کے لڑکوں کو کیا ہو گیا ہے"

اس زمانے میں موٹر کار کسی کسی کے پاس ہوتی تھی۔ احمد کے والد صاحب یعنی میاں جی بھی اپنی بگھی میں آئے تھے جو ایک ڈبے کی طرح بنی تھی۔ ان کی چھوٹی سی کوٹھی رنگون شہر کے کھلے علاقے میں ایک سرسبز گراؤنڈ کے سامنے واقع تھی۔ اس کوٹھی کا پورا نقشہ اتنے برس گذر جانے کے بعد آج بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ میرے لئے

رات کو بگھی کے گیراج میں ایک کیمپ کارٹ ڈال دی گئی۔ کیمپ کارٹ ایک کم چوڑائی الی فوجی چارپائی ہوتی ہے۔ لکڑی کے فریم پر ترپال منڈھ دی جاتی ہے۔ یہ چارپائی تہہ بھی ہو جاتی ہے۔ گیراج میں مچھروں نے حملہ کر دیا۔ رنگون کے مچھر دیکھ کر میں کانپ تھا۔ اتنے صحت مند مچھر پہلے نہیں دیکھے تھے۔ دوسرے دن احمد نے مجھے ایک لوبان سا ے دیا جس کی دھونی لگائی۔ اس کے دھوئیں میں مچھر تو بھاگ گئے مگر میرا ناک میں دم آگیا۔ لیکن آہستہ آہستہ میں اس کا عادی ہو گیا۔

میاں جی نے سب سے پہلے مجھ سے گھر خط لکھوایا کہ میں رنگون میں خیریت سے ہوں۔ اس کے بعد انہوں نے مجھے اپنے گودام میں کام پر لگا دیا۔ میرا کام دوسرے مزدوروں کے ساتھ پھلوں کے کریٹ سر پر اٹھا کر ٹرکوں میں لادنا تھا۔ میری عمر زیادہ نہیں تھی مگر جسم بڑا مضبوط تھا۔ اتوار کو چھٹی ہوتی میں احمد کے ساتھ مل کر رنگون شہر کی سیر کو نکل جاتا۔ یہ ۱۹۴۳ء کا رنگون تھا۔ وہاں ایک مغل سٹریٹ تھی جہاں دکانوں کے آگے اردو کے بورڈ بھی لگے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ رنگون میں اردو زبان کا بڑا چرچا ہے۔ برمی اور برصغیر کے لوگ آپس میں ٹوٹی پھوٹی اردو میں ہی بات کرتے تھے۔

رنگون میں مسلمانوں کی خاصی تعداد آباد تھی۔ قرار داد لاہور منظور ہو چکی تھی۔ رنگون کے مسلمانوں میں پاکستان کے حق میں زبردست جوش و خروش پایا جاتا تھا۔ رنگون کی مسجدوں میں جمعہ کی نماز کے بعد پاکستان کے حق میں تقریریں ہوتیں۔ احمد کے والد صاحب رنگون مسلم لیگ کے ممبر تھے۔ ان کی کوٹھی پر ہر دوسرے تیسرے دن علاقے کے مسلمان جمع ہوتے اور پاکستان کے بارے میں زبردست جوش و خروش کا اظہار کیا جاتا۔

ایک بار میں بھی میاں جی کے ساتھ جمعہ پڑھنے رنگون کی سورتی مسجد میں گیا۔ احمد ل ہمارے ساتھ تھا۔ نماز کے بعد مسلم لیگ کا جلوس نکالا گیا۔ جلوس میں کافی لوگ تھے۔ ستان زندہ باد کے نعرے لگاتا جلوس مغل سٹریٹ کے آخری کونے تک گیا۔ ہم نے بھی لم لیگ کی سبز جھنڈیاں تھام رکھی تھیں اور نعرے لگا رہے تھے۔

ایک دن احمد مجھے کہنے لگا۔

"یہاں دریا کنارے جنگل میں ایک اجاڑ کھنڈر ہے۔ کہتے ہیں وہاں کسی شہزادی کی روح آدھی رات کو آتی ہے؟"

میں نے جلدی سے کہا۔

"مجھے وہ کھنڈر دکھاؤ۔ میں شہزادی کی روح سے ملاقات کروں گا"

احمد نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔

"نا بابا۔ میں نہیں جاؤں گا۔ میاں جی کو پتہ چل گیا تو ہم دونوں کی پٹائی ہو گی"

مگر مجھ پر اجاڑ کھنڈروں کی آسیبی شہزادی سے ملنے کا ایسا بھوت سوار ہوا کہ میں۔

ایک دن احمد کو اپنے ساتھ لے کر دریا کنارے نکل آیا۔ رنگون میں جو دریا شہر میں سے ہو کر گذرتا ہے اس کا نام ایراوتی ہے۔ احمد نے مجھ سے قسم لے لی تھی کہ میں اس کا ذکر میاں جی سے نہیں کروں گا۔ ہم دریا سے ہٹ کر ناریل کے گھنے درختوں اور جھاڑیوں میں سے گذرتے ایک ایسی جگہ پہنچے جہاں درختوں کے درمیان بانس کی ایک چھوٹی سی چائے کی دکان بنی ہوئی تھی۔ یہاں کچھ دیہاتی لوگ باہر گھاس پر بیٹھے مٹی کی پیالیوں میں چائے پی رہے تھے۔ ہم بھی ایک طرف بیٹھ گئے احمد کہنے لگا۔

"یہاں سے آسیبی شہزادی والا کھنڈر تھوڑا دور ہے۔ میں اب بھی کہتا ہوں کہ یہ خیال دل سے نکال دو اور واپس چلے چلو۔"

میں نے سینہ تان کر کہا۔ "میں کسی بھوت پریت سے نہیں ڈرتا میں شہزادی کی روح سے ضرور ملوں گا۔"

احمد نے جنگل کی طرف دیکھا۔ اس وقت ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہو گئی تھی۔ احمد نے جنگل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"تو پھر جاؤ۔ وہ جو پگ ڈنڈی ہے وہ تمہیں اجاڑ کھنڈر میں پہنچا دے گی۔ میں گھر جا رہا ہوں"

یہ کہہ کر احمد اٹھ کر چلا گیا۔ میں نے اللہ کا نام لیا اور آسیبی شہزادی والے اجاڑ کھنڈر کی طرف چل پڑا۔

میں جنگل میں آسیبی کھنڈر کی طرف چلا جا رہا تھا۔

یہ میری حماقت تھی۔ مجھے محض تجسس کی خاطر اس قسم کا خطرناک قدم نہیں اٹھانا چاہئے تھا۔ لیکن وہ نوعمری کا زمانہ تھا اور اس زمانے میں آدمی پر جذبات کی حکمرانی ہوتی ہے۔ میں اس خیال سے ادھر چل پڑا تھا کہ اول تو کوئی آسیب وغیرہ نہیں ہوتا' اور اگر ہو ابھی تو شہزادی کی بھٹکتی روح سے ملاقات ہو جائے گی۔

جیسا کہ میں پہلے ذکر کر چکا ہوں اس روز ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی۔ یہ جنگل شہر کے قریب ہونے کی وجہ سے اتنا گھنا تو نہیں تھا۔ لیکن اونچی اونچی جھاڑیوں کی اتنی بھرمار تھی کہ پانچ قدموں کے فاصلے سے آگے کچھ نظر نہ آتا تھا۔ کھنڈر کی شہزادی کی بھٹکتی ہوئی روح سے ملاقات کا شوق مجھے کشاں کشاں کھنڈر کی طرف لئے جا رہا تھا۔ یہاں ناریل' تاڑ اور املی کے گنجان درخت تھے۔ گھاس گھٹنوں تک پہنچ رہی تھی۔ ایک جھاڑی کی اوٹ سے نکلا تو سامنے قدرے بلندی پر ایک کھنڈر نظر آیا۔

یہ کھنڈر کسی پرانے قلعے کا لگتا تھا جس کی چھتیں ڈھے چکی تھیں۔ دیواریں بارش کی وجہ سے کالی پڑ گئی تھیں۔ ان پر جنگلی بیلیں چڑھی ہوئی تھیں۔ میں آہستہ آہستہ چلتا کھنڈر کے قریب آکر رک گیا۔ چڑھائی پر ایک پتلی پگڈنڈی جاتی تھی۔ اس وقت بادلوں میں ہلکی کی گرج سنائی دی۔ جیسے قدرت مجھے کھنڈر کی طرف جانے سے روک رہی ہو۔ مگر ایسا نہیں تھا بادلوں کی گرج نے میرے شوق کو مزید تیز کر دیا اور میں چڑھائی پر سے ہو کر کھنڈر کے گیٹ پر آ گیا۔ گیٹ غائب تھا۔ صرف دو دیواریں کھڑی تھیں' جن کو جنگلی بیلوں نے

ڈھانپ رکھا تھا۔ میں نے اللہ کا نام لیا اور کھنڈر میں داخل ہو گیا۔ دل میں یہ خیال ضرور تھا کہ احمد کے کہنے کے مطابق کسی شہزادی کی بھٹکی ہوئی روح صرف رات کو وہاں نمودار ہوتی ہے اور اس وقت شام بھی نہیں ہوئی تھی۔ مگر کالی کالی سیاہ گھٹاؤں کی وجہ سے ماحول میں اندھیرا سا چھا گیا تھا اور شام کا سماں ہی لگتا تھا۔

کھنڈر میں جگہ جگہ پتھروں کے ستون گرے پڑے تھے۔ اینٹوں کے ڈھیروں میں بھی گھاس اگ آئی تھی۔ آگے ایک غار سا بنا تھا جو نیچے کھنڈر کے تہہ خانے میں جاتا تھا۔ غار میں اندھیرا تھا قریب ہی ایک چبوترہ تھا۔ میں چبوترے کے سامنے املی کے درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ اتنے میں مجھے ایسی آواز سنائی دی جیسے کوئی میرے قریب ہی گہرے گہرے سانس لے رہا ہو۔ میں نے پیچھے دیکھا۔ وہاں جنگلی جھاڑیوں کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ میں اپنی طرف سے بڑا بہادر بن رہا تھا۔ اور حقیقت بھی یہ ہے کہ مجھے اس وقت اتنا زیادہ خوف بھی محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ گہرے سانسوں کی آواز برابر آ رہی تھی۔ میں نے پکار کر پوچھا۔

"کون ہے"؟

جواب میں بارش کی رم جھم ہی سنائی دی۔ میں نے ایک پتھر اٹھا کر زور سے غار کے اندر پھینکا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ یہ آواز غار کے اندر سے آ رہی ہے۔ میرے پتھر پھینکنے سے وہ پراسرار آواز رک گئی۔ اس کے ساتھ ہی بادل زور سے گرجا اور بارش ہونے لگی۔ وہاں موسلادھار بارش سے بچنے کے لئے کوئی جگہ نہ تھی۔ چنانچہ میں واپس چل پڑا۔ بانس کے چائے خانے میں آ کر بارش سے پناہ لی۔ میرے کپڑے بھیگ گئے تھے۔ چائے خانے میں دو چار برمی بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ ایک پختہ عمر کے برمی نے مجھ سے ٹوٹی پھوٹی اردو میں پوچھا کہ میں کہاں سے آ رہا ہوں؟ میں نے اسے بتایا کہ میں آسیبی کھنڈر کی طرف گیا تھا۔ اور میں نے کسی کے سانس کی آواز سنی تھی۔ وہ لوگ ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ پختہ عمر کے برمی نے کہا کہ میں خوش قسمت ہوں جو زندہ واپس آ گیا۔ میں نے ہنس کر کہا' زندگی اور موت تو اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ یہ جھوٹ موٹ کے آسیب میرا کچھ

نہیں بگاڑ سکتے۔

میں ایک رکشے میں بیٹھ کر احمد کی کوٹھی پہنچا تو شام ہو گئی تھی۔ وہ مجھے دیکھتے ہی دوڑتا ہوا میرے پاس آ گیا۔

"کیا شہزادی کی روح سے ملاقات ہوئی تمہاری"؟

میں نے کہا "وہاں کوئی ایسی روح نہیں ہے یار۔ تم تو خواہ مخواہ مجھے ڈرا رہے تھے"۔

وہ بولا۔ "مگر وہ تو رات کو کھنڈر میں آتی ہے"۔

میں نے کہا "رات کو بھی وہاں کوئی روح نہیں آتی۔ یہ سب وہم کی باتیں ہیں"۔

وقت گذرتا چلا گیا۔ میں نے ایک ماہ تک احمد کے گودام میں پھلوں کے کریٹ ڈھوئے اور پھر ایک عجیب اتفاق سے مجھے رنگون کے اردو اخبار شیر رنگون میں نوکری مل گئی۔ احمد کے والد صاحب سے ایک ادھیڑ عمر کے باوقار شخصیت کے مالک قاضی صاحب ملنے آیا کرتے تھے۔ میں ان دنوں علامہ اقبال کی نظمیں گا کر پڑھا کرتا تھا۔ قاضی صاحب نے ایک روز مجھے سنا تو پوچھا۔ تم کتنا پڑھے ہو؟ میں نے کہا نویں جماعت سے بھاگا ہوں۔ وہ مسکرائے کہنے لگے ہمارے اخبار میں کام کرو گے؟ یوں مجھے پھلوں کے کریٹ اٹھا اٹھا کر ٹرکوں میں لادنے سے نجات مل گئی اور میں قاضی صاحب کے اخبار میں آ گیا۔ یہاں میرا کام پریس سے نکلتے اخباروں کو تہہ کر کے الگ رکھنا تھا دوسرے لڑکے بھی میرے ساتھ کام کرتے تھے۔

رنگون میں اردو کے دو اخبار نکلتے تھے۔ ایک شیر رنگون اور دوسرا مجاہد برما ----- یہ دونوں اخبار سابق وزیر قانون ایس ایم ظفر صاحب کے والد گرامی سید کشفی شاہ نکالتے تھے۔ یہ مجھے بعد میں معلوم ہوا ----- مشہور صحافی باری علیگ بھی ان اخباروں کے ایڈیٹر رہ چکے تھے۔ یہاں بڑا ادبی قسم کا ماحول تھا۔ اب مجھے رنگون شہر کی سیر و سیاحت کے لئے کافی وقت مل جاتا تھا۔ مجھے رنگون کی بارش بہت اچھی لگتی تھی۔ یہاں کے زرد رنگ کے چھوٹے چھوٹے کیلے بڑے میٹھے تھے۔ لوگوں میں چائے کی بجائے کافی پینے کا زیادہ رواج تھا۔ اخبار کے چیف ایڈیٹر قاضی صاحب کے ایک دوست بشیر تھے جو رنگون سے تھوڑی

دور مضافات میں قصبے کمائیٹ میں رہتے تھے۔ وہاں ان کی بڑی عالی شان دو منزلہ کوٹھی تھی۔ ان کا کینوس کے بوٹوں کا کارخانہ تھا۔ بعد میں بشیر صاحب نے گجرات میں آکر باٹکو انڈسٹریز کے نام سے اپنا کاروبار شروع کیا۔ قاضی صاحب کے ایک دوست حکیم رشید صاحب بھی تھے۔ مغل سٹریٹ والے اقبال صاحب بھی تھے۔ جن کی فرنیچر کی دوکان تھی۔ یہ سب لوگ ہفتے میں ایک بار اپنے اپنے ہاں دعوت کرتے تھے۔ ایک بار بشیر صاحب کی کمائیٹ والی کوٹھی میں دعوت تھی۔ میں بھی وہاں موجود تھا۔ کوٹھی کے اردگرد بڑا سبزہ اور اونچی نیچی پہاڑی ڈھلوانیں تھیں۔ میں ان پہاڑی ٹیلوں میں گھومنے پھرنے کے لئے نکل گیا۔ برسات کا موسم جا رہا تھا مگر تال تلیاں ابھی تک بھری ہوئی تھیں۔ ایک تال کے کنارے کنارے کیلے کے درختوں کی قطار چلی گئی تھی۔ ان میں زرد کیلوں کے پکے ہوئے گچھے لٹک رہے تھے۔ میں کیلے توڑنے کے لئے ان درختوں کی طرف بڑھا ابھی میں نے ایک کیلا توڑا تھا کہ مجھے اپنے پیچھے پھنکار کی آواز سنائی دی۔ پلٹ کر دیکھا تو میرا رنگ اڑ گیا۔ جسم دہشت کے مارے ٹھنڈا پڑ گیا۔ میرے پیچھے بمشکل دو قدم کے فاصلے پر ایک کالا ناگ زمین سے تین فٹ اونچا پھن پھیلائے میری طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ اس کی سرخ زبان بار بار اس کے منہ سے نکل رہی تھی۔ میں تو جیسے اپنی جگہ پر پتھر سا بن گیا۔ پاؤں جیسے من من بھاری ہو گئے تھے۔ سانپ آہستہ آہستہ میری طرف کھسک رہا تھا۔ اس کی پھنکار میری روح فنا کر رہی تھی۔



میں کوئی روایتی داستان گو تو نہیں ہوں مگر میرے ساتھ داستانیں بڑی عجیب و غریب گزری ہیں۔ ایسے ایسے حالات سے واسطہ پڑا۔ ایسے ایسے دشوار گزار خطرناک جنگلوں' ویرانوں میں راتیں بسر کرنی پڑیں کہ آج ان کا تصور کر کے مجھے بھی تعجب ہوتا ہے۔ جنوب مشرقی ایشیا کی بلند و بالا عمارتوں' کشادہ شاہراہوں اور کھلے پارکوں والے شہروں میں بے یار و مددگار بھوکا پیاسا بھی پھرتا رہا اور نیک دل لوگوں کی مہمان نوازی کا بھی لطف اٹھایا۔ ایک بات کی وضاحت میں یہاں ضروری سمجھتا ہوں۔ اور وہ یہ ہے کہ ان دنوں میری عمر پندرہ سولہ سال سے زیادہ نہیں تھی۔ مجھے خانہ بدوشی اور ملک ملک' جنگل جنگل کی سیر کا شوق گھر سے لے اڑا تھا۔ میں نئے نئے لوگ' نئے نئے جنگل' دریا' پہاڑ' شہر اور اجنبی ریلوے اسٹیشن' بندرگاہیں اور وہاں کی موسلادھار بارشیں مرطوب استوائی آسمان پر سفید اور نیلے پھولوں کی طرح کھلے ہوئے ستارے اور بانس کے گھنے جنگلوں میں سے گزرتے دریاؤں کی روانی دیکھنا چاہتا تھا۔ ان کی آواز سننا چاہتا تھا۔ یہ شوق بچپن ہی سے میرے دل میں بیدار ہو گیا تھا۔

اب میں اپنی داستان کو وہیں سے شروع کرتا ہوں جہاں میں نے اسے پچھلی اتوار کو چھوڑا تھا۔ یعنی میں دوسری عالمی جنگ کے رنگون شہر کے مضافات کی کمائیٹ نامی بستی میں بشیر صاحب کی کوٹھی کے عقبی باغیچے میں کیلے توڑنے کے لئے درخت کی طرف بڑھا تھا کہ پیچھے سے سانپ کی پھنکار سنائی دی۔ پلٹ کر دیکھا تو ایک کافی بڑا سانپ پھن اٹھائے مجھے گھور رہا تھا۔

بشیر صاحب کی کوٹھی کی دوسری منزل سے مہمانوں کے ہنسنے بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ مگر سانپ نے جیسے مجھ سے کسی کو مدد کے لئے پکارنے کی طاقت چھین لی تھی۔ سانپ بڑے غیر محسوس انداز میں آہستہ آہستہ میری طرف کھسک بھی رہا تھا۔ نو عمری کے زمانے میں دوڑ لگانے میں بڑا تیز تھا۔ لیکن اس وقت پاؤں جیسے من من بھاری ہو گئے تھے۔ میں تو یہی کہوں گا کہ اللہ کو ابھی میری موت منظور نہیں تھی۔ عین اس وقت ایک بلی کسی طرف سے نکل آئی۔ وہ سانپ کو دیکھ کر غراتی ہوئی ایک طرف کو بھاگی سانپ کی توجہ بلی کی طرف ہو گئی اور وہ مجھے چھوڑ کر اس کے پیچھے تیزی سے بڑھ گیا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور دوڑ کر کوٹھی کی دوسری منزل پر آ گیا۔

رنگون شہر سے کچھ دور آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کا مزار تھا۔ مزار پختہ تھا مگر اس پر کوئی گنبد نہیں تھا۔ مزار کے پاس ہی دو شکستہ سے مہمان خانے تھے۔ مجاور نے بتایا کہ اصل میں یہ قید خانہ تھا جس میں آخری مغل بادشاہ نے اپنی نظربندی کے پانچ سال گذارے اور ۱۸۶۲ء میں وہیں انتقال کیا۔ مزار کی دیواروں پر لوگوں نے کوئلے اور چاک سے جابجا شعر لکھ رکھے تھے۔ دیوار پر ظفر ہی کا ایک شعر لکھا تھا۔

ظفر آدمی اس کو نہ جانئے گا
ہو وہ کیسا ہی صاحب فہم و ذکا
جسے عیش میں یاد خدا نہ رہا
جسے طیش میں خوف خدا نہ رہا

ایک بادشاہ کے حوالے سے مجھے یہ شعر بڑا مناسب لگا۔ کیونکہ عیش اور طیش زیادہ تر بادشاہوں کے حصے میں ہی آیا کرتے ہیں۔ رنگون سے ۲۷۰ کلو میٹر شمال مغرب میں پروم شہر ہے۔ اس شہر میں اکثریت مسلمانوں کی ہے۔ مسلمان یہاں تاجر پیشہ ہیں اور تحریک پاکستان کے زمانے میں انہوں نے بھی اس تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ رنگون شہر میں بھی مسلمان کافی تعداد میں آباد تھے اور کوئی دن ایسا نہیں جاتا تھا کہ جب مسلم اکثریت والے علاقے مغل سٹریٹ میں مقامی مسلم لیگ کا کوئی جلوس نہ نکلتا ہو۔ لیکن مجھے سیاست

سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں ناریل اور پیگوڈاؤں کے اس خطے میں آوارہ گردی یا زیادہ مہذب الفاظ میں سیر و سیاحت کرنے آیا تھا اور یہی کام کرتا تھا۔ اخبار کے دفتر میں میرا دل نہ لگتا اور میں وقت بے وقت شہر کی آوارہ گردی کو نکل جاتا۔ مجھے شہر میں بے مقصد گھومنے پھرنے میں بڑا مزا آتا۔ ایسے لوگوں کو دیکھتا جنہیں میں جانتا ہی نہیں تھا۔ ایسی شکلیں دیکھتا جو میں نے پہلے دیکھی ہی نہیں تھیں۔ برمی مرد عورتیں اپنے خاص لباس یعنی کرتا لنگی پہنے سر پر رنگ برنگے رومال باندھے گزر رہے ہوتے۔ میں نے دیکھا کہ جتنی سادگی ان کے لباس میں تھی اتنا ہی سادہ ان کا رہن سہن تھا۔ وہ گھروں میں زیادہ مال و اسباب جمع کرنے کے قائل نہیں تھے۔ شہروں میں رہنے کا انداز اگرچہ ماڈرن تھا مگر شہر کے باہر یہ لوگ بانس کے مکان بنا کر رہتے۔ بانس کے چبوترے پر بانس کی دیواروں والے چھوٹے چھوٹے جھونپڑے نما مکان ہوتے۔ ڈھلوان چھت پر ناریل کی چھال بچھا دی جاتی۔ یہ مکان زمین سے چار پانچ فٹ بلند ہوتے اور آدمی ان کے نیچے سے آرپار گذر سکتا تھا۔ یہ طرز تعمیر اس وجہ سے بھی تھا کہ برما میں بارشیں بہت ہوتی ہیں۔ رنگون کا ریڈیو سٹیشن فیریزر سٹریٹ میں میکسم بار والی گلی میں تھا۔ جنگ کی وجہ سے اس ریڈیو اسٹیشن سے آدھ گھنٹے کا اردو میں پروگرام بھی ہوتا تھا۔ اس پروگرام کے انچارج رنگون کے اردو اخبار روزنامہ "شیر رنگون" اور "مجاہد برما" کے مدیر کیپٹن ملک تھے۔ وہ مجھ سے ہفتے میں دو بار ریڈیو پر اردو میں خبریں پڑھواتے اس سے مجھے کافی پیسے ملنے لگے۔ میں اپنے دوست احمد کی کوٹھی سے اٹھ کر کریلوس سٹریٹ کی ایک چالی یعنی کوٹھڑی نما کمرے میں آگیا۔ رنگون میں برسات کا موسم بڑی دیر تک رہتا۔ لمبی لمبی جھڑیاں لگتیں۔ بارش نہ بھی ہو تو بادل کئی کئی دن تک چھائے رہتے۔ ایک روز موسم بڑا خوشگوار تھا۔ میں دریا کی سیر کو چل دیا۔ دریا چڑھا ہوا تھا۔ ہماری کشتی بھنور میں پھنس گئی۔ ملاح بڑا تجربہ کار تھا۔ مسافروں میں چیخ و پکار مچ گئی۔ ملاح کشتی کو دوسرے کنارے کی طرف لے جانے کی سر توڑ کوشش کر رہا تھا۔ کشتی بھنور میں سے تو نکل گئی' لیکن کنارے کے قریب پہنچنے نہ پائی تھی کہ وہ ایک طرف کو جھکی اور پھر الٹ گئی میں بھی دریا میں گر گیا۔ گرتے ہی میں دریا کے نیچے ہی نیچے

اترتا چلا گیا۔ مجھے تیرنا آتا تھا مگر دریا کی لہریں بڑی تند اور تیز تھیں۔ پھر جیسے کسی نے مجھے نیچے سے اٹھایا اور میں دریا کی سطح پر آگیا۔ یہ کوئی غیبی ہاتھ تھا' مجھے یہی محسوس ہوا۔ بہرحال میں کسی نہ کسی طرح طوفانی لہروں میں تیرتا کنارے پر پہنچ گیا۔ بارش شروع ہو گئی تھی۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ کشتی کے دوسرے مسافروں کا کیا انجام ہوا کیونکہ دریا پر کوئی کشتی نظر نہیں آرہی تھی۔ میں بارش سے بچنے کے لئے ایک گھنے درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ کشتی کے بغیر میں دریا کے دوسرے کنارے پر نہیں جا سکتا تھا۔ شام ہو گئی میں گھبرا گیا کہ اس کنارے پر کوئی آبادی بھی نہیں تھی۔ میں ایک طرف کو درختوں کے نیچے چلنے لگا۔

پھر ایک عجیب بات ہوئی کہ مجھے کسی کے گہرے سانس لینے کی وہی آواز سنائی دی جو آسیبی کھنڈر [illegible] تھی شام کا وقت' بارش' سنسان جنگل مجھ پر خوف طاری کرنے لگا۔ گہرے سانسوں کی آواز غائب ہو گئی کیا دیکھتا ہوں کہ درختوں میں ایک جھونپڑی کے باہر لیمپ روشن ہے۔ دل کو اطمینان ہوا کہ یہاں ضرور کوئی آدمی ہو گا جو میری مدد کرے گا۔ جھونپڑی کے قریب گیا تو دہشت کے مارے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ دیکھا کہ ایک کالے رنگ کی عورت جس کی آنکھیں کیسری رنگ کی تھیں۔ بالوں میں سرخ گل مہر کا پھول لگا تھا۔ ایک سانپ اس کی گردن میں لٹک رہا تھا اور دوسرے سانپ سے وہ یوں کھیل رہی تھی جیسے وہ اس کا بچہ ہو۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے سانپ کو اپنی کلائی کے گرد لپیٹا اور کیسری آنکھیں میرے چہرے پر جمائے میری طرف بڑھی۔

میری حالت یہ ہو گئی تھی کہ میں بھاگ بھی نہیں سکتا تھا۔



میں اپنی ایڈونچرس' پر اسرار مگر کافی حد تک خطرناک داستان سنا رہا ہوں۔ قدیم زمانے میں مصر و یونان' بابل و نینوا کے جو داستان گو ہوا کرتے تھے وہ چاندنی راتوں میں' قہوہ خانوں' یا داستان سراؤں کے باہر شمع دان جلا کر لوگوں کو طلسم ہوش ربا کی کہانیاں سنایا کرتے تھے۔ اب نہ تو وہ مصر و یونان کی داستان سرائے باقی ہیں اور نہ وہ داستان گو ہی رہے ہیں' لیکن ہوش ربا واقعات' مہم جو لوگوں کے ساتھ اسی طرح پیش آتے رہتے ہیں جیسا کہ میرے ساتھ پیش آئے اور میں انہیں آپ کو سنا رہا ہوں۔

میں گھر سے نکلا تو گھنے جنگلوں اور گمنام جزیروں میں کھلنے والے پھولوں کی خوشبوؤں کی تلاش میں تھا۔ مگر یہ بات میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ اس سفر میں میری جان بھی خطرے میں پڑ جائے گی۔ اور مجھے ہلاکت خیز وادیوں سے بھی گذرنا پڑے گا----- میں نے اپنی آپ بیتی کو اس جگہ پر چھوڑا تھا جہاں ہماری کشتی رنگون کے دریائے ایراوتی میں الٹ جاتی ہے اور میں کسی غیبی طاقت کی مدد سے کسی نہ کسی طرح تیر کر کنارے تک پہنچتا ہوں اور پھر جنگل میں مجھے شام ہو جاتی ہے اور میں ایک جھونپڑے کے باہر کیسری رنگ کی آنکھوں والی ایک عورت کو دیکھتا ہوں جو لیمپ کی روشنی میں ایک کالے سانپ سے کھیل رہی ہے۔

اس عورت نے مجھے دیکھا تو سانپ کلائی کے گرد لپیٹ لیا۔ پھر مجھے گھور کر تکنے لگی۔ علاقہ تو یہ برما کا تھا مگر اس عورت کی شکل و شباہت برمی عورتوں کی بجائے جنوبی ہند یا لنکا کی عورتوں والی تھی۔ رنگ بھی کالا تھا۔ عورت کی کلائی پر جو سانپ لپٹا تھا وہ بھی گردن

اٹھائے مجھے اپنی لال لال آنکھوں سے گھور رہا تھا۔ میں وہیں رک گیا۔ عورت دو قدم چل کر میرے قریب آئی اور ٹوٹی پھوٹی اردو میں پوچھا کہ میں کون ہوں اور اس جنگل میں شام کے وقت کیا کر رہا ہوں۔ میں نے اسے بتایا کہ ہماری کشتی دریا میں الٹ گئی ہے اور میں بڑی مشکل سے کنارے تک پہنچا ہوں اور اب دریا کے دوسرے کنارے واپس رنگون شہر جانا چاہتا ہوں۔ عورت کسی آسیب کی طرح مجھے ٹکٹکی باندھے تک رہی تھی۔ لیمپ کی روشنی میں اس کی کیسری رنگ کی آنکھیں شنگرف کی طرح چمک رہی تھیں۔ اس نے مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ وہ مجھے اپنے جھونپڑے میں لے گئی جہاں زمین پر ایک بوریا بچھا ہوا تھا۔ ایک طرف سانپوں کی پٹاریاں رکھی تھیں۔ یہ عورت سپیرن تھی۔ اس کی کلائی سے لپٹا ہوا سانپ اس کے بازو کی طرف چلا تو سپیرن نے اسے پکڑ کر دوبارہ کلائی کے گرد لپیٹ لیا۔

مجھ پر ایک خوف سا طاری ہو گیا تھا۔ میں وہاں سے بھاگنے کی فکر میں تھا کہ وہ سپیرن بولی۔

"ادھر تمہیں دریا پار کرنے کے واسطے کوئی کشتی نہیں ملے گی۔"

"پھر اس نے بتایا کہ آگے دریا کا پاٹ بڑا وسیع ہو جاتا ہے اور سمندر بہت قریب ہے اس لئے وہاں کوئی پل وغیرہ نہیں ہے۔ میں نے کہا کہ مجھے ہر حالت میں دریا پار کر کے اپنے گھر پہنچنا ہے۔ اس نے سانپ کو اب اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا تھا اور اس سے کھیلنے لگی تھی۔ بولی اب صبح ہی تمہارا کوئی بندوبست ہو سکتا ہے پیچھے ایک دوسری جھونپڑی ہے وہاں پڑ کر سو جاؤ۔ دن نکلے گا تو تمہیں پچھلے گاؤں پہنچا دوں گی وہاں سے دریا پار کر جانا۔

"میں ڈر کے مارے انکار نہ کر سکا۔ چند قدم پیچھے دیودار کے درختوں میں ناریل اور بانس کی شاخوں سے بنا ہوا ایک دوسرا جھونپڑا تھا جس میں ایک دیا روشن تھا۔ وہ مجھے وہاں چھوڑ کر چلی گئی اس کے چلے جانے پر میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ اس جھونپڑے میں رات گزارنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ کیونکہ مجھے خطرہ تھا کہ یہ پراسرار عورت رات کو مجھ پر سانپ چھوڑ دے گی۔ چنانچہ جب کچھ وقت گزر گیا اور سپیرن بھی اپنی

جھونپڑی میں چلی گئی تو میں اللہ کا نام لے کر وہاں سے نکلا اور کچھ قدم دبے پاؤں چلنے کے بعد جنگل میں دریا کے اوپر کی جانب دوڑ پڑا۔ گرتا پڑتا ہانپتا کسی نہ کسی طرح مچھیروں کے ایک گاؤں میں پہنچ گیا۔ مگر رات کے وقت کوئی مچھیرا دریا میں کشتی ڈالنے پر تیار نہ ہوا۔ بہرحال رات اسی گاؤں میں کاٹی اور دوسرے دن صبح صبح دریا پار کر کے رنگون شہر آ کر خدا کا شکر ادا کیا۔ اس کے بعد میں نے دریا کی طرف جانا ہی چھوڑ دیا۔

اب میں آپ سے ایک سوال پوچھتا ہوں۔ کیا آپ نے کبھی کوئی ایسا سفید پھول دیکھا ہے جو انسانوں کی طرح دیکھتا اور باتیں کرتا ہو؟ آپ کا جواب یہی ہو گا کہ آپ نے ایسا کوئی پھول نہیں دیکھا۔ لیکن یقین کریں میں نے دیکھا ہے۔ اب یہی پھول میری داستان یعنی میری ایڈونچرس آپ بیتی میں ایک زندہ جاوید کردار بن کر داخل ہونے والا ہے۔ اس پھول کا نام ساتیں تھا۔ یہ برمی نام ہے تھی تو وہ ایک لڑکی مگر اس کا چہرہ اتنا معصوم پاکیزہ اور خاموش خاموش تھا کہ پہلی بار دیکھنے پر مجھے یوں لگا جیسے کنول کے سفید نورانی پھول نے لڑکی کی شکل اختیار کر لی ہے۔ وہ رنگون شہر کے سب سے بڑے پیگوڈا یعنی بودھ عبادت گاہ کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر پھول بیچتی تھی۔ یہاں پھول بیچنے والی دوسری عورتیں بھی تھیں مگر ساتیں اپنے چہرے کے تقدس اور معصومیت کے باعث ان سب سے الگ تھلگ نظر آتی تھی۔ اس روز میں یونہی سیر کرتا کراتا اس خانقاہ کی طرف نکل آیا تھا واپسی پر میں نے اس پھول بیچنے والی برمی لڑکی سے کنول کے کچھ پھول خریدے تو مجھے اس لڑکی کی موجودگی میں ایک عجیب سی روحانی مسرت اور پاکیزگی کا احساس ہوا۔ پھر میں دوسرے تیسرے دن خانقاہ کی سیڑھیوں پر آ کر اس سے کنول کے پھول خریدنے لگا۔ جیسے کوئی غیبی طاقت مجھے کھینچ کر اس کے پاس لے جاتی تھی۔ جب تک میں اس پھول بیچنے والی معصوم لڑکی کے سامنے رہتا مجھے لگتا کہ میرے دل کی کھوٹ صاف ہو رہی ہے اور نیچے سے خالص سونا ظاہر ہو رہا ہے۔ ایک روز میں نے اس سے اس کا نام پوچھا۔ اس نے اپنا نام ساتیں بتایا۔ ساتیں ٹوٹی پھوٹی اردو میں اچھی طرح بات کر لیتی تھی۔ مگر پھر وہ بہت کم بولتی تھی۔ ایک روز ساتیں نے بتایا کہ ان کا گاؤں رنگون شہر سے بیس میل پیچھے ہے اور وہ منہ

اندھیرے گاؤں سے پھول لے کر چل پڑتی ہیں۔ یہ پھول ان کے کھیتوں اور تالابوں میں اگتے ہیں۔ آپ یقین کیجئے کہ اس کنول پھول ایسی برمی لڑکی کے سامنے آتے ہی مجھ پر ایسی روشنی سی پڑتی کہ جیسے میں کسی ستارے یا چاند کے سامنے آگیا ہوں۔ مجھے یوں محسوس ہوتا کہ جیسے میری شخصیت کی تعمیر ہو رہی ہے۔ جیسے کوئی ہاتھ میرے کاندھے سے بوجھ نیچے اتار رہا ہے اور میں مور پنکھ کی طرح ہلکا پھلکا ہوتا جا رہا ہوں۔ ہے نا عجیب و غریب جذباتی تجربہ بہرحال اب میں اپنی سرگزشت کو اس مقام پر لے جانا چاہتا ہوں جہاں سے اس کا نقطۂ عروج یعنی کلائمیکس شروع ہوتا ہے۔

یہ تو میں پہلے ہی بیان کر چکا ہوں کہ رنگون میں اس لئے امن وامان تھا کہ ابھی جاپان میدان جنگ میں نہیں کودا تھا۔ یعنی دوسری عالمی جنگ ابھی صرف یورپ میں ہی لڑی جا رہی تھی۔ یا پھر مشرق وسطیٰ یعنی شمالی افریقہ میں کچھ محاذ کھلے ہوئے تھے۔ اخبار کے دفتر میں یہ خبر بڑی گرم تھی کہ جاپان بہت جلد مشرق بعید کا محاذ کھولنے والا ہے۔ یعنی وہ انگریزوں کے خلاف جنگ کا اعلان کرنے ہی والا ہے۔ رنگون پر اس زمانے میں انگریزوں کا قبضہ تھا اور یوں کچھ انڈین فوجی یونٹیں بھی برٹش اور ڈچ آرمی یونٹوں کے ساتھ مقیم تھیں۔

یہاں میں یہ بتاتا چلوں کہ ہو سکتا ہے میں اپنی اس داستان میں پھول بیچنے والی معصوم برمی لڑکی ساتیں کا ذکر نہ کرتا لیکن اس کا ذکر اس لئے ضروری ہو گیا کہ آگے چل کر اس بھولی بھالی لڑکی نے دشمن سے میری جان بچانے کے لئے اتنے بڑے خطرے مول لئے کہ آج اتنے برس گذر جانے پر بھی میں اسے یاد کر کے حیرت میں گم ہو جاتا ہوں کہ کنول پھول ایسی نازک سی لڑکی میں اتنی دلیری اور جرات کہاں سے آگئی تھی؟

آخر وہی ہوا جس کا خطرہ تھا۔ جس کا ڈر تھا' یعنی جاپان نے اتحادیوں کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا اور وہ پہلی رات تھی کہ روشنیوں کا شہر رنگون بلیک آؤٹ کی تاریکیوں میں ڈوب گیا۔

=====
□ □
=====

۱۹۴۳ء میں جاپان نے جنگ کا اعلان کیا اور رنگون میں پہلا بلیک آؤٹ ہوا اور روشنیوں کا شہر تاریکی میں ڈوب گیا۔ ساری رات بلیک آؤٹ رہا۔ دوسرے دن رنگون شہر میں جگہ جگہ ہوائی حملے سے بچاؤ کے لئے خندقیں کھودی جا رہی تھیں۔ اخبار کے دفتر میں جاپان کے اعلان جنگ پر بڑے زور وشور سے بحث جاری تھی۔ ریڈیو رنگون سے اردو' پنجابی میں جاپان کے خلاف پروگرام شروع ہو گئے۔ شہر کے بڑے بڑے چوراہوں میں طیارہ شکن توپیں لگا دی گئیں۔ مگر یہ بڑی پرانی قسم کی توپیں تھیں۔ دن کے گیارہ بجے تھے۔ رنگون کا آسمان بادلوں سے خالی تھا۔ دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ سڑکوں پر ٹریفک جاری تھی کہ اچانک آسمان پر ایک، گونج سی سنائی دی۔ میں اس وقت مغل سٹریٹ سے نکل کر فریزر سٹریٹ کی جانب آرہا تھا۔ مجھے رنگون ریڈیو اسٹیشن جانا تھا۔ گونج کی دھیمی دھیمی آواز میں نے بھی سنی تھی۔ کچھ لوگ فٹ پاتھ پر کھڑے آسمان کی طرف دیکھ رہے تھے میں بھی اوپر تکنے لگا۔

اچانک آسمان پر جہازوں کا ایک جھرمٹ نمودار ہوا۔ یہ جاپانی بمبار جہاز تھے جو انگریزی کے حرف V کی تین ٹولیاں بنائے رنگون کے اوپر پہنچ گئے تھے۔ ان کا رخ رنگون کی بیٹی یعنی بندرگاہ کی طرف تھا۔ اس کے چند سیکنڈ بعد ایک خوفناک دھماکہ ہوا۔ زمین ہل گئی پھر دھماکوں پر دھماکے ہونے لگے۔ مغل سٹریٹ میں بھگدڑ مچ گئی۔ لوگ جان بچانے کے لئے ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ میں بھی دوڑ کر ایک عمارت کی ڈیوڑھی میں چھپ گیا۔ رنگون کا آسمان سیاہ دھوئیں کے بادلوں کی زد میں تھا۔ جاپانی بمبار طیارے بم برسا

رہے تھے۔ عمارتیں اور زمین لرز رہی تھی۔ اب جاپانی فائٹر طیارے غوطے لگا کر بازار اور
اور عمارتوں پر گولیاں برسانے لگے تھے۔ ہر طرف چیخ و پکار مچ گئی۔ دھماکوں کی آوازیں
ایسی تھیں کہ لگتا ساتھ والے بازار میں بم پھٹ رہے ہیں۔ جاپانی فائٹر طیارے دھاڑتے
ہوئے اوپر سے گذر رہے تھے۔

یہ قیامت نہ جانے کتنی دیر تک برپا رہی پھر طیارے واپس چلے گئے۔ نہ ہوائی حملے
کے خطرے کا کسی نے الارم بجایا تھا اور نہ سب ٹھیک ہے کا الارم ہی بجایا گیا۔ جاپانی
طیاروں کے واپس جاتے ہی لوگ سڑکوں پر نکل آئے۔ اور اپنے اپنے گھروں کی طرف
دوڑ پڑے۔ میں بھی ریڈیو اسٹیشن کی طرف تیز تیز قدموں سے چل پڑا۔ مغل سٹریٹ سے
نکلتے ہی تباہی کے منظر دیکھنے کو ملے۔ بموں نے جگہ جگہ گڑھے ڈال دیئے تھے۔ کئی
عمارتیں گر پڑی تھیں۔ ایک ٹرام الٹی ہوئی تھی۔ جس کے نیچے لاشیں دبی تھیں۔ انسانی
جسموں کے اعضاء دھماکوں سے اڑ کر عمارتوں کی دیواروں سے چپک گئے تھے۔ فریزر
سٹریٹ میں ایک ویشنو ہوٹل ہوا کرتا تھا۔ اس ہوٹل کے باہر ہوٹل کا مالک جو بہت موٹا تھا
ایک چارپائی پر نیم دراز پڑا رہتا تھا۔ جاپانی طیاروں کی گولیوں نے اس کے جسم کو چھلنی کر
دیا تھا اور چارپائی پر اس کی لاش پڑی تھی۔ اس سڑک پر ایک ترکی ہوٹل ہوتا تھا۔ ہم اس
ہوٹل میں اکثر چائے پینے آیا کرتے تھے۔ اس ہوٹل کے دروازے کھڑکیاں ٹوٹی ہوئی
تھیں۔ شیشے کی الماریاں سڑک پر شکستہ پڑی تھیں اور ان میں جو کیک پیسٹریاں پڑی رہتی
تھیں وہ سڑک پر بکھری ہوئی تھیں۔ ریڈیو اسٹیشن والی گلی کے کونے پر میکسم بار کا اگلا
حصہ برباد ہو گیا تھا۔ اور کچھ غیر ملکی ملاحوں کی لاشیں ادھر ادھر بکھری ہوئی تھیں۔ یہ بم
ریڈیو رنگون پر گرایا گیا تھا جو میکسم بار پر گرا۔ ریڈیو رنگون کی عمارت محفوظ تھی۔ مگر وہاں
سے ضروری سامان بڑی تیزی سے نکالا جا رہا تھا۔ کیپٹن ملک تیز تیز قدموں سے ایک
سٹوڈیو سے باہر آ رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی بولے۔

"تم کہاں چلے گئے تھے۔ فوراً اخبار کے دفتر پہنچو۔ وہاں شاہ جی بھی موجود ہیں میں بھی آ رہا
ہوں"

اخبار کے دفتر کی طرف آتے ہوئے میری نظر ۳۹ سٹریٹ پر پڑی۔ وہاں اب کوئی
سٹریٹ نہیں تھی۔ کوئی عمارت سلامت نہیں تھی۔ جگہ جگہ ملبے کے ڈھیر سلگ رہے
تھے۔ اخبار مجاہد برما اور شیر رنگون کے دفتر میں شاہ جی سارے سٹاف کی میٹنگ لے رہے
تھے۔ تھے تو وہ سب اخبار نویس مگر انہیں اتنی خبر نہیں تھی کہ جاپانی فوجیں ملایا' سنگاپور اور
تھائی لینڈ کو فتح کرتی ہوئیں برما کی سرحدوں میں داخل ہو چکی ہیں۔ اخبار کے ایڈیٹر کہہ
رہے تھے کہ برما میں انگریزوں کی بہت بڑی چھاؤنی ہے۔ جاپان ادھر نظر اٹھا کر بھی نہیں
دیکھ سکتا۔ ابھی بے خبروں کی یہ میٹنگ جاری تھی کہ جاپانی بمبار ایک بار پھر بمباری کرنے
آگئے۔ ایک بار پھر رنگون شہر بموں کے دھماکوں' لوگوں کی چیخوں اور فائٹر طیاروں کی
فائرنگ سے لرز اٹھا۔ رنگون کی جیٹی پر دو تیل بردار جہاز کھڑے تھے ان میں آگ لگ گئی
اور کالے سیاہ دھوئیں سے رنگون میں دن کے وقت رات کا اندھیرا چھا گیا۔ شہر میں یہ خبر
بھی پھیل گئی کہ جاپانی فوج برما میں داخل ہو گئی ہے اور رنگون کی چھاؤنی سے انگریزی فوج
بھاگ گئی ہے۔ لوگوں کے پاؤں اکھڑ گئے۔ کوئی بال بچوں کو لے کر بندرگاہ کی طرف اور
کوئی ریلوے اسٹیشن کی طرف دوڑا۔ جن کے پاس موٹریں تھیں انہوں نے گاڑیوں میں
کھانے پینے کا سامان رکھا اور رنگون سے پروم جانے والی سڑک پر چل پڑے۔ دوسری
رات بھی رنگون اندھیرے میں ڈوبا رہا۔ دن نکلا تو میں اخبار کے دفتر کی طرف روانہ ہوا۔
شہر ویرانی کا منظر پیش کر رہا تھا۔ رنگون سیکرٹریٹ کے قریب سے گذرا تو دیکھا کہ بڑے
بڑے ٹرکوں میں فائلیں لادی جا رہی تھیں۔ آپ کو یاد ہو گا کہ اس زمانے میں برما کی
حکومت برما سے بھاگ کر شملہ آگئی تھی۔

اخبار کے دفتر کو تالا لگا تھا۔ کوئی چوکیدار بھی نہیں تھا۔ میں ریڈیو اسٹیشن کی طرف
چلا کہ شاید کیپٹن ملک سے ملاقات ہو جائے اور رنگون سے بھاگ نکلنے کا کوئی بندوبست ہو
جائے۔ ابھی میکسم سٹریٹ کے کونے پر ہی تھا کہ جاپانی بمبار ایک بار پھر آگئے۔ اس بار
انہوں نے اتنی شدید بمباری کی کہ رہی سہی کسر پوری ہو گئی۔ زمین اوپر کو اٹھ رہی تھی۔
عمارتیں دھماکوں کے ساتھ گر رہی تھیں۔ ہر طرف آگ دھواں اور گرد و غبار اور لوگوں

کی چیخیں تھیں۔ میں میکسم بار میں چھپ گیا تھا۔ اس بار کا ایک گووانی منیجر ہوتا تھا۔ گہرا سانول کالے رنگ کا یہ آدمی الماریوں کے پیچھے دبکا بیٹھا اونچی آواز میں خدا کو پکار رہا تھا۔ بمباری رکی تو گووانی منیجر نے جس کا نام اب یاد آیا۔ مسٹر ہیٹی تھا---- مجھے بار کی چابیاں دیتے ہوئے کہا۔ "یہ دکان اب تمہاری ہے میں جا رہا ہوں"۔ اور چابیوں کا گچھا فرش پر پھینک کر وہ باہر سڑک پر نکل گیا جہاں راہ گیر عورتوں اور مردوں کی لاشیں بکھری ہوئی تھیں۔ اب بڑے پیمانے پر رنگون سے غیر برمیوں کی ہجرت شروع ہو گئی۔ برمی لوگ زیادہ تر پہلے ہی جاپانیوں کے حامی تھے اور انہوں نے کافی حد تک جاپانیوں کی پیش قدمی کے لئے راہ ہموار کی تھی۔ میں اکیلا تھا کہاں جاتا۔ بندرگاہ سے کسی بحری جہاز کے روانہ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ جانے کیوں مجھے کمائیٹ والے بشیر صاحب کا خیال آگیا۔ میرا ذہن ابھی اتنا پختہ نہیں تھا۔ اور مجھے اس قسم کے حالات کا تجربہ بھی نہیں تھا۔ میں پیدل ہی کمائیٹ کی طرف چل پڑا جو وہاں سے چند میل دور تھا۔ مجھے یہ معلوم ہی نہیں تھا کہ جس طرف میں جا رہا ہوں ادھر جاپانی فوجیں چلی آ رہی ہیں۔



ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ کسی گوشہ فراغت میں ہماری محفل لگی ہوتی۔ گرم خوشبودار چائے کا دور چل رہا ہوتا اور میں یہ داستان ایک ہی نشست میں آپ کو سنا دیتا مگر---- ہر شے اپنی مرضی کے مطابق نہیں ہو جایا کرتی۔ کچھ مجبوریاں ہوتی ہیں جن کو تسلیم کرنا ہی پڑتا ہے۔ کچھ ضابطے ہوتے ہیں جن کی پابندی کرنی ہی پڑتی ہے۔ رنگون شہر خالی ہونے لگا تھا۔ جاپانی فوجیں ایک سیلاب کی طرح برما میں بڑھتی چلی آ رہی تھیں۔ لوگ مکان کھلے چھوڑ کر جدھر منہ اٹھا جان بچا کر بھاگ رہے تھے۔ جو لوگ میرے واقف کار تھے وہ بھی جا چکے تھے۔ چنانچہ میں اکیلا ہی رنگون کے مضافات میں واقع کمائیٹ نامی بستی کی طرف چل پڑا تھا۔ دل میں یہ امید لئے کہ کمائیٹ میں بشیر صاحب کی کوٹھی ہے۔ ان کی فیملی رہتی ہے۔ ان کے ہاں مجھے پناہ مل جائے گی اور رنگون سے نکلنے کا بھی کوئی بندوبست ہو جائے گا۔

رنگون سے کچھ دور نکلنے کے بعد مجھے ایک لاری مل گئی جس پر سامان لدا ہوا تھا اور جو کمائیٹ ہی کی طرف جا رہی تھی۔ لاری والا برمی زبان میں مجھے کچھ سمجھانے کی کوشش کرتا رہا مگر اس کی کوئی بات میری سمجھ میں نہ آئی۔ میں کمائیٹ کی بستی میں اتر گیا۔ پہلی بات جس نے مجھے چوکنا کیا یہ تھی کہ ساری بستی خالی ہو چکی تھی۔ یہ چھوٹی سی بستی ہوا کرتی تھی میں بشیر صاحب کی کوٹھی میں آیا تو وہ بھی خالی پڑی تھی۔ لوہے کا گیٹ کھلا تھا برآمدے میں خالی ڈبے اخبار اور کچھ بیکار سامان بکھرا پڑا تھا۔ کمروں میں فرنیچر اسی طرح لگا تھا۔ دوسری منزل کے دروازے بند تھے اور تالے لگے تھے۔ میں نے ایک کھڑکی میں سے

جھانک کر دیکھا دوسری منزل کے کمروں میں بھی سامان اسی طرح لگا تھا۔ مگر بشیر صاحب کی فیملی کا ایک فرد بھی یہاں تک کہ نوکر اور کوئی چوکیدار بھی وہاں نہیں تھا۔ اب مجھے احساس ہونے لگا کہ رنگون شہر سے نکل کر میں نے غلطی کی ہے۔ اور اپنے وطن سے ہزاروں میل دور ایک ایسے ملک میں اکیلا رہ گیا ہوں جس پر قبضہ کرنے کے لئے دشمن کی فوجیں بڑھتی چلی آرہی ہیں۔ میں کوٹھی کی چھت پر آگیا۔ چاروں طرف نگاہ ڈالی ساری کی ساری بستی خالی پڑی تھی۔ ایک فوجی ٹرک مشرق کی سمت سے آتا نظر آیا۔ وہ تیزی سے رنگون کی طرف نکل گیا۔ اتنے میں آسمان پر طیارے نمودار ہوئے اور دائیں بائیں غوطے لگا کر گولیاں برسانے لگا۔ میں جلدی سے نیچے آگیا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کروں اور کدھر بھاگوں ----- میں کوٹھی کے برآمدے میں ستون کی اوٹ سے چھوٹی سی پکی سڑک کو تک رہا تھا کہ کواڑوں کی جانب سے بشیر صاحب کا نوکر بھاگتا ہوا آیا اور کوٹھی کے گیٹ والی کوٹھڑی میں گھس گیا۔ میں اسے جانتا تھا وہ بھی مجھے جانتا تھا۔ میں کوٹھڑی کی طرف بڑھا تو وہ اندر سے ٹین کا ٹرنک سر پر رکھے باہر نکل رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی گھبرائی ہوئی آواز میں بولا۔

"تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ تمہیں پتہ نہیں جاپانی آرہے ہیں؟ بھاگو یہاں سے"

یہ کہا اور وہ سڑک پار کر کے دوسری طرف کیلے کے درختوں میں غائب ہو گیا۔ میں بھی اس کے پیچھے دوڑ پڑا۔ ابھی سڑک پار ہی کی تھی کہ اوپر سے ایک جاپانی طیارہ گولیاں برساتا نکل گیا۔ ابھی زندگی باقی تھی بچ گیا' گولیوں کی باڑ میرے بالکل قریب سے سڑک کو ادھیڑتی ہوئی گذر گئی۔ میں سڑک کے کنارے اوندھا لیٹا تھا۔ طیارے کے گذرتے ہی اپنے آپ کو ڈھلان کی طرف لڑھکا دیا۔ میرے سامنے کیلے اور شریفے کے درختوں کے جھنڈ تھے۔ میں بھاگنے لگا میرا رخ رنگون شہر کی طرف تھا۔ ابھی تھوڑی دور گیا تھا کہ فائرنگ ہونے لگی۔ میں وہیں بیٹھ گیا۔ فائرنگ کی آواز بڑے قریب سے آرہی تھی۔

اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ سامنے سے پندرہ بیس جاپانی فوجی نیم دائرے کی شکل میں ہاتھوں میں رائفلیں پکڑے آگے بڑھتے چلے آرہے ہیں۔ میں اب بھاگ بھی نہیں سکتا

تھا۔ انہوں نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا۔ وہ میرے سر پر پہنچ گئے' ایک جاپانی فوجی نے مجھے ردن سے پکڑ کر اوپر اٹھایا اور کرخت لہجے میں اپنی زبان میں کچھ کہا۔ پھر دوسرے سپاہی طرف دھکیل دیا۔ دوسرے سپاہی نے اپنے پچھلے سپاہی کی طرف مجھے دھکا دیا۔ پچھلے ہی نے اتنی تیزی سے میرے ہاتھ پیچھے کر کے باندھ ڈالے کہ میں دیکھتا ہی رہ گیا۔ قصہ صر جاپانیوں نے مجھے بشیر صاحب کی کوٹھی میں ہی ایک کمرے میں بند کر دیا۔ اس کوٹھی جاپانیوں نے اپنا رجمنٹل ہیڈ کوارٹر بنا لیا اور وہاں جاپانی پرچم لہرا دیا۔ میں کمرے کی لاخوں والی کھڑکی سے جاپانی ٹرکوں اور جیپوں کو باہر سڑک کے کنارے کھڑے ہوتے دیکھ ا تھا۔ جاپانی فوجیوں سے بھرے ہوئے ٹرک بڑی تیز رفتاری سے رنگون کی طرف جا ہے تھے گویا برما پر جاپانی قبضہ ہو گیا تھا۔

میں کوٹھی کے جس چھوٹے سے کمرے میں قید کیا گیا تھا وہ سٹور روم تھا اور اس کی رف ایک ہی کھڑکی تھی جس میں لوہے کی مضبوط سلاخیں لگی تھیں۔ گیٹ پر جاپانی گارڈ کس تھی۔ جاپانی سپاہی عجیب عجیب اونچی آوازیں نکالتے ٹرکوں پر سے اسلحہ اور مشین نیں اتار رہے تھے۔ مجھے جاپانیوں یعنی جاپانی فوجیوں کے بارے میں رنگون میں سنی ہوئی ہ سب باتیں یاد آرہی تھیں کہ وہ قیدی پر بڑا خوفناک تشدد کرتے ہیں۔ ننگے بدن پر برف ی سل رکھ دیتے ہیں چاقو سے ناخن اکھاڑ ڈالتے ہیں۔ چہرے پر جلتا ہوا سگریٹ لگاتے یں۔ یہ سب کچھ یاد کر کے میں پریشان ہو رہا تھا۔ گھنٹہ دو گھنٹے گذر گئے۔ کوئی جاپانی فوجی یری کوٹھڑی میں نہ آیا۔ آخر مجھے باہر سے دروازے کی کنڈی کھلنے کی آواز سنائی دی۔ یرا دل دھڑک اٹھا دو جاپانی فوجی اندر داخل ہوئے۔ ان میں سے ایک سپاہی تھا اور دوسرا افسر تھا۔ کیونکہ اس کے کاندھے پر دو پھول بنے ہوئے تھے وہ اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں کیڑ کر مجھے گھورتا رہا۔ پھر ٹوٹی پھوٹی اردو میں مجھ سے پوچھا کہ اس کوٹھی کا مالک یہاں س جگہ چھپا ہوا ہے۔ میں سمجھ گیا کہ انہیں بشیر صاحب کی تلاش ہے۔ میں نے جواب یا کہ میں انہیں نہیں جانتا میں تو رنگون شہر کو چھوڑ کر پروم کی طرف جان بچا کر بھاگ رہا ھا کہ آپ کے سپاہی مجھے پکڑ کر یہاں لے آئے۔ ابھی میں نے جملہ ختم ہی کیا تھا کہ جاپانی

افسر نے اتنی زور سے میرے منہ پر تھپڑ مارا کہ میں گر پڑا اور میرے ہونٹوں کے کنارے سے خون بہنے لگا۔

اس نے گرج کر اپنی زبان میں کوئی حکم دیا اور باہر نکل گیا۔ میرے ہاتھ ابھی تک پیچھے بندھے ہوئے تھے۔ جو جاپانی سپاہی پیچھے رہ گیا تھا اس نے جیب سے رسی نکالی اور میرے پاؤں بھی باندھ دیئے۔ پھر مجھے دو تین ٹھوکریں مار کر نکل گیا۔ باہر سے اس نے دروازے کو زور سے کنڈی لگا دی۔ میری مشکیں کسی ہوئی تھیں اور میں بے بسی کے عالم میں فرش پر پڑا تھا۔ آخر میں رینگتا ہوا سٹور کی کھڑکی تک آیا اور بڑی مشکل سے سر سلاخوں تک لا کر باہر جھانک کر دیکھا۔ بشیر صاحب کی کوٹھی کا جو لان تھا اس کے کونے میں ایک چھوٹا سا نوکروں کا کوارٹر ہوتا تھا۔ اس کوارٹر میں ایک برمی عورت رہتی تھی جو ان کی کوٹھی میں صفائی وغیرہ کیا کرتی تھی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ یہ برمی عورت جس کا نام اوساں تھا اپنے کوارٹر سے نکل کر چلی آرہی ہے۔ اس نے اپنے سر پر کیلوں کا بڑا سا گچھا اٹھا رکھا تھا۔ جب وہ برآمدے میں سے گذری تو میں نے بڑی دھیمی آواز میں اس کا نام لے لیا۔ اوساں نے گردن گھما کر میری طرف دیکھا۔ وہ مجھے دیکھتی رہ گئی۔ پھر آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور جاپانی فوجیوں کے ٹرک کی طرف چل دی۔ اوساں برمی نوکرانی کی شکل میں امید کی ایک کرن چمکی تھی۔

===== ❑ ❑ =====

ایک بات آپ کو بتاتا چلوں کہ برما پر جاپانی قبضے کے دوران ففتھ کالم نے بڑا کام کیا تھا۔ برما اس زمانے میں انگریزوں کی عمل داری میں تھا اور برمی لوگ انگریزی حکومت کے تسلط سے آزادی حاصل کرنے کے واسطے مسلسل جدوجہد کر رہے تھے۔ چنانچہ جب جاپان نے اعلان جنگ کیا اور اس کی فوجیں ایک سیلاب کی طرح برما کے دارالحکومت کی طرف بڑھنے لگیں تو برمیوں کی اکثریت نے جاپانیوں کو خوش آمدید کہا۔ گویا انہیں انگریزوں کی غلامی سے نجات حاصل کرنے کا ایک موقع ہاتھ آگیا تھا۔ برما میں یہ بھی مشہور تھا کہ بمباری کے دوران برمی مدافعتی تحریک کے لوگوں نے ٹارچوں سے جاپانی طیاروں کی راہ نمائی کی اور انہیں اہم ٹھکانوں تک راہ دکھائی۔

چنانچہ جب جاپانیوں نے مجھے کمائیٹ والی کوٹھی میں قید کر دیا اور مجھ پر تشدد بھی کیا اور پھر بشیر صاحب کی برمی نوکرانی اوساں نے مجھے قیدی حالت میں دیکھ کر آنکھوں کے اشارے سے خاموش رہنے کے لئے کہا تو جہاں اندھیرے میں امید کی ایک کرن چمکی وہاں مجھے یہ خیال بھی پریشان کرنے لگا کہ کہیں یہ برمی عورت جاپانیوں کے ساتھ مل نہ گئی ہو اور میرے لئے مزید مصیبت کا باعث نہ بن جائے۔ بہرحال میں جاپانیوں کے رحم وکرم پر تھا۔ جاپانی فوج کے رجمنٹل سینٹر سے فرار ہونا ناممکن تھا۔ گویا میں فوج کی پوری چھاؤنی میں گھرا ہوا تھا۔

ایک دن اسی کشمکش کی حالت میں گذر گیا۔ نہ اوساں نے پھر شکل دکھائی اور نہ کوئی جاپانی سپاہی یا افسر میری کوٹھڑی یعنی اس سٹور میں آیا جہاں مجھے باندھ کر ڈال دیا گیا تھا۔

جب شام ہوئی تو وہی جاپانی کیپٹن دو سپاہیوں کے ساتھ آیا اس نے پستول نکال کر ا
ہاتھ میں لے لیا اور مجھ سے پوچھ گچھ شروع ہو گئی۔ اس دوران انہیں پتہ چل چکا تھا
میں رنگون ریڈیو سے اردو پنجابی میں ان کے خلاف تقریریں نشر کیا کرتا تھا۔ اس وقت ہم
سے صرف بشیر صاحب کا اتا پتہ پوچھا جا رہا تھا اور وہ کمائیٹ سے نکل کر رنگون یا اس کے
مضافات میں کہاں روپوش ہو سکتے ہیں۔ مجھے اس بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں تھا
جب میں نے لاعلمی کا اظہار کیا تو مجھ پر تشدد شروع ہو گیا۔ اس تشدد کی تفصیل بتا
مناسب نہیں ہے۔ جب جاپانی کیپٹن اور سپاہی چلے گئے تو میں ساری رات اور اگلا سارا
دن درد سے کراہتا رہا۔ یہ تیسری رات کا ذکر ہے کہ میں سٹور روم میں بے بسی کے عالم
میں پڑا تھا کہ مجھے تالا کھلنے کی آواز سنائی دی۔ میں یہی سمجھا کہ کوئی جاپانی افسر مجھے نئی
اذیت دینے آیا ہے۔ تشدد برداشت کرتے کرتے میرا جسم نیم مردہ سا ہو چکا تھا۔ میں اسی
حالت میں فرش پر پڑا رہا۔ سٹور روم میں اندھیرا تھا۔ دروازہ آہستہ سے کھلا اور ایک
انسانی سایہ اندر داخل ہوا۔ میں نیم وا آنکھوں سے تک رہا تھا۔ سایہ میرے قریب آکر
جھکا اور مجھے برمی نوکرانی اوساں کی آواز سنائی دی۔

"جلدی اٹھو۔ یہی موقع ہے"

اس آواز نے میرے تن مردہ میں جان سی ڈال دی۔ میں جلدی سے اٹھ بیٹھا۔
اوساں مجھے لے کر کوٹھی کی راہ داری میں آگئی۔ یہاں اندھیرا چھایا تھا۔ گیلری کی طرف
باہر جلتی ہوئی کسی بتی کی روشنی آرہی تھی۔ اوساں تیز تیز چل رہی تھی۔ یہ ساری کوٹھی
میری دیکھی بھالی تھی۔ راہ داری کے پیچھے ایک راستہ عقبی باغیچے میں کھلتا تھا۔ باغیچے کے
پیچھے ایک کچی سڑک تھی جو آگے جا کر کمائیٹ سے رنگون جانے والی پکی سڑک کے ساتھ
مل جاتی تھی۔ اس جگہ ایک طرف کچی سڑک کے کنارے اندھیرے میں مجھے ایک بیل
گاڑی کھڑی نظر آئی۔ اس پر ناریل لدے ہوئے تھے۔ ایک ادھیڑ عمر برمی گدی پر بیٹھا بے
چینی سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ جونہی ہم اس کے قریب آئے اس نے برمی زبان میں
اوساں کو گھبرائی ہوئی آواز میں کچھ کہا۔ ظاہر ہے یہی کہا ہو گا کہ دیر نہ کرو۔ جاپانیوں نے

دیکھ لیا تو شوٹ کر دیں گے۔ مجھے گاڑی میں ناریلوں کے نیچے چھپا دیا گیا۔ اوساں نے
سرگوشی کی بس بولنا مت۔ یہیں چھپے رہنا اور بیل گاڑی چل پڑی۔ کچی سڑک سے نکل کر
وہ پکی سڑک پر آگئی اور اس کی رفتار بھی تیز ہو گئی۔ میرے لئے یہ ایک نیا تجربہ تھا۔
ناریلوں کو رسیوں سے اچھی طرح سے جکڑ دیا گیا تھا۔ میں ان کے بالکل نیچے چھپا تھا۔ مجھ
پر ان کا بوجھ اتنا زیادہ نہیں تھا کہ مجھ سے برداشت نہ ہوتا۔ ایک سوراخ میں سے مجھے
بیل گاڑی کا تھوڑا سا پہیہ اور سڑک کا کچھ حصہ نظر آرہا تھا۔ سڑک پر اندھیرا تھا۔ جہاں
بجلی کا کھمبا آتا تو سڑک تھوڑی دیر کے لئے روشن ہو جاتی اور اس کے بعد پھر اندھیرا چھا
جاتا۔

فوجی ٹرک اور جیپیں بڑی تیزی سے سڑک پر سے گذر رہی تھیں۔ بیل گاڑی سڑک
سے اتر کر کچے میں چلنے لگی۔ کچھ دور چلنے کے بعد پھر پکی سڑک پر آگئی۔ ایک جانب سے
مشین گن کی فائرنگ کی آواز فضا میں گونج گئی۔ میں ناریلوں کے ڈھیر کے پیچھے چھپا بیٹھا
تھا۔ میرے اوپر بھی ناریلوں کا ڈھیر تھا۔
آدمیوں کی باتیں کرنے کی آواز آئی۔ بیل گاڑی کی رفتار دھیمی ہو گئی۔ یہ فوجی چیک
پوسٹ تھی۔ جاپانی فوجی اونچی آواز میں برمی گاڑی بان سے کچھ پوچھ رہے تھے۔ وہ برمی
زبان میں خدا جانے کیا جواب دے رہا تھا۔ میں نے اپنا سانس روک لیا تھا۔ کسی نے
ناریلوں میں زور سے دو چار بید مارے۔ کچھ ناریل سڑک پر گر پڑے۔ جاپانی سپاہیوں نے
اونچی آواز میں کچھ کہا اور بیل گاڑی سڑک پر چل پڑی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ بلا ٹل
گئی تھی۔ لیکن ابھی نہ جانے کتنی بلائیں تھیں جن کا مجھے سامنا کرنا تھا۔ میرے فرار کی خبر
خدا کا شکر تھا کہ ابھی تک نہیں ہوئی تھی۔ ورنہ کوئی نہ کوئی فوجی جیپ برق رفتاری سے
آکر مجھے بیل گاڑی سمیت پکڑ سکتی تھی۔ لیکن بعد میں پتہ چلا کہ اوساں نے کسی کو اپنے
اعتماد میں لے کر میرے فرار کا بندوبست کیا تھا۔ میں آج بھی اس برمی نوکرانی کا احسان
نہیں بھول سکا۔ خدا جانے وہ زندہ بھی ہو گی یا نہیں۔؟
مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ برمی گاڑی بان مجھے کہاں لئے جا رہا ہے میرے اندازے

کے مطابق رنگون شہر ابھی کچھ فاصلے پر ہی تھا کہ بیل گاڑی ایک طرف کو مڑ گئی۔ راستہ ہموار تھا جس سے میں نے اندازہ لگایا کہ گاڑی کھیتوں کے درمیان کسی پگ ڈنڈی پر گذر رہی ہے۔ اب بجلی کے کھمبوں کی روشنی بھی نظر آنا بند ہو گئی تھی۔ کافی دیر تک بیل گاڑی کھیتوں میں چلتی رہی۔ کبھی ہلکی سی چڑھائی آجاتی۔ رات کی مرطوب فضا دھان کی ہلکی ہلکی مہک محسوس ہو رہی تھی۔

بیل گاڑی دو تین جگھوں سے مڑنے کے بعد ایک جگہ ٹھہر گئی۔ برمی گاڑی بان نے جلدی سے ناریلوں کی رسی کھولی۔ ناریل ایک طرف سے زمین پر گر پڑے۔ میں گاڑی سے اتر پڑا۔ میں نے کھلی فضا میں سانس لیتے ہوئے چاروں طرف دیکھا۔ مجھے آسمان ٹمٹماتے تاروں اور اردگرد اندھیرے میں درختوں کے سایوں کے سوا اور کچھ نظر نہ آیا۔ گاڑی بان نے مجھے اشارہ کیا میں اس کے پیچھے چل پڑا۔ آگے ایک چھوٹا سا تالاب تھا ستاروں کی دھیمی روشنی میں دھندلے سبز شیشے کی طرف چمک رہا تھا۔ تالاب کے دوسرے کنارے پر ایک چھوٹا سا شکستہ کوارٹر تھا۔ اس کی کھپریل کی چھت ایک طرف سے نیچے جھکی ہوئی تھی۔ اس کا ایک ہی کمرہ تھا جس میں بانس کی چارپائی بچھی تھی۔ گاڑی بان نے جیب سے موم بتی نکال کر جلائی۔ اسے فرش پر لگایا اور ٹوٹی پھوٹی اردو میں کہنے لگا کہ مجھے دو تین دن تک اسی جگہ چھپے رہنا ہو گا۔ ادھر جاپانیوں کے آنے کا اندیشہ نہیں ہے۔ میں نے پوچھا کیا ایسا کوئی راستہ نہیں ہے کہ میں یہاں سے بنگال کی طرف نکل جاؤں۔ برمی گاڑی بان کا چہرہ مزید سنجیدہ ہو گیا۔ بولا "یہاں سے ایسا کوئی راستہ نہیں جاتا میں صبح آؤں گا باہر سے تالا لگا رہا ہوں" اس نے پھونک مار کر موم بتی بجھائی اور باہر چلا گیا۔ باہر سے اس نے دروازے پر تالا لگا دیا۔ باقی کی ساری رات میری اور برما کے خونخوار مچھروں کی جنگ ہوتی رہی۔ دوسرے دن صبح بوڑھا برمی میرے لئے تھوڑے سے ابلے ہوئے موٹے چاول اور مچھلی کا اچار لے کر آیا۔ کہنے لگا شام کو اوساں آ رہی ہے شاید وہ تمہیں اپنے ساتھ کسی دوسری جگہ لے جائے۔ کیونکہ تمہارے فرار کا علم ہوتے ہی جاپانی سپاہی تمہاری تلاش میں جگہ جگہ چھاپے مار رہے ہیں۔ میں تو پریشان ہو گیا۔ اس سے پوچھا جاپانی سپاہی تو یہاں بھی آجائیں گے یہ سن کر برمی بوڑھا اٹھا اور لکڑی کے فرش کا ایک جگہ سے تختہ کھسکایا اور بولا۔ "اگر ایسی بات ہوئی تو نیچے تہہ خانے میں اتر جانا"۔ ابھی اسے گئے تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی کہ مجھے جیپ کی آواز سنائی دی کمرے کی کھڑکی بھی باہر سے بند تھی۔ جیپ کی آواز اس کوارٹر والے تالاب ہی کی طرف بڑھ رہی تھی۔ میں پریشان ہو گیا۔ بے اختیار اٹھ کر دروازے کی درز میں سے باہر دیکھنے لگا۔ جیپ نظر نہ آئی مگر اس کی آواز برابر قریب آ رہی تھی۔



میں جھونپڑی کے تہہ خانے میں چھپا فوجی جیپ کی آواز سن رہا تھا۔ آواز قریب آکر رک گئی۔ اس میں سے جاپانی فوجیوں کے اترنے اور ان کے باتیں کرنے کی آوازیں سنائی دیں۔ میں سمجھ گیا کہ کسی برمی دیہاتی نے مخبری کر دی ہے۔ بھاری فوجی بوٹوں کی دھمک جھونپڑی کے فرش پر گونجی۔ میرا دل دھڑک اٹھا۔ جاپانی فوجی سیدھے جھونپڑی میں آگئے تھے۔ وہ کرخت لہجے میں ایک دوسرے کو کچھ کہہ رہے تھے۔ میں سانس روکے بیٹھا تھا۔

یہ بات ثابت ہو گئی کہ مخبری ہوئی ہے۔ کیونکہ جاپانیوں نے فرش پر سے تہہ خانے والا تختہ ایک طرف ہٹا دیا اور نیچے سٹین گن کا ایک برسٹ مارا۔ میں دیوار کے ساتھ لگا تھا۔ جاپانی تہہ خانے میں آگئے۔ انہوں نے اسی وقت مجھے گرفتار کر لیا۔ ان کے ساتھ وہی جاپانی کیپٹن تھا جو اردو انگریزی بڑی اچھی بول لیتا تھا۔ میری طرف قہر آلود نظروں سے دیکھ کر اس نے مجھے گردن سے دبوچا اور گھسیٹتا ہوا اوپر لے آیا۔ باہر دو فوجی جیپیں کھڑی تھیں۔ مجھے وہ برمی گاڑی بان کہیں نظر نہ آیا جو مجھے یہاں چھپا گیا تھا۔ شاید وہ جاپانیوں کو آتا دیکھ کر جان بچا کر فرار ہو گیا تھا۔ یا شاید جاپانیوں نے اسے پہلے ہی شوٹ کر دیا تھا۔ بہرحال میرے ہاتھ جکڑ کر جیپ میں ڈال دیا گیا اور جیپ واپس کمائیٹ کی طرف روانہ ہو گئی۔

جاپانی مجھے بھی بڑی آسانی سے شوٹ کر دیتے مگر انہوں نے ایسا اس لئے نہیں کیا تھا کہ ان کا خیال تھا کہ مجھے کچھ ایسے لوگوں کا علم ہے جن کی جاپانیوں کو تلاش تھی۔ جب کہ میں کسی کے بارے میں بھی نہیں جانتا تھا کہ رنگون پر جاپانی قبضے کے بعد وہ کہاں چلے گئے ہیں۔ زندہ بھی ہیں یا نہیں ----- اس دفعہ جاپانیوں نے کمائیٹ والی کوٹھی کی بجائے

مجھے قریبی جنگل کی ایک فوجی بیرک میں بند کر دیا۔ مجھ سے ایک بار پھر بشیر آف کمائیٹ اور رنگون کے اردو اخباروں کے ایڈیٹر کے متعلق پوچھ گچھ شروع ہو گئی۔

مجھ پر صرف اتنا تشدد کیا جاتا کہ میں بے ہوش نہ ہو جاؤں۔ مجھے رات رات بھر جگایا جاتا۔ جسم پر جلتا ہوا سگریٹ لگایا جاتا جاپانی مجھ سے اپنی مطلوبہ معلومات اس لئے حاصل نہ کر سکے کہ واقعی مجھے کسی کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔ تشدد اور شب بیداریوں کی وجہ سے میں بے حد لاغر ہو گیا۔ جاپانیوں نے پوچھ گچھ سے ہاتھ اٹھا لیا وہ مجھے موقع دینا چاہتے تھے کہ میں اپنی کھوئی ہوئی صحت دوبارہ حاصل کر لوں اور مجھ پر تشدد کا سلسلہ ایک بار پھر شروع کر دیا جائے۔ ایک ہفتہ مجھے جنگل والی جھونپڑی نما فوجی بیرک میں گزر گیا۔ مجھے دن میں دو بار مچھلی کے ساتھ ابلے ہوئے چاول دیئے جاتے تاکہ میں جلدی جلدی صحت مند ہو کر دوبارہ تشدد برداشت کرنے کے قابل ہو جاؤں۔

جس چھوٹی سی بیرک میں مجھے بند کیا گیا تھا اس کی دیواریں بانس کی اور فرش لکڑی کا تھا۔ باہر ایک جاپانی سپاہی چل پھر کر پہرہ دیتا۔ چار گھنٹے کے بعد دوسرا جاپانی آجاتا۔ لکڑی کا دروازہ ہر وقت بند رہتا۔ اس میں کوئی روشندان بھی نہیں تھا۔ دیوار کے بانسوں میں سے تازہ ہوا اندر آتی تھی۔ ان کی درزوں میں سے مجھے تھوڑا سا باہر کا منظر نظر آجاتا تھا۔ میرے ہاتھ پاؤں کھول دیئے گئے تھے۔ بیرک کے ارد گرد ناریل' املی اور دیار کے بہت درخت تھے۔ ان کے درمیان جنگلی جھاڑیاں تھیں۔ سامنے جاپانی فوج کی بارک تھی۔ یوں ہر وقت چھ سات فوجی گاڑیاں کھڑی رہتیں۔ فوجی کچن میں سے دھواں اٹھتا رہتا۔ جاپانی تیز آوازوں میں ایک دوسرے کو پکارتے ادھر سے ادھر گزرتے رہتے۔ بارک کی دونوں جانب مشین گن کی پوسٹیں تھیں۔ درمیان میں جاپان کا جھنڈا لہراتا رہتا۔ میرا خیال تھا کہ شاید برمی عورت اوساں مجھے کام کرتی کہیں دکھائی دے جائے۔ وہ یہاں بھی میری مدد کر سکتی تھی۔ مگر وہ دکھائی نہ دی۔ میں نے اپنے طور پر وہاں سے فرار ہونے کا فیصلہ کر لیا اور سب سے پہلے بانس کی دیواروں کا جائزہ لیا۔ بانس پکے تھے اور بڑے ساتھ ساتھ جوڑ کر ان کی دیواریں بنائی گئی تھیں کوئی ایسی جگہ نہیں تھی جہاں بانس ذرا ڈھیلے ہوتے۔

ایک رات اچانک کسی کی آہٹ سے میری آنکھ کھل گئی۔ بارک میں اندھیرا تھا اس اندھیرے میں دو آنکھیں چمک رہی تھیں۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ یہ ایک بلی تھی جو میرے اٹھنے سے بھاگ گئی۔ تھوڑی دیر بعد باہر سپیدہ صبح نمودار ہوا تو اس کی ہلکی ہلکی روشنی بانس کی درزوں میں سے اندر آنے لگی۔ بلی اندر نہیں تھی ایک خیال یک لخت جیسے بجلی کی طرح میرے ذہن میں چمک اٹھا۔ جہاں سے بلی گذر کر آئی تھی ضرور وہاں کوئی شگاف ہو گا۔ میں تیزی سے اٹھا اور دیواروں کا از سر نو جائزہ لیا۔ مجھے ایک جگہ دیوار میں نیچے کی جانب تین بانس اپنی جگہ سے ہلے ہوئے نظر آئے۔ وہاں نیچے فرش کا تھوڑا سا حصہ بھی ٹوٹا ہوا تھا۔ میں نے جھانک کر دیکھا۔ نیچے زمین کی گھاس دکھائی دے رہی تھی۔ اندھیرے میں امید کی کرن چمکی۔ اگر کوشش کروں تو یہاں سے فرار ممکن تھا دن کے وقت تو میں اپنے دماغ میں منصوبہ بندی کرتا رہا۔ جب رات کا اندھیرا چاروں طرف پھیل گیا تو میں نے اپنا کام شروع کر دیا۔ تین راتوں کی انتھک کوشش کے بعد میں بانس کی دیوار کے نیچے والے لکڑی کے ایک تختے کو اکھاڑنے میں کامیاب ہو گیا۔ چوتھی رات میں اندھیرے میں دبے پاؤں اٹھ کر دیوار کے پاس گیا۔ تختے کو بڑی احتیاط سے اوپر اٹھا دیا۔ یہ بارک اس طرح بنائی گئی تھی کہ زمین سے کوئی چار فٹ اوپر تھی اور نیچے جگہ خالی تھی۔ میں شگاف میں سے نیچے گھاس میں اتر کر وہیں بیٹھ گیا۔ مجھے دو جاپانی فوجیوں کی آپس میں ہنس ہنس کر باتیں کرنے کی آواز آئی۔ یہ آواز اس طرف سے آ رہی تھی جدھر مشین گن پوسٹیں تھیں۔

میں گھاس میں رینگنے لگا۔ میرا رخ جنگل کے درختوں کی طرف تھا۔ گھاس اتنی اونچی تھی کہ اس نے مجھے چھپا لیا تھا۔ میں بارک کے نیچے سے نکل کر کھلے آسمان تلے آ گیا۔ سامنے اندھیرے میں درختوں کے جھنڈ تھے۔ جھاڑی میں سے ایک بلی نکل کر تیزی سے میرے قریب سے ہو کر بھاگ گئی۔ میں نے اس بلی کا شکریہ ادا کیا۔ کیونکہ اس نے مجھے فرار کی راہ دکھائی تھی ----- مگر ابھی میں خطرے سے باہر نہیں تھا۔ کسی بھی وقت مجھ پر مشین گن کا فائر آ سکتا تھا۔ میں بڑی آہستہ آہستہ رینگ رہا تھا۔ یوں میں درختوں کے پاس

پہنچ گیا۔ یہاں بھی خطرہ میرے سر پر منڈلا رہا تھا۔ کوئی بھی جاپانی سپاہی مل سکتا تھا۔ میں رک رک کر رینگ رہا تھا۔ جب میں نے کافی فاصلہ طے کر لیا تو اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اور اندھیرے میں چاروں طرف دیکھا۔ سامنے زمین اونچی تھی اور جھاڑیاں ہی جھاڑیاں تھیں۔ میں جھک کر چلتا جھاڑیوں تک گیا تو دوسری طرف اندھیرے میں ایک کھائی دکھائی دی۔ کھائی میں پانی کی لکیر چمک رہی تھی۔ ڈھلان زیادہ نہیں تھی۔ میں کھائی میں اتر گیا چھلانگ لگا کر پانی کی نالی کو پار کیا اور کھائی کے دوسرے کنارے پر آ کر جھاڑی میں چھپ گیا۔ میں پتہ کرنا چاہتا تھا کہ دوسری طرف کوئی فوجی کیمپ تو نہیں ہے۔ مگر ادھر گھاس کا میدان تھا جس میں کہیں کہیں ناریلوں کے جھنڈ رات کی تاریکی اور خاموشی میں چپ چاپ کھڑے جیسے میری طرف غور سے دیکھ رہے تھے۔ میں جھاڑی میں سے اٹھا اور میں نے اندھا دھند بھاگنا شروع کر دیا۔ کئی جگہ میں گرا بھی لیکن میں رکا نہیں۔ جب بھاگنے کی سکت نہ رہی تو بیٹھ کر سانس درست کیا اور پھر بھاگنے لگا۔ مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا کہ میں کس طرف جا رہا ہوں۔ اس سارے علاقے میں جاپانی فوج پھیلی ہوئی تھی۔ میں کسی بھی وقت پکڑا جا سکتا تھا۔ لیکن میں نے ہمت نہیں ہاری تھی۔ رات کا اندھیرا میری مدد کر رہا تھا۔ بھاگ بھاگ کر میں تھک گیا تھا۔ اب میں چلنے لگا اور درختوں کی قطار کے پاس روشنی جھلملا رہی تھی۔ میں بڑی احتیاط کے ساتھ اس روشنی کی طرف بڑھا۔ میں درختوں کے پیچھے سے ہو کر وہاں پہنچا تو دیکھا کہ کچی سڑک کے کنارے ایک ٹرک کھڑا ہے جس میں لکڑی کی بڑی بڑی گیلیاں یا شہتیر لدے ہوئے ہیں۔ قریب ہی ایک جھونپڑی کے باہر لالٹین روشن ہے اور دو آدمی بیٹھے چائے پی رہے ہیں۔ یہ دونوں برمی تھے اور برمی زبان میں باتیں کر رہے تھے۔ یہ کوئی چائے کی دکان تھی۔ ٹرک کا رخ رنگون شہر کی طرف تھا۔ مجھے رنگون شہر میں ہی کسی جگہ پناہ مل سکتی تھی۔ یہ سوچ کر میں ٹرک کے پیچھے آ گیا برمی ڈرائیور اور کلینر چائے پینے اور باتیں کرنے میں لگے تھے۔ میں ٹرک پر چڑھ گیا اور اپنے آپ کو لکڑی کے شہتیروں میں اس طرح سے چھپا دیا کہ باہر سے دیکھا نہیں جا سکتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد برمی ڈرائیور اور کلینر اگلی سیٹوں پر آ بیٹھے اور ٹرک شہر کی طرف چل پڑا۔ شہر میں ایک اور مصیبت میرا انتظار کر رہی تھی۔

میں ٹرک میں لکڑی کے شہتیروں میں چھپا بیٹھا تھا اور ٹرک رنگون شہر کی طرف تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں یہ رات کا وقت تھا میں بڑا خوش تھا کہ مجھے جاپانیوں کی قید سے نجات مل گئی اور میں ایک بار پھر آزادی کی فضا میں سانس لے رہا ہوں۔ میں اسی انتظار میں تھا کہ ٹرک شہر میں داخل ہو کر کسی جگہ رکے اور میں ٹرک سے نکل کر رنگون شہر کے گلی کوچوں میں کسی جگہ چھپ کر رات گذاروں اور دن نکلنے پر رنگون میں مقیم مسٹر لیوس کے گھر جا کر پناہ لوں۔ مسٹر لیوس کیپٹن ممتاز ملک کے دوست تھے اور سولی پیگوڈا کے عقب میں واقع ایک بلڈنگ کے فلیٹ میں رہتے تھے۔ ادھیڑ عمر آدمی تھے ان کی بیوی سکاٹ مارکیٹ میں ایک کافی ہاؤس چلاتی تھی۔ ان کے ہاں کوئی اولاد نہیں تھی۔ میں کیپٹن ملک کے ساتھ کئی بار ان کے فلیٹ پر جا چکا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ چونکہ برما کے نیشنل ہیں اس لئے رنگون چھوڑ کر نہیں گئے ہوں گے۔

ٹرک کی رفتار ہلکی ہو رہی تھی۔ میں ٹرک میں سے باہر تو نہیں دیکھ سکتا تھا مگر شہر کی روشنیاں میرے اوپر سے گذر رہی تھیں۔ جس کا مطلب تھا کہ ٹرک رنگون میں داخل ہو چکا ہے۔ ٹرک نے دو ایک موڑ کاٹے۔ پھر جیسے کسی احاطے میں داخل ہونے کے بعد گھوم کر ایک جگہ رک گیا۔ برمی ڈرائیور اور کلینر ٹرک سے نکل کر باتیں کرتے ایک طرف چلے گئے تھے۔ خاموشی طاری ہو گئی تھی۔ میں نے سوچا کہ یہ ٹرک ضرور شہر کے کسی ٹمبر مرچنٹ کے احاطے میں آکر رکا ہے اس لئے اب مجھے یہاں سے نکل جانا چاہئے۔ میں۔ اپنے آپ کو شہتیروں کے نیچے سے نکالا اور سر اٹھا کر ادھر ادھر دیکھا۔ مجھے ایسے لگا جیسے

میں چھوٹے چھوٹے بارک نما کوارٹروں کے درمیان آگیا ہوں۔ میں ٹرک سے چھلانگ لگانے ہی والا تھا کہ اچانک میرا دل دھک سے رہ گیا۔ سامنے بجلی کے کھمبے کے قریب سے دو جاپانی سپاہی رائفلیں کندھوں سے لٹکائے باتیں کرتے ٹرک کی طرف آرہے تھے۔ میں تیزی سے شہتیروں میں نیچے ہو کر بیٹھ گیا۔

مجھے پسینہ آگیا۔ یہ کوئی ٹمبر مارکیٹ نہیں تھی بلکہ جاپانی فوجی کیمپ تھا۔ جہاں یہ ٹرک لکڑی کی گیلیاں لے کر آیا تھا۔ گویا میں ایک قید خانے سے نکل کر دوسرے قید خانے میں آگیا تھا۔ قدرت نے میرے ساتھ ایک بھیانک مذاق کیا تھا۔ جاپانی سپاہی ٹرک کے ساتھ ٹیک لگا کر باتیں کرنے لگے۔ وہ سگریٹ بھی پی رہے تھے مجھ تک سگریٹ کے دھوئیں کی بو برابر آرہی تھی۔ میں وہیں دبکا بیٹھا رہا۔ سانس بھی آہستہ لے رہا تھا کہ کہیں جاپانی سپاہیوں کو میری خبر نہ ہو جائے۔ تھوڑی دیر بعد سپاہی وہاں سے چل دیئے۔ ایک ٹرک کے سٹارٹ ہونے اور ملٹری کیمپ سے باہر نکلنے کی آواز آئی میں عجیب مصیبت میں پھنس گیا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں۔ مجھے یہ دھڑکا بھی لگا تھا کہ صبح ہو گئی۔ تو ممکن ہے ٹرک پر سے گیلیاں اتاری جانے لگیں۔ میرے فرار کا علم بھی جاپانیوں کو ہو چکا ہو گا۔ اس بار پکڑا گیا تو یہ لوگ مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ مجھے ہر حالت میں صبح ہونے سے پہلے پہلے وہاں سے کسی طرح بھاگ نکلنا تھا۔

جب ذرا خاموشی ہوئی تو میں نے ایک بار پھر سر نکال کر دیکھا یہ واقعی جاپانیوں کا کوئی ملٹری کیمپ تھا کچھ فاصلے پر ایک بارک میں روشنی ہو رہی تھی۔ اندھیرے میں کچھ فوجی جیپیں وغیرہ بھی کھڑی نظر آئیں۔ جس ٹرک میں میں چھپا بیٹھا تھا وہ ملٹری کیمپ کی خار دار تاروں والی دیوار کے قریب آکر رکا تھا۔ یہ دیوار کافی اونچی تھی۔ اس میں سے گذرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

رات گذرتی جا رہی تھی دن کی روشنی میرے لئے موت کا پیام لے کر آسکتی تھی۔ وقت تھوڑا رہ گیا تھا۔ کیمپ کے گیٹ پر پہرہ لگا تھا۔ اس طرف کا رخ نہیں کر سکتا تھا۔ میں اسی الجھن میں تھا کہ خدا کو میری حالت پر رحم آگیا۔ میں نے دیکھا کہ ایک ٹرک

کیمپ کے گیٹ میں داخل ہوا اور آہستہ آہستہ رینگتا میرے والے ٹرک کی طرف آنے لگا۔ میں نے گردن شہتیریوں میں کر لی۔ ٹرک آگے نکل گیا۔ میں نے گردن نکال کر دیکھا یہ ٹرک دس بارہ قدموں پر جا کر ایک جگہ رک گیا تھا۔ اب جو میں نے اندھیرے میں غور سے دیکھا تو یہ کوڑے کرکٹ کا ٹرک تھا۔ ٹرک خالی تھا۔ وہاں ڈسٹ بن تھا جس میں سے ایک آدمی کوڑے کرکٹ کے بڑے بڑے لفافے اٹھا کر ٹرک میں رکھ رہا تھا۔ میرے ذہن میں ایک ترکیب آگئی۔ ترکیب خطرناک تھی مگر خطرہ مول لئے بغیر میں وہاں سے نکل بھی نہیں سکتا تھا۔ میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ ٹرک کوڑا کرکٹ لے کر کیمپ سے واپس چلا جائے گا۔ میں اس انتظار میں تھا کہ کوڑا کرکٹ رکھنے والا ذرا ادھر ادھر ہو تو میں اپنے منصوبے پر عمل کروں۔ پندرہ بیس منٹ اسی طرح گذر گئے۔ یہ ڈرائیور بھی برمی تھا۔ جب اس نے کوڑے کرکٹ کے سارے بڑے بڑے لفافے ڈسٹ بن میں سے نکال کر ٹرک پر لاد لئے تو وہ اگلی سیٹ پر جا کر بیٹھ گیا۔ جونہی اس نے ٹرک کا انجن سٹارٹ کیا میں اپنی جگہ سے نکلا بلی کی طرح اندھیرے میں اپنے ٹرک کے اوپر سے چھلانگ لگائی۔ جھکے جھکے دوسرے ٹرک پر چڑھا اور کوڑے کرکٹ کے بڑے بڑے تھیلوں کے بیچ میں اپنے آپ کو چھپا کر بیٹھ گیا۔

میرا دل ابھی تک بری طرح دھڑک رہا تھا۔ ٹرک گھوما اور آہستہ آہستہ چلتا ملٹری کیمپ کے گیٹ پر آکر رک گیا۔ میرا اوپر کا سانس اوپر ہی رہ گیا کیونکہ گیٹ پر موجود سپاہی ٹرک کی تلاشی لینے والا تھا۔ مگر خدا نے یہاں بھی میری مدد کی۔ سپاہی نے سرسری طور پر ٹرک کو دائیں بائیں سے دیکھا اور ٹرک گیٹ سے باہر نکل گیا۔ ملٹری کیمپ سے باہر آتے ہی میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ ایک بہت بڑی مصیبت میں پھنستے پھنستے میں بچ گیا تھا۔ میں تو اب بھی یہی کہوں گا کہ میری زندگی تھی اور خدا نے مجھے بچا لیا۔

ٹرک رنگون کی سڑک پر چلا جا رہا تھا۔ میں کوڑے کے لفافوں میں سے نکل کر ٹرک کے پیچھے آگیا تھا۔ میں ان سڑکوں سے واقف تھا۔ ٹرک شہر سے باہر کوڑا کرکٹ پھینکنے جا رہا تھا۔ جونہی ٹرک کی رفتار ایک موڑ کاٹتے ہوئے ہلکی ہوئی میں نے چھلانگ لگا دی۔ میں

سڑک کنارے جھاڑیوں میں گرا۔ جب تک ٹرک میری نظروں سے اوجھل نہیں ہو گیا میں وہیں چھپا رہا۔

پھر اٹھا اور میں نے مسٹر لیوس کے فلیٹ کی طرف چلنا شروع کر دیا۔ مجھے یقین تھا کہ یہ نیک دل عیسائی میاں بیوی ضرور اپنے فلیٹ پر ہی ہوں گے اور مجھے نہ صرف اپنے ہاں چھپا لیں گے بلکہ برما سے میرے نکلنے کی کوئی تدبیر بھی کریں گے۔



منہ اندھیرے کا ہی وقت تھا۔ ابھی صبح کی روشنی پوری طرح سے نہیں پھیلی تھی رنگون کی سڑکیں اور گلی کوچے خالی خالی تھے۔ میرے لئے یہ سڑکیں اور گلیاں اجنبی نہیں تھیں۔ میرے قدم رنگون کے نیشنل اور کیپٹن ملک کے دوست مسٹر لیوس اور مسز لیوس کے اپارٹمنٹ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ میں جاپانیوں کے جنگی کیمپ سے بھاگا ہوا قیدی تھا۔ اگر میں پکڑا جاتا تو میرے ساتھ مجھے پناہ دینے والا بھی شوٹ کر دیا جاتا۔ اور رنگون میں جاپانیوں کے بہت جاسوس کام کر رہے تھے۔ انڈین لوگ تقریباً تمام کے تمام رنگون چھوڑ کر پیدل قافلوں کی شکل میں بنگال کی طرف کوچ کر گئے تھے۔ کیونکہ جاپانیوں کے رنگون پر قبضہ کرنے کے ساتھ ہی برمیوں نے انڈین لوگوں کے مکانوں کو لوٹنا شروع کر دیا تھا۔ مسٹر لیوس اینگلو انڈین تھے۔ اس لئے انہیں کسی نے کچھ نہیں کہا تھا۔ میرے دل میں بار بار یہ خیال آرہا تھا کہ کیا یہ لوگ مجھے اپنے ہاں پناہ دے دیں گے؟ جاپانیوں کی قید سے بھاگے ہوئے شخص کو اپنے ہاں پناہ دینا ایک طرح سے موت کو دعوت دینے کے برابر تھا۔ زمانہ ایسا تھا کہ جاپانی بے دریغ مشکوک لوگوں کو گولیوں سے اڑا رہے تھے۔

مسٹر لیوس کے فلیٹ کے دروازے پر کھڑے ہو کر میں یہی کچھ سوچ رہا تھا پھر خیال آتا کہ یہ ایک نیک دل عیسائی شخص ہے اکثر محفلوں میں میں نے اسے انسانوں سے محبت کرنے کی باتیں کرتے سنا تھا۔ اس خیال سے مجھے حوصلہ ہو رہا تھا۔ میں نے دروازے پر آہستہ سے دستک دی۔ اندر خاموشی چھائی رہی۔ تیسری بار دستک دینے پر اندر سے آواز آئی "کون ہے؟" یہ مسٹر لیوس کی آواز تھی۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں نہیں چاہتا

تھا کہ میری آواز ساتھ والے فلیٹوں میں کسی کے کانوں تک پہنچے۔ مسٹر لیوس نے دروازہ کھولا۔ آنکھیں ملتے ہوئے مجھے دیکھا حیرت سے ان کا تھوڑا سا منہ کھلا اور پھر چہرے پر مسکراہٹ آ گئی۔

"ارے تم؟ مسٹر ملک اور مسز ملک کہاں ہیں؟

میں نے ان کا بہت سے لوگوں سے پوچھا کچھ پتہ نہیں چلا آؤ آؤ' اندر آجاؤ"

ابھی انہیں یہ علم نہیں ہوا تھا کہ میں جاپانی جنگی کیمپ سے فرار ہو کر آ رہا ہوں۔ وہ مجھے کمرے میں لے آئے۔ مسز لیوس بھی وہاں آگئیں۔ انہوں نے بھی مجھے دیکھ کر خوشی کا اظہار کیا اور مسٹر ملک اور مسز ملک کے بارے میں پوچھا۔ میں نے انہیں بتایا کہ مجھے صرف اتنا معلوم ہو سکا ہے کہ وہ لوگ شاہ جی وغیرہ کے ساتھ بنگال کی طرف چلے گئے تھے۔

"اور تم..... تم کہاں تھے؟ اب صبح صبح کہاں سے آ رہے ہو؟"

پہلے تو مجھے خیال آیا کہ میں اصل حقیقت بیان نہ کروں۔ پھر سوچا کہ نہیں یہ بڑے شریف اور نیک نیت لوگ ہیں ان کو ساری بات صاف صاف بتا دینی چاہئے۔ چنانچہ میں نے شروع سے لے کر آخر تک اپنی ساری کہانی بیان کر ڈالی۔ بیگم لیوس نے اپنے خاوند کی طرف دیکھا۔ مسٹر لیوس کسی گہری سوچ میں پڑ چکے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ یہاں مجھے پناہ نہیں ملے گی اور مجھے کسی دوسری جگہ کوئی ٹھکانہ تلاش کرنا پڑے گا۔ مسٹر لیوس نے پہلا کام یہ کیا کہ اٹھ کر وہ کھڑکی بند کر دی جو بازار کی طرف کھلی تھی۔ مجھے اپنے قریب صوفے پر بٹھایا۔ بیگم سے چائے لانے کو کہا۔ مجھے ابھی تک کچھ اندازہ نہیں ہو سکا تھا کہ انہوں نے میرے بارے میں کیا فیصلہ کیا ہے۔ میری عمر چھوٹی تھی۔ چہرہ شناسی کے فن سے ابھی ناواقف تھا۔ جب تک چائے نہ آئی مسٹر لیوس رنگون کی بربادی' جاپانیوں کے قبضے اور پرانے دوستوں کے بچھڑ جانے کی باتیں کرتے رہے۔ میں بے چین تھا ان کی بیگم چائے لے کر آگئیں۔ مسٹر لیوس نے چائے بنائی اور پیالی میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"مسٹر حامید ڈونٹ وری..... ہم سے جو ہو سکا تمہارے لئے کریں گے۔"

میرے دل پر سے ایک بوجھ اٹھ گیا میں نے جلدی سے کہا۔

"برائے مہربانی مجھے کسی طرح رنگون سے بنگال کی طرف جاتے کسی پیدل قافلے کے ملا دیں۔ میں اور کچھ نہیں چاہتا۔"

بیگم لیوس نے پیالی میں چمچہ ہلاتے ہوئے کہا۔

"مگر مائی بوائے اب تو دیر ہو چکی ہے"۔

مسٹر لیوس بیگم کا جملہ مکمل کرتے ہوئے بولے۔

"جتنے قافلے یہاں سے بنگال کی طرف جا سکتے تھے چلے گئے ہیں۔ اب تو چاروں طر جاپانیوں کا قبضہ ہے۔ وہ کسی ایک آدمی کو بھی رنگون سے باہر نہیں نکلنے دیتے۔ اور تم ت بار ان کی قید سے بھاگے ہو۔ وہ تو تمہاری تلاش میں شہر میں جگہ جگہ چھاپے ماریں گے"

میں مایوس ہو گیا۔ میں نے کہا۔

"میری وجہ سے آپ پریشان نہ ہوں میں چلا جاتا ہوں۔"

مسٹر لیوس نے پوچھا۔

"تم کہاں جاؤ گے؟"

میں نے کہا "جہاں اللہ لے جائے گا چلا جاؤں گا"۔

انہوں نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"مائی بوائے اس بار جاپانیوں نے تمہیں پکڑ لیا تو وہ زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ یہ نہیں چاہتا"۔

میں نے کہا۔ "میں بھی نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے آپ پر کوئی مصیبت نازل جائے۔"

مسٹر لیوس نے چائے کا ہلکا سا گھونٹ بھر کر پیالی میز پر رکھ دی میں نے اپنی جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"اکثر برمی انگریزوں کی غلامی سے نجات حاصل کرنے کی خاطر جاپانیوں سے مل گئے۔ اس محلے میں بھی ایسے برمی ضرور ہوں گے جنہوں نے مجھے آپ کے ہاں دیکھ لیا تو وہ

کر دیں گے اس طرح میرے ساتھ آپ کی زندگیاں بھی خطرے میں پڑ سکتی ہیں"۔

مسٹر لیوس ذرا سا مسکرائے۔ جیب سے ڈبی نکال کر سگریٹ سلگایا اور کہا۔

"میں تمہیں اپنے فلیٹ میں نہیں رکھوں گا"۔

میں ان کے منہ کو تکنے لگا۔ مسٹر لیوس میری طرف ذرا سا جھکے۔ وہ کچھ کہنے ہی لگے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ مسٹر لیوس نے مجھے ساتھ والے کمرے میں جانے کا اشارہ کیا۔ دروازے پر کوئی بار بار دستک دے رہا تھا۔ بیگم لیوس نے میز پر رکھی ہوئی میری پیالی نہیں اٹھائی تھی۔ مسٹر لیوس نے دروازہ کھولا میں دوسرے کمرے میں الماری کے پیچھے چھپا تھا۔ میرے کان باہر کی آواز سننے کو بے تاب تھے۔

===== ❑ ❑ =====

میں نے دروازے سے کان لگائے ہوئے تھے۔

صبح ہو رہی تھی میرا خیال تھا کہ دودھ یا اخبار والا ہو گا جس نے دروازہ کھٹکھٹایا ہے۔ میں نے دروازے کی درز میں سے دیکھ لیا تھا کہ مسز لیوس نے میز پر سے میری پیالی نہیں اٹھائی تھی یعنی اس وقت میز پر چائے کی تین پیالیاں پڑی تھیں۔ جب کہ کمرے میں چائے پینے والے وہ صرف دو تھے۔ یہ سراغ رسانی کا ایک نقطہ تھا جس کی وجہ سے میں پریشان ہو رہا تھا۔ دروازہ کھلا اور ایک چھوٹے قد کا برمی سامنے کھڑا مسکرا رہا تھا۔ مسز لیوس نے بھی مسکراتے ہوئے پوچھا "کیا بات ہے تھایونگ صبح صبح کیسے آئے؟"

تھایونگ کمرے میں آگیا اس کی نظریں میز کا جائزہ لے رہی تھیں۔ کہنے لگا۔

"صاحب کوئی مہمان آیا ہے صبح سویرے"۔

تب لیوس کو بھی احساس ہوا کہ اسے کم از کم تیسری پیالی میز پر سے اٹھا لینی چاہئے تھی۔ پیالی میں ابھی تک چائے پڑی تھی۔ لیوس نے بات کو ٹالنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"ارے نہیں تھایونگ، میں صبح کے وقت چائے کی دو پیالیاں پیتا ہوں نا؟"

برمی نے مشکوک انداز میں کہا۔

"مگر صاحب آپ ایک پیالی میں بھی دو کپ چائے پی سکتے ہیں"۔

اس پر مسز لیوس نے ترش لہجے میں پوچھا۔

"تم کس لئے آئے ہو؟ اخبار کا بل تو ہم نے ادا کر دیا ہوا ہے"۔

برمی تھایونگ مسکرایا۔ "میڈم بات یہ ہے کہ ایجنٹ نے کہلوا بھیجا ہے کہ اب بل کی پے منٹ پہلی کے پہلی ہوا کرے گی"۔

"ٹھیک ہے ہم پہلی کو پے منٹ کر دیا کریں گے"۔

مسز لیوس نے بے رخی سے کہا۔ تھایونگ سلام کر کے کمرے سے نکل گیا۔ دروازہ بند کر کے لیوس میرے کمرے میں آگئے۔ میں نے پوچھا۔

"یہ مشکوک آدمی کون تھا مجھے اس پر شک ہے مجھے جاپانیوں کا ایجنٹ لگتا ہے۔"

لیوس بولا۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے ویسے میں تمہیں آج ہی سلز بریکس کے فارم میں پہنچا دوں گا وہاں میرا ایک چھوٹا سا گیراج ہے۔ اس کے ساتھ ایک کوارٹر بھی ہے۔ تم فکر نہ کرو میں ٹیکسی لے کر آتا ہوں۔"

اتنا کہہ کر لیوس فلیٹ سے چلے گئے۔ کچھ دیر بعد وہ ٹیکسی لے آئے۔ اس وقت تک دن نکل آیا تھا۔ بازار میں لوگوں کی آمدورفت شروع ہو گئی تھی۔ میں فلیٹ سے نکل کر ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔ لیوس میرے ساتھ تھا۔ میں پچھلی سیٹ پر نیچے ہو کر بیٹھا تھا۔ ٹیکسی رنگون کے بازاروں میں سے گزرنے لگی۔ جاپانی سپاہیوں نے ہر چوک میں مورچے بنا رکھے تھے۔ مگر وہ چیکنگ نہیں کر رہے تھے۔ سلز بیرکس شہر کے شمال مغرب میں ایک چھوٹا سا جنگل تھا۔ جس میں ایک کافی بڑا فارم تھا لیوس اس فارم کا منیجر رہ چکا تھا۔ یہ نیم پہاڑی علاقہ تھا ٹیکسی اونچی نیچی پہاڑی سڑکوں پر چلی جا رہی تھی۔

مجھے فارم کے عقبی دروازے سے اندر لے جایا گیا۔ گیراج اور کوارٹر اسی طرف بانس کے اونچے اور گھنے درختوں کے جھنڈ کے پیچھے نشیب میں تھا۔ اس کے نیچے ایک پہاڑی نالہ بہہ رہا تھا۔ یہاں کوئی نہیں تھا کوارٹر اور گیراج دونوں ویران پڑے تھے۔ گیراج پر تالا لگا تھا۔ لیوس نے تالا کھولا۔ اندر بانس کی ایک کھاٹ دیوار سے لگی تھی۔

"تم یہاں کچھ وقت گذارو۔ میں جب تک تمہارے یہاں سے نکلوانے کا بندوبست کرتا ہوں۔ باتھ روم پیچھے کوارٹر میں ہے۔ نیچے پہاڑی نالے کا پانی صاف ہے۔ میں تمہیں صبح

شام کھانا پہنچا دیا کروں گا۔ مگر یہاں سے باہر غیر ضروری طور پر مت نکلنا یہ خوش قسمتی کی بات ہے کہ اس طرف جاپانی نہیں آئے۔ میں جاتا ہوں دوپہر کو تمہارے لئے کچھ کھانے کو لے کر آؤں گا"۔

لیوس چلا گیا۔ وہ گیراج کو باہر سے تالا لگا گیا تھا۔ مگر اس کی ایک کھڑکی پیچھے نشیب میں کوارٹر کی طرف کھلتی تھی۔ میں کچھ دیر کو بانس کی چارپائی پر بیٹھا اپنی حالت پر غور کرتا رہا کہ کیا میں کبھی واپس اپنے وطن پہنچ سکوں گا۔ پھر اٹھ کر کھڑکی کا تھوڑا سا پٹ کھولا اور نیچے نشیب میں بہتے پہاڑی نالے کو دیکھنے لگا۔ میرا شک غلط نہیں تھا۔ برمی اخبار والے نے مخبری کر دی تھی اور جاپانی سپاہی میری تلاش میں آ گئے تھے۔ میں نے دیکھا کہ دو فوجی گاڑیاں جس میں جاپانی سپاہی سوار تھے بڑی تیزی سے نالے کا پل پار کر کے گیراج کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ میری چھٹی حس نے مجھے خبردار کر دیا۔ وقت بہت کم تھا جونہی فوجی گاڑیاں ایک جانب مڑیں میں نے کھڑکی میں سے نیچے چھلانگ لگا دی اور لڑھکتا ہوا نالے کی جھاڑیوں میں جا کر گرا۔ وہاں سے اٹھا۔ نالے کو پار کیا اور بھاگنے لگا پیچھے سے فائر آیا۔ گولی میرے سر کے اوپر سے نکل گئی۔ اس کے بعد سٹین گن کے برسٹ فائر ہونے لگے۔ میں جھک گیا اور اسی حالت میں درختوں کے پیچھے دوڑتا ٹیلے کی دوسری طرف اتر گیا۔ اس وقت مجھے کسی جگہ چھپ جانے کی ضرورت تھی۔ میں وہاں سے نکل نہیں سکتا تھا۔ مجھے احساس تھا کہ جاپانی فوج نے سارے علاقے کو گھیرے میں لے لیا ہو گا۔

مجھے ایک چھوٹی سی بودھ خانقاہ دکھائی دی۔ فائر میرے پیچھے آ رہا تھا۔ گولیاں میرے سر کے اوپر درختوں کی شاخوں کو توڑتی گذر رہی تھیں۔ میں خانقاہ میں گھس گیا۔ ایک بودھ بھکشو مہاتما بدھ کے مجسمے کے سامنے دوزانو بیٹھا عبادت کر رہا تھا۔ اس نے بڑی پرسکون آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے گھبرائی ہوئی آواز میں انگریزی میں کہا کہ جاپانی میرے پیچھے آ رہے ہیں۔ مجھے کہیں چھپا لو۔ فائرنگ کی آواز اس نیک دل بودھ بھکشو نے بھی سن لی تھی۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے اپنے پیچھے آنے کو کہا۔ آگے دالان تھا۔ دالان کے آخر میں ایک تاریک زینہ نیچے باؤلی کو جاتا تھا۔ باؤلی کی دیوار میں

پتھروں کی ایک گیلری سی بنی ہوئی تھی۔ بودھ بھکشو نے مجھے اس گیلری کے نیچے چھپا دیا۔ جاپانی خانقاہ میں آ گئے بودھ بھکشو سے ان کی باتوں کی ہلکی ہلکی آوازیں مجھ تک پہنچ رہی تھیں۔ میرا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ خدا نے میری مدد کی اور جاپانی چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد بودھ بھکشو مجھے باؤلی کی گیلری سے نکال کر ایک چھوٹی سی نیم روشن کوٹھری میں لے آیا۔ یہاں اس نے بڑی رواں انگریزی میں مجھے کہا۔

میں نے بھکشو بننے کے بعد پہلی بار جھوٹ بولا ہے۔ پر مجھے افسوس نہیں کیوں کہ یہ جھوٹ میں نے ایک انسان کی جان بچانے کے لئے بولا ہے۔ مگر تم زیادہ دیر یہاں نہیں رہ سکو گے جاپانیوں نے علاقے کو گھیرے میں لے لیا ہے۔ ہو سکتا ہے ان کا کوئی جاسوس خانقاہ کے آس پاس منڈلا رہا ہو"۔

میں نے کہا

"پھر میں کیا کروں کچھ تم ہی مجھے مشورہ دو۔"

میں نے اپنی ساری مصیبت بھری کہانی اسے سنا دی تھی۔

بودھ بھکشو سوچ میں پڑ گیا۔ پھر بولا۔

"تمہیں سر منڈوا کر بھکشوؤں ایسا حلیہ بنانا ہو گا میں تمہیں زعفرانی چادر بھی دے دوں گا"۔

میں انکار کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ دوسرے لمحے اس نے استرے سے میرا سر مونڈھ ڈالا اور مجھے زعفرانی چادر پہنا دی۔ میں نے شیشہ دیکھا تو لگا جیسے کوئی بھکشو لڑکا شیشے میں سے مجھے دیکھ رہا ہے۔



رنگون کے سیلز بیرکس والے اس گمنام سے پیگوڈا اور بودھ خانقاہ میں میں نے بھکشو لڑکے کے بھیس میں صرف دو دن ہی گذارے تھے کہ یہاں بھی میری مخبری ہو گئی اور میں پکڑا گیا اس بار جاپانیوں نے مجھے کمپالی کے جنگی قیدیوں کے کیمپ میں بھجوا دیا۔ یہ بہت بڑا جنگی کیمپ تھا جو جاپانیوں نے نیچے تھائی لینڈ کی سرحدوں کے قریب سمندر کنارے جنگل کے ایک ٹکڑے کو صاف کر کے بنایا تھا۔ تین دن تک میں قیدی ٹرین کے بند ڈبے میں سفر کرتا رہا۔ میرے ساتھ کچھ اور قیدی بھی تھے جن کا تعلق برمی فوج سے تھا۔ یہ لوگ برما کے مختلف علاقوں سے لاکر کمپالی کیمپ کی طرف لے جائے جا رہے تھے۔

اس جنگی کیمپ کے گرداگرد خاردار تاروں کی دو دیواریں چاروں طرف چلی گئی تھیں۔ کانٹے دار تار والی دونوں دیواریں پندرہ پندرہ فٹ اونچی تھیں۔ ان کے درمیان تھوڑی جگہ خالی چھوڑ دی گئی تھی جہاں جاپانی سپاہی گشت لگاتے رہتے تھے۔ کیمپ کے چاروں کونوں پر اونچی مچان تھے جن میں جاپانی مشین گنیں لئے بیٹھے تھے ان کے پاس سرچ لائٹیں بھی تھیں۔ رات کو یہ سرچ لائٹیں گول دائرے والی روشنی پھینکتیں جو آہستہ آہستہ گھوم کر چاروں طرف کیمپ کی دیواروں کا چکر لگاتیں۔ جنگی کیمپ کا صرف ایک گیٹ تھا جو بانس اور دوسری لکڑی کا بنا تھا اس کے اوپر بھی ایک بڑی مچان تھی جس میں تین مشین گنوں کی نالیاں باہر کو نکلی ہوئی تھیں۔ بڑے سخت چہروں والے جاپانی اس مشین گن پوسٹ میں ہروقت موجود رہتے تھے۔

کیمپ کے اندر زمین سے تین چار فٹ اونچی لکڑی کی لمبی لمبی بارکیں بنائی گئی تھیں۔

بارکوں کے نیچے زمین خالی تھی اور آرپار دیکھا جا سکتا تھا۔ ہر بارک میں بیس قیدیوں کو بھر دیا گیا تھا۔ لکڑی کے فرش پر پرانے کمبل پھینک دیئے گئے تھے۔ بس یہی ہمارا اوڑھنا بچھونا تھا۔ شام کے بعد اندھیرا ہوتے ہی سارے بارکوں کی بتیاں بجھا دی جاتیں اور قیدیوں کو آرڈر دیا جاتا کہ سو جاؤ۔ کسی بارک سے کوئی آواز نہ آئے۔ بارکوں کے باہر جاپانی سپاہی رائفلیں کاندھوں پر ڈالے گشت لگاتے اور بارک کی لکڑی کی دیواروں سے کان لگا کر سننے کی کوشش کرتے کہ اندر قیدی باتیں تو نہیں کر رہے؟ کیمپ کی باقی تمام بتیاں روشن ہوتی تھیں۔ خاردار دیواروں کے کونوں پر بڑی بڑی لائٹیں لگی تھیں جو ساری رات جلتی رہتیں۔ گن پوسٹوں میں سے روشنی کے گول دائرے بھی دیواروں کے چاروں طرف رات بھر گھومتے رہتے۔

دن نکلتے ہی قیدیوں کو بارکوں کے سامنے قطاروں میں اٹن شن کر دیا جاتا اور رول کال ہوتی۔ تمام قیدیوں کے نمبروں کے حساب سے گنتی کی جاتی۔ وہیں ہمیں کالی کافی کا ایک مگ اور باسی ڈبل روٹی کے دو ٹکڑے ناشتے کے طور پر مل جاتے ہم وہیں بیٹھ کر اسے زہر مار کرتے اس کے فوراً بعد قیدیوں کو مشقت کے لئے الگ الگ ٹولیوں میں سخت نگرانی میں جنگل کی طرف بھیج دیا جاتا۔ جنگل میں ان سے درختوں کی کٹائی کروائی جاتی۔ وہاں جاپانی ایک فوجی سڑک بھی بنوا رہے تھے۔ اس سڑک پر ان سے پتھر کٹوائے جاتے۔ چونکہ میں دو تین مرتبہ فرار ہوا تھا اس لئے مجھے قیدی کیمپ سے باہر نہیں بھیجا گیا بلکہ کیمپ کے اندر ہی مجھ سے مشقت لی جاتی تھی۔ پہلے دو چار دن میں بارکوں کے سامنے زمین کھود کر ہموار کرتا رہا۔ پھر جاپانی کوارٹر گارڈ کے آگے پڑے ملبے کو اٹھا کر ایک بہت بڑے گڑھے میں ڈالتا رہا۔ وہ میری نو عمری کا زمانہ تھا۔ بعد میں جب میں نے قیدی کیمپوں سے فرار کی انگریزی فلمیں دیکھیں تو مجھے بے اختیار اپنی قید کا زمانہ یاد آ گیا۔ آج بھی ٹی وی پر دوسری جنگ عظیم کی کوئی ایسی فلم دیکھتا ہوں تو میری پرانی تلخ یادیں تازہ ہو جاتی ہیں اور یقین نہیں آتا کہ میں اس موت کے کیمپ میں سے زندہ نکلنے میں کامیاب ہو سکا تھا۔ دراصل اس کا سارا کریڈٹ اس لڑکی ساتھی کو جاتا ہے جو رنگون کے سب سے بڑے

بودھ مندر سولی پیگوڈا کی سیڑھیوں پر پھول بیچا کرتی تھی اور جو شہر پر جاپانیوں کی پہلی بمباری کے موقع پر ہی مجھ سے جدا ہو گئی تھی۔

کمپالی کیمپ میں کوئی دو ہزار کے قریب قیدی بند تھے۔ ان میں برمی بھی تھے۔ کچھ ڈچ فوجی تھے۔ انگریز تھے اور انڈین فوجی بھی تھے۔ رنگون کے کچھ شہری بھی یہاں لائے گئے تھے جن پر جاپانیوں کو شبہہ تھا کہ وہ انگریزوں سے مل کر ان کی جاسوسی کرتے تھے۔ دن میں دو بار صبح شام ہمیں بارکوں کے آگے نکال کر ایکسر سائز کرائی جاتی۔ جاپانی رائفلیں لئے چاروں طرف کھڑے رہتے۔ ایک بار نلکوں کے نیچے قیدیوں والے لباس سمیت کھڑے کر کے غسل دیا جاتا۔ اور ہم بھیگے کپڑوں میں ہی اپنی بارکوں میں واپس آجاتے۔ کیمپ کے اندر ہمیں کسی سے بات کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ بارکوں میں ہم ایک دوسرے سے بات کر سکتے تھے۔ لیکن اس میں بھی یہ خطرہ تھا کہ جاپانیوں نے اپنے جاسوس قیدی بنا کر ہم میں چھوڑ رکھے تھے تاکہ وہ یہ معلوم کر سکیں کہ کہیں کوئی فرار کا منصوبہ تو نہیں بن رہا۔

دن بھر سخت مشقت کے بعد ہم تھک کر چور ہو جاتے تھے اور بارکوں میں آکر لکڑی کے شہتیروں کی طرح بے سدھ ہو کر پڑ جاتے۔ دوپہر کو ہمیں تھوڑے سے موٹے ابلے ہوئے چاول اور گھاس پتوں کا شوربا دیا جاتا۔ رات کو بھی یہی کچھ کھانے کو ملتا۔ کسی کو شیو کرنے یا سگریٹ پینے کی اجازت نہیں تھی۔ رات کا اندھیرا ہوتے ہی اردگرد کے جنگل میں سناٹا چھا جاتا۔ میں بارک کی دیوار کی درز میں سے جھانک کر باہر دیکھتا تو مجھے سوائے سرچ لائٹ کی دائیں سے بائیں طرف گردش کرتی روشنی کے دائرے کے اور کچھ نظر نہ آتا۔ میری بارک میں زیادہ تر برمی سویلین اور فوجی قیدی تھے جو اردو بہت مشکل سے بول سکتے تھے۔

ایک رات میں بارک کے فرش پر لیٹا سونے کی کوشش کر رہا تھا کہ کیمپ کی خاموش فضا ایک دم مشین گنوں کی فائرنگ سے گونج اٹھی۔ میرے ساتھی قیدی بھی جاگ اٹھے۔ چار پانچ منٹ تک مشین گن کی فائرنگ ہوتی رہی۔ درمیان میں جاپانی سپاہیوں کی آوازیں بھی آتی رہیں۔ صبح معلوم ہوا کہ رات چار انگریز قیدیوں نے کیمپ سے فرار ہونے کی

کوشش کی تھی۔ ان کی مشین گن کی گولیوں سے ادھڑی ہوئی لاشیں ابھی تک کانٹے دار تاروں میں الجھی ہوئی تھیں۔ دوسرے قیدیوں کو عبرت دلانے کے لئے جاپانیوں نے ان لاشوں کو وہیں رہنے دیا تھا۔ میرے ذہن میں ایک بار وہاں سے فرار کا خیال آیا تھا لیکن ان انگریز قیدیوں کی لاشیں دیکھ کر میں نے یہ خیال دل سے نکال دیا۔



فرار کی کوشش کرنے والے انگریز قیدیوں کی لاشیں کانٹے دار تاروں پر ہی لٹکی رہیں۔ دوسرے قیدیوں کو دہشت زدہ کرنے کے لئے جاپانیوں نے انہیں نیچے نہیں اتار تھا۔ یہاں تک کہ وہ وہیں گل سڑ گئیں اور ان کی ہڈیاں ہی باقی رہ گئیں۔

میں نے ابھی اگرچہ دل سے فرار ہونے کا خیال خوف کے مارے نکال دیا تھا لیکن جانے کیوں دل کے ایک کونے میں اس امید کی ننھی سے شمع ضرور روشن تھی کہ میں ایک نہ ایک دن یہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔

ایک مہینہ گذر گیا۔ اس دوران ایک برمی قیدی فرار ہونے کی کوشش کرتا پکڑا گیا۔ جاپانیوں نے سب قیدیوں کے سامنے تلوار سے اس کی گردن اڑا دی۔ مزید ایک مہینہ گذر گیا۔ میں دن بھر سر جھکائے خاموشی سے قیدی کیمپ کے اندر مشقت میں لگا رہتا تیسرے مہینے جاپانیوں نے مجھے بھی مشقت کے لئے کیمپ سے باہر جانے کی اجازت دے دی۔ میں بھی دوسرے قیدیوں کے ساتھ اب قریبی جنگل میں لکڑیاں کاٹنے اور سڑک بنانے کے کام میں لگ گیا۔

میں نے دل سے یہ خیال نکال دیا تھا کہ کبھی اس جہنم سے آزاد ہو سکوں گا۔ کہ قدرت کی طرف سے ایک ایسا انتظام ہو گیا جس کی مجھے بالکل توقع نہیں تھی۔ جنگل میں پہلے چار دن تو میں لکڑیاں کاٹتا رہا۔ پھر مجھے سڑک کے لئے پتھر ڈھونے کے کام پر لگا دیا گیا۔ یہ سڑک جاپانی جنگل میں بنا رہے تھے۔ جو خدا جانے آگے کہاں جا کر کس بڑی سڑک سے ملنے والی تھی۔ میں جس ٹکڑے پر کام کرتا تھا وہ بانس کے ایک ذخیرے کے قریب واقع

تھا۔ یہاں سڑک سے تھوڑا نیچے ایک چھوٹا سا چشمہ بہہ رہا تھا۔ پانی کی ایک شفاف دھار چٹانوں میں سے نکل کر نیچے ایک مختصر سے تالاب میں گرتی تھی جس کی دونوں جانب سبز جھاڑیاں اگی تھیں۔ یہاں چھوٹے چھوٹے بے شمار گول گول پتھر بکھرے ہوئے تھے۔ میں یہ پتھر ٹوکرے میں بھرتا اور اسے سر پر اٹھا کر سڑک پر لے جا کر ڈال دیتا جہاں دوسرے قیدی اسے سڑک پر بچھانے میں لگے ہوتے۔

ایک روز میں خالی ٹوکرا لئے پتھر اٹھانے چشمے پر آیا تو دیکھا کہ ایک برمی لڑکی چشمے کنارے پتھر پر بیٹھی کپڑے دھو رہی ہے۔ میں نے کوئی خیال نہ کیا۔ کبھی کبھی یہاں قریبی گاؤں کی عورتیں کپڑے دھونے آ جایا کرتی تھیں اور ہمیں ان سے بات کرنے کی بالکل اجازت نہیں تھی۔ سڑک یہاں سے اوپر چند قدموں کے فاصلے پر تھی جہاں ایک جاپانی کاندھے پر رائفل ڈالے ٹہلتا اور قیدیوں کی کارگزاری چیک کرتا رہتا تھا۔ یہ بے ضرر اور بے تعلق سی دیہاتی عورتیں تھیں۔ یہ بھی قیدیوں میں کوئی دلچسپی نہیں لیتی تھیں۔ میں چشمے کے قریب ایک جگہ بیٹھ کر ٹوکری میں گول گول پتھر ڈالنے لگا۔

چشمے پر کپڑے دھونے والی لڑکی کا چہرہ دوسری طرف تھا میں نے ٹوکری اٹھا کر سر پر رکھی اور جب چلنے لگا تو ایک گول پتھر پر سے میرا پاؤں پھسل گیا۔ ٹوکری گر پڑی لڑکی نے پلٹ کر دیکھا میں نے بھی اس کی طرف دیکھا اور ہم دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہ گئے۔ یہ ساتیں تھی۔ وہی لڑکی جو رنگون کے سولی پیگوڈا کی سیڑھیوں پر پھول بیچا کرتی تھی۔ ساتیں کو معلوم تھا کہ جنگی قیدیوں کا کیمپ قریب ہی ہے اور وہ سمجھ گئی تھی کہ میں جنگی قیدی بن چکا ہوں ۔ اس کا ایک ثبوت میری پھٹی پرانی قیدیوں والی نیلی وردی بھی تھی۔ چنانچہ حیرت کی کیفیت سے نکلتے ہی اس نے مجھے ہاتھ کے اشارے سے بانس کے درختوں کی طرف آنے کو کہا۔ میں زمین پر بیٹھا ٹوکری میں پتھر دوبارہ ڈال رہا تھا۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا سڑک کی طرف گشت کرنے والا جاپانی سپاہی مجھے نظر نہ آیا۔ میں نے ٹوکری وہیں رکھی اور جھک کر چلتا تیزی سے بانس کے درختوں کے پیچھے آ گیا۔

ساتیں نے جلدی جلدی گیلے کپڑے نچوڑے اور جھاڑیوں میں سے گذرتی میرے

پاس آگئی۔ ایک پل کے لئے ہم ایک دوسرے کو دیکھتے رہ گئے۔ پھر اس نے پوچھا۔

"تم کہاں پکڑے گئے تھے؟"

"یہ لمبی کہانی ہے ساتیں۔ اگر زندہ بچ گیا تو پھر بتادوں گا۔ تم مجھے یہ بتاؤ کہ کیا یہاں سے فرار ہونے کا کوئی راستہ ہے؟"

ساتیں نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔ گیلے کپڑے اس کے ہاتھوں میں تھے پھر کہنے لگی۔

"کیا تم روز یہاں پتھر اٹھانے آتے ہو؟"

"ہاں۔ میں کل بھی آؤں گا" میں نے جواب دیا۔

ساتیں نے ایک سیکنڈ کے لئے کچھ سوچا اور بولی۔

"میں کل اسی وقت آؤں گی بس اب تم جاؤ یہ لوگ بڑے ظالم ہیں۔ انہوں نے ہمارے گاؤں کے کئی لوگ مار ڈالے ہیں"

یہ کہہ کر ساتیں نے عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھا اور بھاگ کر جھاڑیوں میں غائب ہو گئی۔ ساتیں میرے دل میں امید کی شمع روشن کر گئی تھی۔ میرے دل میں ایک نیا جذبہ بھر گئی تھی۔ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ اب میں اس خوفناک قیدی کیمپ سے فرار ہو جاؤں گا۔ میں پتھر اٹھائے سڑک پر آیا تو جاپانی سپاہی نے رائفل کا بٹ میری پسلیوں میں دے مارا۔ میں گر پڑا۔ وہ اپنی زبان میں نہ جانے غصے میں کیا کچھ کہتا گیا۔ خدا کا شکر ہے کہ اس نے مجھے ساتیں سے باتیں کرتے نہیں دیکھا تھا۔ اگر دیکھا ہوتا تو مجھے وہیں گولی مار دیتا۔

اب میں بے تابی سے دوسرے دن کا انتظار کرنے لگا۔ میں نے بڑی مشکل سے رات کاٹی۔ صبح ہوئی تو دل کو یہی دھڑکا لگا تھا کہ کہیں مجھے جنگل میں جا کر مشقت کرنے سے روک نہ دیا جائے۔ یا پھر کہیں ساتیں چشمے پر نہ آسکے طرح طرح کے وسوسوں نے دل کو گھیر لیا تھا۔ قیدیوں کی رول کال کے بعد کیمپ سے باہر جا کر مشقت کرنے والے قیدیوں کی ٹکڑی الگ کر دی گئی۔ میں نے سکون کا سانس لیا۔ اس ٹکڑی میں میں شامل تھا۔

میں سڑک پر جا کر پتھر ڈھونے لگا۔ میری نگاہیں بار بار نشیب میں واقع چشمے کی طرف اٹھ جاتیں۔ ساتیں نے یہی وقت دیا تھا۔ مگر وہ ابھی تک نہیں آئی تھی۔ میں چشمے کے پاس بکھرے پتھروں کو ٹوکری میں بھر کر چوتھا پھیرا لا رہا تھا کہ جاپانی سپاہی نے مجھے اشارے سے اپنے پاس بلایا۔ میں گھبرا گیا۔ کہیں اسے علم تو نہیں ہو گیا کہ میں آج فرار ہو رہا ہوں۔ کہیں ساتیں بھی تو جاپانیوں سے ساتھ نہیں ملی ہوئی؟ وہ وقت ہی ایسا تھا۔ میرے دل میں ہر طرح کے خدشے پیدا ہو سکتے تھے۔ جاپانی نے سڑک کی دوسری طرف اشارہ کیا اور ٹوٹی پھوٹی اردو میں کہا کہ میں سڑک کی دوسری طرف جا کر کام کروں۔ میرے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ کیونکہ اس طرح میں ساتیں سے نہیں مل سکتا تھا۔ اور ساتیں سے نہ ملا تو میں اس موت کے کیمپ سے نجات حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ میں انکار نہیں کر سکتا تھا۔ انکار کا مطلب میری موت تھا۔ میں خاموشی سے سڑک کی دوسری طرف ڈھلان میں اتر گیا۔ وہ چشمہ میری نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا جہاں آنے کے لئے ساتیں نے مجھے کہا تھا۔



نیک دل برمی لڑکی ساتھیں نے مجھے پہاڑی چشمے پر آنے کا کہا تھا۔ مگر جاپانی سپاہی نے عین وقت پر مجھے سڑک کی دوسری جانب مشقت پر لگا دیا تھا۔ یہ جگہ ڈھلان میں تھی۔ یہاں سے چشمہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ بڑا پریشان تھا۔ مجھے یقین تھا کہ برمی لڑکی چشمے کپڑے دھونے کے بہانے آچکی ہو گی۔ اور اس کی نگاہیں ادھر ادھر مجھے تلاش کر رہی ہوں گی مگر میں سڑک کی دوسری طرف ڈھلان میں پتھر ڈھو رہا تھا۔ جاپانی سپاہی رائفل کندھے سے لگائے زیر تعمیر سڑک پر ٹہل رہا تھا۔ میں چشمے پر نہیں جا سکتا تھا۔ تھوڑے فاصلے پر دوسرے قیدی بھی مشقت میں لگے ہوئے تھے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کروں؟ اس روز برمی لڑکی ساتھیں مجھے وہاں سے بھگانے کی کوئی ترکیب بتانے والی تھی وقت گذر گیا۔ سورج درختوں کے اوپر آگیا۔ دوپہر کے وقت جنگی قیدیوں کو وہیں جنگل میں ستانے کے لئے تھوڑا سا وقفہ ملتا تھا۔ اس وقفے میں بھی ہمیں ادھر ادھر جانے اجازت نہیں تھی۔ مگر میں جاپانی پہرے دار کی آنکھ بچا کر سڑک پر آگیا۔ میری نظریں تابی سے چشمے کی طرف گئیں۔ مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔ برمی لڑکی یقیناً میرا انتظار کر کے چکی تھی۔

دوسرے دن قیدیوں کو مشقت کے لئے جنگل میں لے جایا گیا تو میری یہی کوشش تھی کہ میں چشمے پر جا کر پتھر ڈھوؤں مگر دوسرے روز بھی مجھے سڑک کی دوسری طرف مشقت پر لگا دیا گیا۔ اس روز ہمارا کام سڑک پر ڈالے گئے۔ پتھروں کو پھاوڑوں سے ہ کرنا تھا۔ ہم دس بارہ قیدی تھوڑے تھوڑے فاصلے پر کام کر رہے تھے۔ میں ان سب

عمر تھا۔ میں جس مقام پر مشقت پر لگا تھا وہاں نشیب میں خاکی اور نسواری رنگ کی بڑی گول گول چٹانوں کے درمیان ایک پہاڑی ندی بہہ رہی تھی۔ ایک بار جو میری ادھر پڑی تو مجھے چٹان کے پیچھے ایک عورت کا چہرہ نظر آیا۔ فاصلہ کوئی پچاس ساٹھ وں کا تھا۔ میں نے اس چہرے کو فوراً پہچان لیا۔ یہ میری ہمدرد اور نیک دل برمی لڑکی ئیں تھی۔ وہ ہاتھ کے اشارے سے مجھے اپنی طرف بلا رہی تھی۔ یہ بڑا خطرناک بلاوا مجھے کچھ پتہ نہیں تھا کہ ساتیں نے میرے فرار کی کیا سکیم تیار کر رکھی ہے اور آیا وہ بھی ہے کہ نہیں۔ کیونکہ ساتیں کوئی تجربہ کار سیانی عورت نہیں تھی۔ مگر وہ اپنا ہاتھ بار ہلا کر مجھے بلا رہی تھی۔ مجھے فوری طور پر فیصلہ کرنا تھا۔ ابھی یا پھر کبھی نہیں -----

لی قیدیوں کے کیمپ کی اذیت ناک زندگی اور آزادی کے درمیان صرف پچاس قدموں فاصلہ تھا۔ اس فاصلے میں میری موت بھی تھی اور آزادی کی زندگی بھی تھی۔ ساتیں وڑی دیر ہاتھ ہلا کر چٹان کی اوٹ میں ہو جاتی تھی۔ میرے خون نے جوش مارا۔ میں نے یکھا کہ گارڈ ڈیوٹی کے دونوں جاپانی سپاہی پتھروں پر بیٹھے سگریٹ پیتے ایک دوسرے سے ں ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔ اتفاق سے اس وقت ان کی پشت میری جانب تھی۔ چار نگی قیدی میرے قریب ہی کام میں لگے تھے۔ میں وہیں آہستہ سے بیٹھ گیا۔ ایک قیدی نے میری طرف غور سے دیکھا۔ میں نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا شارہ کیا۔ قیدی سمجھ گیا کہ میں نے کوئی خطرناک فیصلہ کر لیا ہے۔ وقت بڑا نازک تھا۔ وقت بڑا کم تھا۔ بادلوں سے اچھل کر باہر نکلی ہوئی سورج کی کرن کی طرح یہ سنہری موقع بل دو پل کے لئے میرے پاس آیا تھا۔ پھر جیسے میری سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ختم ہو گئی۔ میں نے نیچے نشیب میں جو جنگلی جھاڑیاں تھیں اس میں چھلانگ لگا دی۔ چھلانگ لگانے کے ساتھ ہی میں اٹھا اور اندھا دھند چٹان کی طرف دوڑ پڑا۔ جنگلی گھاس میرے گھٹنوں تک تھی۔ دوڑنے میں دشواری ضرور ہو رہی تھی مگر ایک اطمینان بھی تھا کہ دوڑنے کی آواز پیدا نہیں ہو رہی تھی۔ آپ یہ ہرگز خیال نہ کریں کہ جاپانیوں کی قید سے فرار ہونا ایک آسان بات تھی حقیقت یہ ہے کہ اس وقت دو باتیں میرے حق میں جا رہی تھی۔ ایک یہ

کہ میں کیمپ کی چار دیواری سے باہر کھلے جنگل میں مشقت پر تھا۔ دوسری بات یہ پہرے دار اس وقت غافل ہو گئے تھے۔ جونہی میں چٹان کے عقب میں آیا ساتیں نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے کھینچتی ہوئی اس طرف لے گئی جہاں دو بہت بڑی بڑی چٹانوں کے درمیان ایک تنگ راستہ بنا ہوا تھا۔ یہ کوئی پچاس ساٹھ گز کا راستہ تھا جس کے آگے پہاڑی ندی کا کٹاؤ تھا۔ پانی چھوٹے بڑے پتھروں سے ٹکرا کر اچھلتا ہوا تیز رفتاری سے بہہ رہا تھا۔ ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ برمی لڑکی مجھے کہاں چھپانے کا پروگرام بنائے ہوئے ہے کیونکہ یہ سارا علاقہ کھلا تھا اور جاپانی مجھے بڑی آسانی سے تلاش کر لیتے تھے۔ ساتیں مجھ سے دو قدم آگے تیز تیز جا رہی تھی۔ ندی کنارے وہ ایک طرف گھوم گئی۔ میں بھی ادھر ہی گھوم گیا۔ آگے بھی ایک بلند چٹان تھی جس کی ایک دراڑ میں سے پانی چھوٹی سی آبشار کی شکل میں نیچے ندی میں گر رہا تھا۔ اس چٹان کے پیچھے بڑے بڑے پتھروں کے درمیان ایک چھوٹی سی قدرتی سرنگ بنی ہوئی تھی۔ ساتیں نے کہا۔

"میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ"۔

یہ کہہ کر وہ سرنگ میں داخل ہو گئی۔ یہاں اندھیرا تھا۔ سرنگ میں صرف ایک آدمی کے گذرنے کی گنجائش تھی۔ ساتیں آگے تھی۔ اندھیرے میں مجھے اس کا ہیولا سا نظر آ رہا تھا۔ سرنگ میں کئی موڑ آئے۔ اترائی چڑھائی بھی آئی۔ یہ سرنگ چٹانوں کے اندر ہی اندر چکر کاٹتی وادی کی دوسری طرف نکل گئی تھی۔ کھلی فضا اور روشنی میں آتے ہی میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ سامنے ایک نہر بہہ رہی ہے۔ نہر کے اوپر بانس اور ناریل کے درخت جھکے ہوئے ہیں۔ نہر کنارے ایک سمپان یعنی چھوٹی کشتی بندھی تھی۔ کشتی میں بیٹھ گئے۔ ساتیں نے چپو تھام لئے اور کشتی پانی کے بہاؤ کی طرف چل پڑی۔ ساتیں نے پوچھا۔ "تمہیں نکلتے ہوئے کسی نے دیکھا تو نہیں"۔ میں نے کہا۔ کہ "صرف ایک قیدی نے دیکھا تھا مگر وہ میرا خیر خواہ ہے۔ میں اسے جانتا ہوں۔ وہ میرے فرار پر خوش ہوا تھا۔ مگر ہم آگے کہاں جا رہے ہیں؟" ساتیں بولی۔ "ایسی جگہ جہاں جاپانی سپاہی تمہیں تلاش نہ کر سکیں"۔

میں سوچنے لگا کہ ہو سکتا ہے جاپانی سپاہیوں کو میرے فرار کا علم ہو گیا ہو اور وہ میری تلاش میں نکل چکے ہوں۔ مگر ابھی تک کسی طرف سے رائفل یا برین گن کے فائر کی آواز نہیں آئی تھی۔ ندی ایک اتنے گھنے جنگل میں داخل ہو گئی تھی کہ وہاں دن کے وقت بھی درختوں جھاڑیوں کی وجہ سے اندھیرا سا چھا رہا تھا۔ پانی کا بہاؤ کافی تیز تھا۔ کشتی تیزی سے آگے بڑھ رہی تھی۔ ندی نے ایک موڑ کاٹا تو ساتیں کشتی کو کنارے پر لے آئی۔ اس کی ہدایت پر میں نے کشتی کو کنارے پر کھینچ لیا اور ایک کافی بڑی جھاڑی میں چھپا دیا۔ اس کشتی کو برمی زبان میں سمپان کہتے ہیں اور یہ درخت کے تنے کو کھوکھلا کر کے بنائی جاتی ہے اور اس میں صرف دو آدمی ہی آمنے سامنے بیٹھ سکتے ہیں۔ ماہی گیر اسے سر پر اٹھا کر بھی لے جاتے ہیں۔

ساتیں مجھے ایک چٹان کے اندر بنی ہوئی قدرتی کھوہ میں لے آئی۔ کھوہ کا منہ تو چھوٹا تھا مگر پیچھے کافی کھلی جگہ تھی۔ دہانے کو گھاس پتوں نے ڈھانپ رکھا تھا۔ ساتیں نے یہاں پہلے سے سب انتظام کر دیا تھا۔ زمین پر سوکھے پتوں کا بستر لگا تھا۔ پانی سے بھرا ہوا مٹکا۔ ایک ماچس' موم بتی' سگریٹ اور کچھ جنگلی پھل وہاں موجود تھے۔ میں نے ساتیں سے کہا۔ "میں یہاں زیادہ دیر نہیں رہنا چاہتا ساتیں۔ کوئی ایسا بندوبست کرو کہ میں اس راستے پر چل پڑوں جو بنگال کی طرف نکل جاتا ہے۔" ساتیں کہنے لگی۔ "اس کا انتظام بھی ہو جائے گا۔ لیکن تمہیں ابھی دو ایک دن یہاں چھپے رہنا ہو گا۔ ہمارا گاؤں قریب ہی ہے مگر میں تمہیں وہاں نہیں لے جا سکتی۔ وہاں جاپانیوں کے جاسوس بھی ہیں جو انہیں خبر کر دیں گے۔ میرا بڑا بھائی سانگ میرے ساتھ مل گیا ہے۔ وہ تمہارا انتظام کرنے آج صبح ہی دوسرے گاؤں کی طرف چلا گیا تھا۔ تم یہاں آرام کرو۔ میں تمہارے لئے کچھ کھانے کو لاتی ہوں" ساتیں چلی گئی کوئی آدھ گھنٹے بعد میرے لئے چاول اور مچھلی کا شوربہ لے کر آئی۔ ایک عرصے بعد ایسی چیزیں کھانے کو ملی تھیں۔ میں سارے چاول کھا گیا۔ ساتیں جاتے ہوئے بولی۔

"یونہی باہر مت نکلنا۔ کسی نے دیکھ لیا تو جاپانی ایک سیکنڈ میں یہاں پہنچ جائیں گے۔ میں

شام کو کھانا لے کر آؤں گی"

ساتیں چلی گئی۔ مجھے اس خفیہ کمین گاہ میں رہتے ہوئے چھ روز گذر گئے۔ ساتیں نے مجھے بتایا کہ جاپانی ایک جیپ میں اس کی تلاش میں گاؤں میں بھی آئے تھے۔ مگر آگے نکل گئے۔ پانچویں روز ساتیں کا بڑا بھائی سانگ میرے پاس کھوہ میں آیا کہنے لگا۔

"سارے علاقے پر جاپانیوں کا قبضہ ہو گیا ہے۔ برسات بھی شروع ہو گئی ہے۔ جنگل کے سارے راستے بند ہو گئے ہیں۔ کوئی ایسا رستہ نہیں ہے کہ تم بنگال جا سکو۔ میں نے تمہارے لئے ایک ترکیب سوچی ہے۔ میرا ایک دوست مومین کے پاس ساتونگ کی بندرگاہ پر گودی مزدوروں کا میٹ Mate ہے۔ یہاں سے ہفتے میں ایک بار مال بردار سمندری جہاز فوجی اور دوسرا سامان لے کر انڈونیشیا کی طرف جاتا ہے۔ انڈونیشیا پر بھی اگرچہ جاپانیوں کا قبضہ ہے مگر وہ مسلمانوں کا ملک ہے۔ اگر تم اس ملک میں کسی طرح چلے جاؤ تو تمہیں وہاں کسی نہ کسی مسلمان گھرانے میں پناہ مل سکتی ہے۔ وہاں تمہیں پہچاننے کا بھی کوئی نہیں۔ جنگ کو تو آخر ایک دن ختم ہونا ہی ہے۔ پھر تم وہاں سے اپنے وطن جا سکتے ہو۔"

میں سوچ میں پڑ گیا۔ اس تجویز کو قبول کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ میں نے سانگ سے پوچھا۔ "کیا مال بردار جہاز میں میرے پکڑے جانے کا خطرہ نہیں ہو گا۔ جاپانی مجھے وہاں بھی گرفتار کر سکتے ہیں"۔

سانگ بولا۔ "اس کی تم فکر نہ کرو۔ تمہارا حلیہ بدل دیا جائے گا۔ میں نے اپنے دوست سے بات بھی کر لی ہے۔ اگر تمہیں میری تجویز قبول ہو تو تیار رہو جاؤ۔ میں آج رات کے پچھلے پہر ہی تمہیں اپنے ساتھ یہاں سے لے چلوں گا"۔ میں نے سوچا انڈونیشیا مسلمان ملک ہے کم از کم جنگ ختم ہونے تک مجھے وہاں کی مسلم فیملی میں ضرور پناہ مل جائے گی۔ میں نے ہاں کر دی۔ ساتیں اور اس کا بھائی مجھے صبح تیار رہنے کی ہدایت کر کے چلے گئے۔



برمی لڑکی کا بھائی سانگ گاؤں سے مجھے خفیہ طور پر نکال لے جانے کا منصوبہ تیار کر چکا تھا اور میں نے اس کے منصوبے پر عمل کرنے کی حامی بھر لی تھی۔ بات یہ ہے کہ میرے سامنے دوسرا کوئی راستہ بھی نہیں تھا۔ میں جاپانیوں کی قید سے بھاگا ہوا جنگی قیدی تھا اور وہ میری تلاش میں تھے۔ سارا علاقہ ان کے قبضے میں تھا۔ وہ کسی بھی وقت مجھ تک پہنچ سکتے تھے۔ کیونکہ علاقے میں جاپانیوں کے حامی برمی مخبروں کی کمی نہیں تھی۔

سانگ کہہ گیا تھا کہ میں رات کو آؤں گا۔ اس نے وہاں سے میرے فرار کا سارا بندوبست کر لیا تھا۔ پروگرام یہ تھا کہ مجھے ساتونگ نام کی ایک گودی سے مال بردار بحری جہاز میں سوار کروا کر انڈونیشیا کی طرف روانہ کر دیا جائے گا۔ اگرچہ انڈونیشیا بھی اس وقت جاپانیوں سے قبضے میں تھا لیکن وہ مسلمانوں کا ملک تھا اور برمیوں کی طرح وہاں کے انڈونیشی مسلمان جاپانیوں کے حامی نہیں تھے۔ بلکہ اپنے ملک کو جاپانیوں کے آزاد کرانے کے لئے خفیہ جدوجہد بھی کر رہے تھے۔ ان کی اسی جدوجہد کی تفصیل میں آگے چل کر بیان کروں گا۔ ساتیں کے بھائی سانگ نے مجھے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ یہ بڑا لمبا سمندری سفر ہو گا اور مجھے انڈونیشیا کی بندرگاہ جکارتہ پہنچتے پہنچتے دس پندرہ دن لگ جائیں گے۔ کیونکہ مال بردار جہاز کو ساتونگ کی برمی بندرگاہ سے چل کر بحر انڈیمان میں داخل ہونا تھا۔ اس سمندر کو پار کر کے خلیج ملاکا میں آ جانا تھا۔ یہاں سے سنگاپور کو اپنی بائیں جانب کافی فاصلے پر پیچھے چھوڑتے ہوئے ان گنت چھوٹے چھوٹے آباد اور غیر آباد جزیروں کے درمیان سے گذر کر بحر جاوا میں سفر کرتے ہوئے انڈونیشیا کے سب سے بڑے شہر اور بندرگاہ جکارتا

پہنچنا تھا۔ ایک تو سفر طویل تھا۔ دوسرے مال بردار جہاز کی رفتار ان دنوں کافی سست ہوا کرتی تھی۔ مگر یہ میری زندگی اور موت کا سوال تھا۔ میں تو کسی ایسے جہاز میں بیٹھنے کو تیار تھا جو ایک سال تک سمندر میں سفر کرنے کے بعد انڈونیشیا پہنچتا۔ بشرطیکہ راستے میں کوئی جاپانی لانچ ہمیں چیک نہ کرتی۔

میں چٹانی غار میں اکیلا بیٹھا ساتیں کے بھائی اور اپنے خیر خواہ برمی نوجوان کا انتظار کر رہا تھا۔ رات گہری ہونے لگی۔ جنگل میں چاروں طرف دہشتناک قسم کی خاموشی چھائی۔ میرے کانوں میں آہٹ سی ہوئی۔ میں نے غار کے آگے آئی ہوئی جنگلی جھاڑیوں کو پیچھے ہٹا کر تیز نظروں سے دیکھا۔ اندھیرے میں مجھے دو انسانی ہیولے اپنی طرف بڑھتے دکھائی دیئے۔ یہ ساتیں اور اس کا بڑا بھائی سانگ تھا۔ ساتیں میرے لئے کھانا بھی لائی تھی۔ سانگ نے غار میں آکر موم بتی روشن کردی۔ وہ ایک تھیلے میں میرے لئے کچھ کپڑے بھی لایا تھا۔ میرا حلیہ یہ بدلا گیا کہ مجھے انڈونیشی مسلمانوں کی طرح کرتے کے اوپر لنگی بندھوا کر سر پر کالی کشتی نما ٹوپی پہنا دی۔ جو انڈونیشیا کے مسلمانوں کا عام پہناوا ہے۔ سانگ نے مجھے بیس روپے بھی دیئے۔ اس علاقے میں انگریزی سکہ بھی چلتا تھا۔ رات کے اندھیرے میں وہ مجھے ندی پار کروا کر جنگل میں بنی ہوئی ایک چھوٹی سی سڑک پر لے آیا جہاں ایک پرانا غیر فوجی ٹرک کھڑا تھا۔ ٹرک پر لکڑی کی گیلیاں لدی تھیں اور ایک ادھیڑ عمر برمی ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ یہاں سانگ اور ساتیں مجھ سے جدا ہو گئے۔ اندھیرے میں میں معصوم برمی لڑکی ساتیں کے چہرے کے تاثرات نہ دیکھ سکا۔ مگر اتنا آج بھی یاد ہے کہ وہ مجھ سے الگ ہوتے وقت اداس تھی۔ اداس میں بھی تھا مگر میرے آگے خطرات سے بھرا ہوا طویل سفر تھا۔ میں ایک طرح کی ہیجانی حالت میں بھی تھا۔ ساتیں نے ذرا سا جھک کر مجھے الوداع کہا اور اپنے بھائی کے ساتھ درختوں کے اندھیرے میں گم ہو گئی۔ اس وقت میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اب زندگی بھر اس معصوم برمی لڑکی سے ملاقات نہیں ہو گی۔ اس واقعے کو اتنے برس گذر گئے ہیں۔ بلکہ ایک زمانہ بیت گیا ہے۔ خدا جانے وہ برمی لڑکی کہاں ہو گی۔ زندہ بھی ہو گی یا نہیں۔ اگر زندہ ہو گی تو وقت نے میری طرح اس

کے چہرے کے نقش و نگار بھی بدل دیئے ہوں گے۔ اب اگر ہم مل بھی جائیں تو شاید ایک دوسرے کو نہ پہچان سکیں۔

یہ تو جذبات کی باتیں ہیں اور میں جذبات کی باتوں کو بڑی اہمیت دیتا ہوں۔ جذبات ہی زندگی کا سرمایہ ہوتے ہیں۔ لیکن میں زیادہ تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔ بہرحال میں کسی نہ کسی طرح ساتونگ کی بندرگاہ پر پہنچا دیا گیا۔ یہاں مجھے ایک ایسے آدمی کے حوالے کر دیا گیا جو مزدوروں کا ایجنٹ تھا بندرگاہ پر وہ برمی مال بردار جہاز کھڑا تھا جس نے مجھے انڈونیشیا پہنچانا تھا۔ اس زمانے میں پاسپورٹ وغیرہ کا سوال ہی نہیں تھا۔ کیونکہ یہ سارا علاقہ انگریزوں کے زیر نگیں تھا۔ مزدوروں کے ایجنٹ نے جہاز کے کپتان سے بات کر کے مجھے جہاز پر خلاصی بھرتی کروا دیا۔ اس نے کپتان کو میرے بارے میں یہ بتایا کہ میں پنجابی لڑکا ہوں۔ میرے ماں باپ انڈونیشیا میں مقیم ہیں۔ وہاں سے بھاگ کر رنگون آ گیا تھا۔ رنگون میں بھوکوں مرنے لگا۔ اب واپس انڈونیشیا اپنے ماں باپ کے پاس جانا چاہتا ہوں مگر کرائے کے پیسے نہیں ہیں۔ کپتان ادھیڑ عمر کا مگر گرانڈیل پر بنگالی تھا جو اس علاقے کی تقریباً ساری زبانیں بول لیتا تھا۔ اس نے مجھے جہاز پر بطور خلاصی رکھ لیا۔ طے یہ پایا کہ میں جکارتا تک جہاز پر مزدوری کر کے اپنا راشن حاصل کروں گا۔ مجھے اور کیا چاہیے تھا صرف ایک بات کا ڈر تھا کہ کہیں جاپانی مجھے پکڑ نہ لیں۔ یہاں کہیں کہیں کوئی جاپانی فوجی نظر پڑ جاتا تھا اور گودی میں ایک دو جاپانی جہاز بھی کھڑے تھے مگر کسی نے مجھے اہمیت نہ دی۔ میں رنگون سے بہت دور نکل آیا تھا۔

دوسرے روز صبح صبح جہاز نے لنگر اٹھا لیا اور انڈیمان کے سمندر میں اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گیا۔ جہاز پر میرا کام یہ تھا کہ روزانہ صبح شام عرشے کے فرش کو دھو کر صاف کرتا۔ نیچے جو چار کیبن بنے ہوئے تھے ان کی بھی صفائی کرتا جہاز کے کچن میں کھانا کھانے جاتا تو باورچی مجھ سے برتن بھی صاف کروا لیتا۔ میں یہ سارا کام بڑی خوشی سے کر دیتا۔ کیونکہ میں جنگی قیدیوں کے کیمپ سے بہت دور ہوتا جا رہا تھا۔ انڈیمان کا سمندر بڑا خطرناک اور ڈراؤنا سمندر ہے۔ ہر وقت یہاں طوفان کی حالت رہتی ہے۔ جہاز سارا رستہ

ڈولتا رہا۔ شروع میں مجھے چکر بھی آئے۔ پھر میں عادی ہو گیا۔ خلیج ملاکا سے نکلنے کے ب جہاز راستے میں تین جگہ جزیروں کی گودیوں میں ایک ایک دن کے لئے رکا۔ یہ میر لئے بڑی آزمائش اور مشکل کا وقت تھا۔ کیونکہ یہاں بھی جاپانیوں کا قبضہ تھا اور گودی پر جاپانی فوجی چلتے پھرتے دکھائی دے رہے تھے۔ میں اس دوران زیادہ تر جہاز کے اندر ر رہا۔ خدا خدا کر کے کوئی بیس دن کے بعد جہاز جکارتہ کی بندرگاہ کے پانیوں میں داخل ہ گیا۔

میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ اگرچہ ابھی میں خطرے میں ہی تھا کیونکہ انڈونیشیا پر بھ جاپانیوں نے ڈچ فوج کو شکست دے کر قبضہ کر لیا ہوا تھا۔ یہاں میں یہ بتاتا چلوں ک انڈونیشیا پر جنگ سے پہلے ہالینڈ والوں کا قبضہ تھا اور وہ اس ملک کی دولت لوٹ رہ تھے۔ جس طرح ہندوستان پر انگریزوں نے قبضہ جما رکھا تھا۔ ہالینڈ والوں کو ڈچ او ولندیزی بھی کہا جاتا ہے۔ مگر انڈونیشیا کے مسلمانوں میں ہالینڈ کے جبر و استبداد سے اپ وطن کو آزاد کرانے کی ایک زبردست تحریک بھی چل رہی تھی جس کے سربراہ سوئیکار تھے جو بعد میں اسلامی جمہوریہ انڈونیشیا کے صدر بنے اور جو پاکستان کے بہترین دوستو میں سے تھے۔ اور جو اس بات کو نہیں بھولے تھے کہ دوسری جنگ عظیم میں انگریزوں ک جو انڈین فوج جاپانیوں اور بعد میں ولندیزیوں کے خلاف لڑ رہی تھی اس فوج کے اک پنجابی مسلمان فوجی اپنی فوج چھوڑ کر سوئیکارنو کی گوریلا فوج میں شامل ہو گئے تھے۔ ا پنجابی مسلمان فوجیوں نے انڈونیشیا کے حریت پسندوں کے ساتھ شامل ہو کر بہت بڑا خط مول لیا تھا۔ کیونکہ ان کے ماں باپ بہن بھائی پنجاب میں آباد تھے اور انگریز جنگ می جاپانیوں کے خلاف فتح حاصل کر چکا تھا اور فوج سے بھاگ کر دشمنوں کے ساتھ مل جا والے سپاہیوں کی سزا موت تھی اور ان اسلام پسند فوجیوں کے گھربار والوں کو پریشان ک جا سکتا تھا مگر اسلام کا رشتہ اتنا مضبوط رشتہ ہے کہ انگریز رجمنٹوں سے مسلمان فوجیوں۔ اپنے انڈونیشی مسلمان بھائیوں پر گولی چلانے کی بجائے انگریز کی فوج کو چھوڑ دیا او انڈونیشی مسلمان حریت پسندوں کے ساتھ شامل ہو گئے۔ لیکن یہ بعد کی کہانی ہے جو می

آگے چل کر بیان کروں گا۔ ابھی تو صورتحال یہ تھی کہ انڈونیشیا جاپانیوں کے قبضے میں تھا ور جنگ بڑے زوروں پر لڑی جا رہی تھی۔

جکارتہ کی بندرگاہ میں پہنچتے ہی جہاز کا لنگر گرا دیا گیا۔ مجھے بھی اس کے ساتھ ہی چھٹی ل گئی۔ میں نے جہاز پر مزدوری کر کے تھوڑے سے پیسے جمع کر لئے تھے۔ میں بندرگاہ ے باہر نکل آیا۔ یہ علاقہ میرے لئے بالکل نیا تھا۔ میرے سامنے صاف ستھری سڑکیں ھیں جن کے کنارے کہیں سنبل اور کہیں ناریل کے درخت لہرا رہے تھے۔ جاپانیوں کے جی ٹرک بھی گذر رہے تھے۔ مجھے ان سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ کیونکہ یہ لوگ دوسری نوں کے جاپانی فوجی تھے اور مجھے کہاں پہچان سکتے تھے۔ اب میرا پروگرام کسی ایسے سلمان پنجابی فیملی کو تلاش کرنا تھا جہاں میں پناہ بھی لے سکوں اور مجھے کوئی کام بھی مل ائے تاکہ جب تک جنگ ختم نہیں ہوتی میں آرام و سکون سے وقت گذار سکوں۔ میں جوان تھا جسم مضبوط اور ورزشی تھا۔ رنگ سرخ و سپید تھا اور انڈونیشیا کے رہنے والوں ے مختلف تھا۔ شکل ہی سے پتہ چل جاتا تھا کہ میں پنجاب سے آیا ہوں۔ بہرحال میں ڑک پر ایک طرف چل پڑا۔ جہاز پر سے بھرپور ناشتہ کر کے چلا تھا۔ موسم گرم تھا اور فضا بس آلود تھی۔ سڑک پر مقامی لوگوں کے علاوہ جاپانی سپاہی چل پھر رہے تھے۔ کہیں کہیں سی چوک میں ان کی پوسٹیں بھی تھیں۔ میں وہاں سے کترا کر نکل جاتا۔ اچانک میری ظر ایک بورڈ پر پڑ گئی۔ جس پر پنجاب ہوٹل اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں لکھا تھا۔ یک بھاری بدن والا پکی عمر کا آدمی کاؤنٹر کے پیچھے کرسی پر بیٹھا رجسٹر سامنے رکھے کچھ لکھ ہا تھا۔ میں نے اس کے پاس جا کر سلام کیا اور پنجابی میں کہا کہ مجھے اپنے ہوٹل میں نوکر کھ لیں میرا اس شہر میں کوئی نہیں ہے۔ ہوٹل کے مالک نے آنکھیں سکیڑ کر میری طرف ور سے دیکھا اور دو تین سیکنڈ تک دیکھتا ہی رہا۔ پھر اشارے سے مجھے قریب بلایا اور پنجابی ں میں بولا۔

"تمہارا نام کیا ہے۔ کہاں سے آئے ہو؟"

میں نے جھوٹی کہانی گھڑ کر سنا دی کہ اپنے ماں باپ کے ساتھ مولمین میں رہتا تھا۔

جاپانیوں نے حملہ کر کے میرے ماں باپ کو ہلاک کر دیا۔ میں بڑی مشکل سے جان بچا کر ایک جہاز میں سوار ہو گیا جس نے مجھے یہاں پہنچا دیا ہوٹل کے مالک کا نام عبدالرحیم تھا۔ اس کا تعلق گجرات شہر سے تھا اور وہ ایک عرصے سے انڈونیشیا میں مقیم تھا۔ کچھ دیر تک وہ سوچتا رہا۔ پھر بولا۔ "ٹھیک ہے بیس روپے تنخواہ روٹی ناشتہ ملے گا۔ رات کو سونے کی جگہ مل جائے گی۔ منظور ہے؟"

میں نے فوراً کہا۔ منظور ہے جناب -----" ہوٹل کے اندر کچھ گاہک بیٹھے چائے کافی وغیرہ پی رہے تھے۔ ایک طرف سے زینہ اوپر کے کمروں کو جاتا تھا۔ یہ بالکل معمولی سا ہوٹل تھا۔ جس طرح ہمارے ہاں چھوٹے شہروں میں ریلوے سٹیشنوں کے سامنے ہوا کرتے ہیں۔ میں نے اسے بتا دیا تھا کہ میں پڑھ لکھ سکتا ہوں۔ عبدالرحیم نے کاؤنٹر پر سے ایک کاپی اٹھا کر مجھے دی اور بولا۔ "اس میں جتنے بل رکھے ہیں ان کی رقمیں الگ کاغذ پر اتار دو" میں وہیں ایک طرف کرسی پر بیٹھ کر کام میں لگ گیا۔ عین اس وقت میں نے دیکھا کہ ایک جاپانی سپاہی کندھے میں رائفل لٹکائے ہوٹل کی طرف چلا آ رہا ہے۔ میرا دل زور سے دھڑک اٹھا۔



میرے دماغ میں پہلا خیال یہی آیا کہ یہ میری تلاش میں ہی ادھر آ رہا ہے۔ عین اس وقت سڑک پر فوجی ٹرک گذرنے لگے اور جاپانی سپاہی اس کی اوٹ میں آ گیا۔ وہ سڑک کی دوسری طرف رک گیا تھا۔ مجھے موقع مل گیا میں نے ہوٹل کے مالک رحیم صاحب سے کہا کہ جاپانی سپاہی ادھر آ رہا ہے۔ رحیم صاحب نے سڑک پر سے گذرتے فوجی ٹرکوں کی طرف دیکھا اور بولے۔

"اوپر والی منزل میں چلے جاؤ۔ جلدی کرو میں سنبھال لوں گا"۔

انہوں نے شاید دو ٹرکوں کے درمیان سے جاپانی سپاہی کی جھلک دیکھ لی تھی۔ میں زینے کی طرف بھاگا اور دوسری منزل والے کمرے میں جا کر چھپ گیا۔ اس کے بعد مجھے نہیں پتہ نیچے کیا ہوا۔ کوئی پندرہ بیس منٹ بعد رحیم صاحب خود اوپر والے کمرے میں آئے اور دروازہ بند کر کے لوہے کی کرسی پر بیٹھ کر بولے۔

"تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا کہ تم جاپانیوں کی قید سے بھاگے ہوئے خطرناک باغی ہو؟"

تب میں نے رحیم صاحب کو ساری کہانی بیان کر دی اور کہا کہ میں نے تو محض ڈر کے مارے اصل حقیقت بیان نہیں کی تھی۔ رحیم صاحب نے کہا۔

"تم برما کے پی ڈبلیو کیمپ سے اتنی دور آ گئے ہو کہ اصولی طور پر جاپانیوں کو یہاں تک تمہارے بارے میں اطلاع نہیں کرنی چاہئے تھی مگر جاپانی تمہیں تخریب کار سمجھتے ہیں۔ تم رنگون میں کسی اخبار کے دفتر میں بھی ملازم تھے؟"

"جی ہاں" میں نے کہا۔ "مگر وہاں میں پروف ریڈر تھا اور میرا تخریب کاروں سے

کوئی واسطہ نہیں ہے سر!"

رحیم صاحب کچھ دیر چپ رہے پھر میری طرف متوجہ ہو کر کہا۔

"کچھ بھی ہو۔ میں تمہیں اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔ تم میرے صوبے کے ہو۔ پنجابی لڑکے ہو میں نہیں چاہتا کہ جاپانی تمہیں پکڑ کر لے جائیں اور پھر کسی فوجی کیمپ میں تمہیں گولی سے اڑا دیا جائے"۔

یہاں میں ایک بات کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں۔ میں قیام پاکستان سے پہلے کی بات کر رہا ہوں۔ اس زمانے میں جنوب اور جنوب مشرقی ایشیاء کا کوئی شہر کوئی بڑا قصبہ ایسا نہ تھا جہاں پنجاب کے لوگ کاروبار یا نوکریوں کے سلسلے میں نہ پہنچے ہوئے ہوں۔ ملایا' سنگا پور اور انڈونیشیا کی ٹریفک پولیس میں تو جہلم' گجرات' گوجر خان' چکوال اور میانوالی کے ہزاروں جوان بھرتی ہو کر شہروں کا نظم و نسق سنبھالے ہوئے تھے۔ قد کاٹھ میں بڑے ہونے اور دلیر ہونے کی وجہ سے برصغیر اور جنوبی ملکوں کے شہروں میں لوگ ان سے بہت گھبراتے تھے۔ کسی جگہ لڑائی ہو رہی ہو اور کوئی پنجابی یا پٹھان وہاں آجاتا تو لڑنے والے لڑائی چھوڑ کر بھاگ جاتے تھے۔ ایسے کئی منظر میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں۔ سخت جان اور مہم پسند ہونے کی وجہ سے پنجابی اپنے صوبے سے نکل کر دور دراز سمندر پار کے شہروں میں پھیل گئے تھے اور ان ممالک میں زبردست بزنس کرتے تھے۔ اپنے صوبے میں وہ ایک دوسرے کے دشمن بھی ہو جاتے مگر سمندر پار ایک دوسرے سے مل کر بڑے خوش ہوتے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں نوعمری کے زمانے میں ایک روز شلوار قمیض پہنے پینانگ کی ایک سڑک پر جا رہا تھا کہ سامنے سے ایک بزرگ لپک کر میری طرف آئے اور مجھ سے بغل گیر ہونے کے بعد گلوگیر آواز میں بولے۔

"کاکا! گجراتوں آیاں کہ لاہوروں؟"

چنانچہ پنجاب ہوٹل کے مالک رحیم صاحب نے جو مجھے تحفظ دے کر خطرہ مول لیا تھا اس میں بھی یہی جذبہ کارفرما تھا۔ قیام پاکستان کے بعد تو اس جذبے نے ایک نیا رنگ اختیار کر لیا۔ اب کسی دوسرے ملک میں کوئی پنجابی' سندھی' بلوچی یا پٹھان ملتے ہیں تو اپنے

پاکستانی اور مسلمان ہونے پر فخر کرتے ہیں اور ایک دوسرے کو یوں بے تابی سے گلے لگاتے ہیں جیسے کوئی مدتوں سے بچھڑا ہوا بھائی مل گیا ہو۔ اس کا بھی مجھے تجربہ ہو چکا ہے۔ میں ایک بار نیویارک کے ایک ریستوران میں بیٹھا کافی پی رہا تھا کہ ایک صاحب دوسری میز سے اٹھ کر میرے پاس آئے اور جھک کر پوچھا۔

"آپ پاکستانی تو نہیں؟"

میں نے مسکرا کر کہا۔ "جی میں پاکستانی ہوں"۔

وہ ہنس کر بولے۔ "تو پھر بیٹھے کیوں ہیں گلے ملئے"

انہوں نے ایک بار بھی یہ نہیں پوچھا کہ تمہارا تعلق کس صوبے سے ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اپنے وطن کی قدر پردیس میں جا کر ہوتی ہے۔ کتنا فراخ دل اور مہمان نواز ہے میرا وطن پاکستان کہ اگر گاڑی چھوٹ گئی ہے اور شہر میں کوئی جاننے والا نہیں اور ہوٹل میں کمرہ لینے کے لئے پیسے بھی نہیں تو میں آرام سے ریلوے پلیٹ فارم کے کسی بینچ پر سو کر رات گذار سکتا ہوں۔ آپ مجھے نیویارک یا واشنگٹن کے ریلوے سٹیشن پر سو کر دکھائیں۔ سیکورٹی گارڈ ڈنڈا لے کر آجائے گا اور آپ کے خواب خرگوش کو گردن سے پکڑ کر سٹیشن سے باہر پھینک دے گا۔

خدا کے لئے کبھی اپنے وطن پاکستان کی نعمتوں پر بھی غور کر لیا کریں۔ بہرحال یہ تو آپس کی باتیں تھیں اب میں واپس اپنی کہانی کی طرف آتا ہوں۔ رحیم صاحب نے بتایا کہ جاپانی سپاہی میری ہی تلاش میں آیا تھا اور اس کے پاس میری ایک فوٹو بھی تھی۔ یہ میری خوش قسمتی رہی کہ جاپانی سپاہی نے مجھے قریب سے نہیں دیکھا تھا۔ دراصل میرا رنگون کے اخبار میں ملازمت کرنا اور کمائیٹ میں سیاسی لوگوں کی کوٹھی میں میرے قیام نے جاپانیوں کو یقین دلا دیا تھا کہ میں کوئی خطرناک جاسوس اور تخریب کار ہوں۔ اور میری تلاش کا سلسلہ رنگون سے جکارتہ تک پہنچ گیا تھا۔ میں پریشان ضرور ہوا کہ اتنی دور آ کر بھی مجھے چین نہیں مل سکا لیکن رحیم صاحب نے میرے تحفظ کا جو ذمہ لے لیا تھا اس نے وقتی طور پر میری پریشانی دور کر دی تھی۔ رحیم صاحب کہنے لگے۔

"برخوردار !اب تمہارا میرے ہوٹل میں کام کرنا ٹھیک نہیں۔"

میں نے فکر مندی سے سوال کیا۔ "تو میں کہاں جاؤں گا سر؟" یہاں تو مجھے کوئی بھی نہیں جانتا"۔

رحیم صاحب کرسی سے اٹھے اور کہا۔

"تم ابھی اسی کمرے میں رہو نیچے مت آنا میں باہر سے تالا لگا رہا ہوں۔ باقی مر سنبھال لوں گا۔"

میں رات کے دس گیارہ بجے تک اسی کمرے میں بند رہا۔ رحیم صاحب ایک بار آ کر مجھے کھانا دے گئے تھے۔ اس ہوٹل میں دو چار ہی نوکر تھے اور ابھی وہ میری شکل سے پوری طرح واقف نہیں ہوئے تھے۔ رات کو جب رحیم صاحب نے ہوٹل بند کیا تو مجھے پچھلے زینے سے ایک تنگ سی گلی میں لے آئے۔ اس گلی کے باہر ایک اوپر سے بن سویلین پرانی جیپ کھڑی تھی۔ یہ ان کی اپنی جیپ تھی۔ میں رحیم صاحب کے ساتھ آ بیٹھ گیا اور جیپ جکارتہ شہر کے نسبتاً بے رونق بازاروں سے گذرتی شہر کے باہر ایک جگ تالاب کے پاس جا کر درختوں میں رک گئی۔ یہاں دو آدمی پہلے سے منہ سر لپیٹے ایک پرانے ٹائپ کی فوجی جیپ لئے ہمارے انتظار میں تھے۔ رحیم صاحب نے مجھے ایک طرف لے جا کر کہا۔

"یہ لوگ تمہیں محفوظ جگہ پر لے جائیں گے جب حالات ٹھیک ہوئے تو میں تمہ جکارتہ واپس بلا لوں گا۔"

انہوں نے مجھے ان دو آدمیوں کے حوالے کر دیا جن کی شکل وصورت مجھے نظر نہ آ رہی تھی۔ انہوں نے کاندھوں پر برین گنیں لٹکا رکھی تھیں۔ میں ان کے درمیان گا میں بیٹھ گیا اور گاڑی شہر کے مضافات سے نکل کر جنگلی علاقے میں داخل ہو گئی۔ مختصراً کہ مجھے گھنے جنگل میں ایک جگہ بنے ہوئے بانس کے مکان میں پہنچا دیا گیا۔ جہاں گا کے رکتے ہی ایک ٹھگنے قد کا آدمی ہاتھ میں لمبا چھرا لئے اندھیرے میں سے نکل آیا۔ لوگ انگریزی اور ٹوٹی پھوٹی اردو بول لیتے تھے۔ یہ لوگ زیادہ بات نہیں کرتے تھے۔

کا مکان لکڑی کے زمین سے اونچے ایک تختے پر بنا تھا۔ اس میں دو کوٹھڑیاں تھیں۔ ایک کوٹھڑی میں چارپائی پر بستر بچھا تھا اور مچھردانی بھی لگی تھی جو اس علاقے میں ایک نعمت تھی کیونکہ وہاں ایسے دلیر مچھر ہوتے تھے کہ جو تیز آندھی میں بھی دشمن پر وار کر دیتے تھے اور اڑتے نہیں تھے۔ مجھے ابھی تک یہ معلوم نہیں ہوا تھا کہ یہ لوگ کون ہیں اور کیا کرتے ہیں۔ مجھے وہاں رہتے تین دن گذر گئے۔ اس دوران ایک گونگا بوڑھا نوکر مجھے آ کر کھانا چائے وغیرہ دے جاتا۔ دن کے وقت مجھے جنگل میں ایک خاص حد سے آگے جانے کی اجازت نہیں تھی۔ میں تو تنگ آگیا' یہ تو ایک طرح سے جاپانیوں ہی کا قیدی کیمپ تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ مجھے قید کرنے والے میرے دشمن نہیں تھے۔ تیسرے دن کی بات ہے میں شروع رات میں مچھردانی کے اندر لیٹا مچھروں کی غصیلی آوازیں سن رہا تھا جو مچھر دانی کے اندر آنے کو بے تاب تھے کہ اچانک فائر کی آواز آئی۔ یہ آواز جنگل میں دور سے آئی تھی۔ دوسرے لمحے گونگا باورچی بھاگتا ہوا میرے پاس آیا اور مجھے کلائی سے پکڑ کر کھینچتا ہوا باہر لے گیا۔ پھر اس نے مجھے زبردستی ایک گنجان درخت پر چڑھا دیا اور اشاروں سے کہا کہ میں چھپ جاؤں۔ اتنا میں سمجھ گیا تھا کہ معاملہ گڑبڑ ہے۔ اور شاید جاپانی میری تلاش میں وہاں پہنچ گئے ہیں میں درخت کی گھنی شاخوں میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ اتنے میں سارا جنگل تھری ناٹ تھری اور برین گنوں کی فائرنگ سے گونج اٹھا۔ میں نے گونگے باورچی کو دیکھا وہ اس واڑے میں چھپ گیا جہاں ایک گائے بندھی رہتی تھی اور جس کے باہر بانس کے ساتھ ایک لالٹین جل رہی تھی۔ ایک گولی لالٹین کو لگی اور وہ چکنا چور ہو گئی۔ اچانک درختوں میں سے تین فوجی جیپیں نکلیں جن کی ہیڈ لائٹس روشن تھیں۔ اس میں کتنے ہی جاپانی سپاہی سوار تھے۔ وہ چھلانگیں لگا کر اترے اور ایک دوسرے کو آوازیں دیتے ہوئے انہوں نے پوزیشنیں سنبھال لیں۔ دو جاپانی ٹارچ روشن کر کے اپنے افسر کے ساتھ کسی کو تلاش کرنے لگے۔ میرے خیال میں وہ مجھے تلاش کر رہے تھے۔ میں درخت میں سانس روکے بیٹھا تھا۔ جاپانی بانس کے مکان میں گھس گئے۔ وہاں سے نکلے تو جاپانی افسر نے باڑے کی طرف اشارہ کیا۔ دو سپاہی باڑے کی طرف بھاگے اور اندر سے گونگے

انڈونیشی باورچی کو گھسیٹتے ہوئے باہر لے آئے اور جاپانی افسر کے قدموں میں لا کر ڈال دیا۔ جاپانی افسر نے بے چارے بوڑھے باورچی پر تھپڑوں اور گھونسوں کی بارش کر دی۔ باورچی غوں غاں کرتا رہا۔ انہوں نے ایک بار پھر ساری جگہ کی تلاشی لی۔ جب انہیں اور کچھ نہ ملا تو بوڑھے باورچی کو اپنے ساتھ پکڑ کر لے گئے۔ جب تک جاپانی فوجی جیپوں کی آواز جنگل میں بالکل غائب نہیں ہوئی میں درخت میں ہی بیٹھا رہا۔ جنگل میں ایک بار پھر ہو کا عالم طاری ہو گیا۔ ہر طرف اندھیرا چھا رہا تھا۔ میں درخت سے اتر آیا۔ سامنے بانس کی کوٹھڑی میں جانے کی بجائے میں باڑے کے پاس ہی ایک جگہ چھپ کر بیٹھ گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب میں کیا کروں۔ جنگل میں ہیبت ناک سناٹا تھا۔ اتنے میں مجھے جھاڑیوں میں کسی کے چلنے کی آواز آئی میں نے سانس روک لیا۔ پھر کسی لڑکی کی آواز سنائی دی وہ انگریزی میں کہہ رہی تھی۔ جاپانی چلے گئے ہیں۔

میں اندھیرے میں دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ تین انسانی سائے درختوں سے نکل کر سامنے آ گئے۔ کسی نے ٹارچ روشن کر دی۔ اس لڑکی نے پکار کر ٹوٹی پھوٹی اردو میں کہا

"ہم تمہارے دوست ہیں اگر تمہیں رحیم نے بھیجا ہے اور تم یہاں ہو تو سامنے آ جاؤ۔"

میں وہیں چپکا بیٹھا رہا۔ یہ سوچ کر کہ کہیں یہ بھی کوئی چال نہ ہو کہیں یہ لوگ بھی جاپانیوں کے ایجنٹ نہ ہوں۔



اس لڑکی نے چھاپہ مار گوریلوں کی وردی پہن رکھی تھی۔ اس کے دونوں ساتھی بھی اسی لباس میں تھے۔ لڑکی جھاڑیوں سے نکل کر بانس کے مکان کے سامنے آ گئی تھی۔ اس کے ایک ساتھی کے ہاتھ میں ٹارچ روشن تھی۔ اس کی دھندلی روشنی میں مجھے لڑکی کے کٹے ہوئے سیاہ بال نظر آ رہے تھے جو اس کی گوریلا کیپ سے باہر نکلے ہوئے تھے۔ میں ہی تک درخت میں چھپا تھا۔ جب گوریلا لڑکی نے پنجاب ہوٹل والے رحیم صاحب کا م لیا تو میں درخت سے نیچے اتر آیا۔ لڑکی میرے قریب آ گئی وہ نوجوان لڑکی تھی چہرہ ایسا ں تھا جیسا انڈونیشیا اور ملایا کی لڑکیوں کا ہوتا ہے۔ مگر اس کی آنکھوں میں بڑی تیز چمک ی اس نے اردو میں مجھ سے میرا نام پوچھا۔ میں نے اسے اپنا نام بتایا ان میں سے ایک وریلا پنجابی تھا۔ اس کا تعلق انگریز فوج کی ایک پنجاب رجمنٹ سے تھا جو اپنے انڈونیشی سلمان بھائیوں پر گولی چلانے کی بجائے انگریز کی فوج چھوڑ کر ان مسلمان انڈونیشی گوریلوں میں آن شامل ہوا تھا۔ جو اپنے وطن کی آزادی کے لئے ولندیزیوں کے خلاف اور اب جاپانیوں کے خلاف چھاپہ مار جنگ کر رہے تھے۔ جب تک جاپانیوں کا یہاں قبضہ نیں ہوا تھا تو انڈونیشی حریت پسند سوئیکارنو کی قیادت میں ڈچ آمریت کے خلاف جنگ کر رہے تھے۔ جاپانی آ گئے تو انگریزی فوج ولندیزیوں کے ساتھ وہاں سے بھاگ گئی۔ اب یہ آزادی کے متوالے گوریلے اپنے وطن کو جاپانی استبداد سے پاک کرنے کے لئے خفیہ جدوجہد کر رہے تھے کیونکہ جاپانی بھی ان حریت پسند گوریلوں کو ختم کرنے کے درپے تھے اور ان کی طاقت کو ختم کرنے کے لئے جنگلوں میں دور دور تک بمباری کرتے تھے۔ اس

پنجابی لانس نائیک کا نام اللہ داد تھا۔ اس نے مجھ سے پنجابی میں کچھ باتیں کیں۔ اس بعد گوریلا لڑکی نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور کہنے لگی۔ "میرا نام عائشہ ہے۔ میں اس علا کے گوریلا آپریشن کی انچارج ہوں۔ تم ہمارے ساتھ آؤ۔ کیونکہ صرف ہمارے پاس ہ محفوظ ہو گے۔ رحیم صاحب نے ہمیں تمہارے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے۔ سارے علاقے پر جاپانیوں کا قبضہ ہے اور وہ تمہاری تلاش میں ہیں۔"

میں نے اسے بتایا کہ میں کوئی سیاسی آدمی نہیں ہوں نہ ہی میرا کبھی کسی باغی گر سے تعلق رہا ہے۔ عائشہ نے کہا۔

رنگون میں تم کسی اخبار کے دفتر میں کام کرتے رہے ہو اور وہاں تمہارا قیام سیاسی شخصیت کے ہاں بھی تھا۔ اور تم تین مرتبہ جاپانیوں کی قید سے فرار بھی ہو چکے جاپانی انٹیلی جنس کے نزدیک تمہارے پاس کچھ ایسے راز ہیں جن کے پتہ چل جانے جاپانیوں کے لئے کلکتے پر قبضہ کرنا آسان ہو جائے گا۔

میں تو حیرانی کے ساتھ اس گوریلا لڑکی کی باتیں ہی سنتا رہا۔ مطلب یہ تھا کہ اب ت ان گوریلوں کے ساتھ انڈونیشیا کے جنگلوں میں اس وقت تک دربدر مارا مارا پھرنا تھا جب تک جنگ ختم نہیں ہو جاتی اور میرے لئے اپنے وطن جانے کی راہ نہیں کھل جاتی میرے سامنے دوسرا کوئی راستہ نہیں تھا۔ مجھے ان لوگوں میں شامل ہونا پڑا۔ میں۔ انہیں بتایا کہ یہاں جاپانی جیپوں میں سوار ہو کر آئے تھے۔ انہوں نے بڑی گولیاں چلائیں اور گونگے نوکر کو پکڑ کر لے گئے ہیں۔ عائشہ نے اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہو کر کہا "ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہئے" وہ اپنے ساتھیوں سے انگریزی ہی میں بات کرتی تھ اگرچہ ان میں ایک آدمی انڈونیشی تھا یہ سب مسلمان تھے۔ وہ مجھے اپنے ساتھ جنگل ایک ایسی جگہ پر لے آئے جہاں ان کی ایک جیپ کھڑی تھی۔ اس جیپ کو درختوں جھاڑیاں لگا کر کیمو فلاج کر دیا گیا تھا۔ مختصر یہ کہ میں ان حریت پسند گوریلوں کے خ ٹھکانے پر آگیا۔ جو جنگل میں ایک ایسی جگہ پر واقع تھا جس کی ایک جانب سمندر ت سمندر کو دیکھ کر میرا دل بڑا خوش ہوا۔ اگرچہ میں جاپانیوں کی پہنچ سے دور ہو گیا تھا

ایک طرح سے ان گوریلوں کے درمیان قید کر دیا گیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں فطرتاً مہم پسند ہوں اور میری یہی مہم پسندی اور خانہ بدوشی کا شوق مجھے اس عمر میں بھی اپنے گھر سے بھگا کر ان دور دراز اجنبی ملکوں میں لے آیا تھا۔ میرے کوئی سیاسی عزائم بھی نہیں تھے۔ سیاست کی باتیں نہ آج میری سمجھ میں آتی ہیں اور نہ اس وقت میری سمجھ میں آتی تھیں۔ مجھے جنگل' دریا' پہاڑ' جنوب مشرقی ایشیاء کی موسلا دھار بارشیں' جھیلوں میں کھلے ہوئے کنول کے پھول' معبدوں میں مذہبی رقص کرتی دیو داسیاں اور اندھیری راتوں کی بارش میں کسی بانس کی جھونپڑی میں بیٹھ کر چائے پینے کا شوق اس طرف لے آیا تھا۔ آمریت' استبداد اور سامراجیت ایسے موٹے موٹے لفظ میری سمجھ سے باہر تھے۔ یہی وجہ تھی کہ حریت پسند گوریلوں کے خفیہ ٹھکانے میں ہر قسم کی سہولت کے باوجود میرا جی وہاں گھبرانے لگا کسی وقت میں اکیلا سمندر کے کنارے نکل جاتا اور حد نگاہ تک پھیلے ہوئے وسیع سمندر کو تکتا رہتا۔ جی میں آتا کسی کشتی میں بیٹھ کر ان جانے گمنام جزیروں کو نکل جاؤں اور پھر کبھی واپس نہ آؤں۔ میں نے جنوبی سمندروں کے بحری ڈاکوؤں کی بڑی کہانیاں پڑھی تھیں اور اس زمانے میں میری بڑی خواہش تھی کہ میں بھی بحری قزاقوں کے کسی جہاز میں بھرتی ہو جاؤں اور ٹارزن کی طرح رسے کو پکڑ کر خنجر دانتوں میں دبائے ایک جہاز سے دوسرے جہاز میں چھلانگ لگاؤں۔ میں نے یہ بھی سن رکھا تھا کہ اگرچہ ان جنوبی سمندروں کو بحری ڈاکوؤں سے پاک کر دیا گیا ہے لیکن کہیں کہیں بحری قزاقوں کے بادبانی جہاز اب بھی دیکھے جاتے ہیں جو سمندری شاہراہوں پر کسی نہ کسی تجارتی جہاز کو لوٹ کر فرار ہو جاتے ہیں۔ میں بحری ڈاکو تو کہاں بنتا مگر مجھے ان ڈاکوؤں کو دیکھنے کا بچپن ہی سے بڑا شوق تھا۔

اس جنگل والے خفیہ ٹھکانے میں کئی گوریلے آتے اور اسلحہ لے کر چلے جاتے۔ گوریلا لڑکی عائشہ بھی گوریلا آپریشن کے سلسلے میں اکثر غائب رہتی تھی۔ انگریزی فوج کا لانس نائیک اللہ داد سے پنجابی ہونے کے ناطے بڑی باتیں ہوا کرتیں۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ ایک سال سے ان انڈونیشی حریت پسندوں کے ساتھ ہے اور اس نے کئی معرکوں میں

حصہ لیا ہے۔ اب وہ زیادہ تر اسی خفیہ اڈے پر ہی رہتا ہے جہاں اسلحے کا بھاری ذخیرہ جمع کر کے رکھا گیا تھا۔ یہ لانس نائیک بڑا پرہیزگار اور عبادت گذار آدمی تھا۔ نماز پڑھنے کے بعد وظیفے کا ورد بھی کرتا تھا۔ وہ کھانا بھی بڑا اچھا بنا لیتا تھا۔ مرطوب موسم ہونے کی وجہ سے چائے وہاں دن بھر چلتی تھی۔ ایک دن میں اس کے ساتھ بانس کے ایک جنگل میں گھوم رہا تھا۔ یہاں سینکڑوں قسم کے استوائی پیڑ پودے اگے ہوئے تھے۔ مجھے بائیں جانب سنبل کے چھ سات بڑے گھنے درخت نظر آئے۔ یہ درخت ساتھ ساتھ قطار میں اگے تھے اور ان کی ٹہنیوں پر سرخ پھول کھل رہے تھے۔ میں ان درختوں کی طرف جانے لگا تو اللہ داد نے مجھے روک دیا۔

"ادھر مت جانا۔ وہاں ایک چڑیل رہتی ہے۔"

میں نے بڑے شوق سے پوچھا۔ "کیا تم نے اس چڑیل کو دیکھا ہے"۔

"ہاں" اللہ داد بولا۔ "میں نے اسے پہلی دفعہ ایک خوبصورت لڑکی کی شکل میں دیکھا تھا جس نے دلہنوں والا لباس پہن رکھا تھا۔

میرے شوق میں زبردست اضافہ ہو گیا۔ مجھے بچپن ہی سے اس قسم کی پر اسرار باتوں سے بڑی دلچسپی رہی ہے میں نے اللہ داد سے کہا۔ "مجھے بتاؤ یہ سب کچھ کیسے ہوا؟"

وہ مجھے واپس اڈے پر لے آیا۔ یہاں اس نے چائے بنائی اور چائے سے بھرا ہوا تام چینی کا مگ ہاتھ میں لے کر کہنے لگا۔ "اس روز موسم بڑا خوشگوار تھا۔ بادل چھائے ہوئے تھے۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ میں یہاں اکیلا تھا۔ نماز پڑھنے کے بعد میں یونہی سیر کرتا اس جنگل میں آ گیا۔ جب سنبل کے درختوں کے پاس پہنچا تو مجھے ایسی آواز آئی جیسے کوئی عورت پاؤں میں جھانجھریں پہنے چل رہی ہو۔ میں نے غور کیا تو یہ آواز سنبل کے درختوں کی طرف سے آ رہی تھی۔ میں سمجھا کہ کوئی دیہاتی عورت ہو گی مگر یہاں کی دیہاتی عورتیں پاؤں میں جھانجھریں خاص خاص موقعوں پر ہی پہنتی ہیں۔ ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ کیا دیکھتا ہوں کہ درختوں کے پیچھے سے ایک نہایت خوبرو لڑکی دلہن بنی سر پر چاندی کا تاج رکھے۔ ہاتھ میں پھولوں کی چھڑی تھامے چھن چھن کرتی نکل آئی

ہے۔ میں اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ ایسی خوبصورت دلہن میں نے زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اچانک اس نے میرا نام لے کر مجھے بلایا۔ خدا جانے وہ کونسی طاقت تھی جو مجھے ایک پل کے لئے کھینچتی ہوئی اس کی طرف لے گئی۔ چار چھ قدم میں چلا ہوں گا کہ ایک دم رک گیا۔ یہ دیکھ کر ایک بار تو مجھے خوف کے مارے پسینہ آ گیا کہ اس خوبصورت دلہن کے دونوں پاؤں الٹے تھے۔ میں نے بچپن میں سن رکھا تھا کہ چڑیلوں کے پاؤں الٹے ہوتے ہیں۔ میں نے فوراً ایک خاص چیز پڑھنی شروع کر دی۔ میں وہیں کھڑے کھڑے منہ میں پڑھ بھی رہا تھا اور لڑکی کی طرف پھونکیں بھی مارتا جا رہا تھا۔ اچانک اس لڑکی کا چہرہ بگڑنے لگا۔ پھر اس کا چہرہ جو بے حد خوبصورت تھا اتنا ڈراؤنا ہو گیا کہ میں بھی ڈر گیا۔ وہ چیخیں مارتی ان درختوں کے پیچھے غائب ہو گئی۔ اب جب کبھی میں اس طرف آتا ہوں تو دل میں وظیفہ پڑھ رہا ہوتا ہوں اور احتیاطاً ان درختوں کی طرف نہیں جاتا۔"

اللہ داد کہانی سنانے کے بعد چائے پینے لگا۔ میری عقل ابھی پختہ نہیں ہوئی تھی۔ مجھے یہ بات بڑی عجیب لگی کہ ایک دلہن بنی خوش شکل عورت پھونک مارنے سے چڑیل بن گئی۔ میں نے اللہ داد سے پوچھا۔ "بھائی جی! آپ کو پھونک نہیں مارنی چاہئے تھی"۔

اللہ داد بولا۔ "مگر وہ عورت کہاں تھی۔ وہ تو چڑیل تھی"۔

میرے منہ سے نکل گیا۔ "کیا پتہ آپ کے پھونک مارنے سے وہ چڑیل بن گئی ہو" اس پر اللہ داد نے مجھے بہت ڈانٹا اور کہا "خبردار ایسی بات پھر نہ کہنا۔ چڑیلیں جنگلوں میں ایسے ہی روپ دھار کر سامنے آیا کرتی ہیں۔ اگر میں پھونک نہ مارتا تو وہ مجھے کھا جاتی۔"

تب میری عمر زیادہ نہیں تھی۔ لاعلمی کا زمانہ تھا۔ مجھے بڑا شوق رہتا تھا کہ کوئی جن بھوت ملے۔ کسی چڑیل سے ملاقات ہو اور میں اسے دیکھوں کہ وہ کیسی ہوتی ہے۔ جب بڑا ہوا۔ ذرا عقل آئی تو کئی چڑیلوں کو دیکھنے کا موقع ملا۔ مگر وہ سب ایسی تھیں کہ جنہیں پھونک مار کر عورتیں بنا دیا گیا تھا۔ کسی چڑیل کو اصلی روپ میں دیکھنے کی حسرت ہی رہی۔ بہر حال میں دن میں کسی وقت لانس نائیک صاحب کی نظر بچا کر جنگل میں نکل جاتا اور سنبل کے درختوں کے آس پاس پھرتا رہتا۔ اس امید میں کہ شاید وہ چڑیل کہیں نظر

آجائے مگر ایسا نہ ہو سکا۔ میرے دل کی دل میں ہی رہی۔ اب میرا دل وہاں سے اچاٹ گیا اور میں سوچنے لگا کہ وہاں سے کسی طرف فرار ہو جاؤں مگر وہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ ہی نہیں تھا۔ میرے لئے یہ ایک ایسی جیل تھی کہ جس کی کوئی دیوار نہیں تھی۔ لیکن وہاں سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ بھی نظر نہیں آتا تھا۔ آخر قسمت نے میرا ساتھ دیا اور ایک موقع مل گیا۔

ایک رات میں ابھی سویا نہیں تھا۔ اس روز کچھ اور چھاپہ مار بھی وہاں آئے ہوئے تھے۔ آسمان پر چاند چمک رہا تھا۔ جنگل میں گہری خاموشی تھی۔ اللہ داد اور دوسرے گوریلے ایک طرف بیٹھے آپس میں کچھ باتیں کر رہے تھے کہ اتنے میں سمندر کی طرف سے کسی لانچ کی وسل کی آواز آئی۔ وہ اٹھ کر اس طرف چلے گئے۔ میں بھی اٹھ بیٹھا اور ان کے پیچھے پیچھے گیا تھوڑی دیر بعد ایک کافی بڑی موٹر لانچ ساحل پر آن لگی۔ یہ لوگ اس میں سے لکڑی کی پیٹیاں اتارنے لگے۔ مجھے بہت جلد معلوم ہو گیا کہ یہ موٹر لانچ وہاں سے دور سمندر میں واقع کسی جزیرے سے ان لوگوں کے لئے اسلحہ لے کر آئی ہے میرے لئے وہاں سے نکل بھاگنے کا یہ ایک سنہری موقع تھا۔ لانچ کے سامنے کی جانب ا[ایک] سا تختہ ڈال دیا گیا تھا جس پر سے اسلحہ کی پیٹیاں اتاری جا رہی تھیں۔ لانچ کے پہلو کی طرف رسے کی ایک سیڑھی بھی لٹک رہی تھی۔ اس طرف چاند کی روشنی نہیں تھی۔ میں چپکے سے سمندر میں اتر گیا اور تیرتا ہوا سیڑھی تک جا پہنچا۔ پھر اس کے ذریعے لانچ کے ڈیک پر پہنچ گیا۔ سب لوگ مال اتارنے میں لگے تھے۔ میں دوڑ کر لانچ کی پچھلی طرف جہاں رسوں کے بڑے بڑے گچھے اور چھ سات پرانے ٹائر پڑے تھے جا کر چھپ گیا۔ جب سارا مال اتار دیا گیا تو لانچ ساحل سے پیچھے ہٹی اور پھر ایک چکر لگا کر سمندر میں اس جزیرے کی طرف چل پڑی جہاں میرے خیال میں میرے لئے آزادی اور ایڈونچر تھا۔



انڈونیشیا میں اتنے چھوٹے چھوٹے جزیرے ہیں کہ آپ انہیں گننا شروع کریں تو تھک جائیں گے۔ ان میں آباد جزیرے بھی ہیں اور غیر آباد بھی۔ کچھ ایسے بھی ہیں جو آتش فشاں پہاڑوں کے پھٹنے سے بن گئے ہیں اور جہاں ہر لمحے کسی نہ کسی آتش فشاں پہاڑ کے پھٹنے کا خطرہ موجود رہتا ہے۔ اس وجہ سے ان جزیروں پر لوگ باقاعدہ گھر بنا کر نہیں رہتے بلکہ ارد گرد کے جزیروں سے ہفتے میں ایک دو بار آتے ہیں اور اپنی پسند کے درخت وغیرہ کاٹ کر لے جاتے ہیں لیکن میں سمگلروں کے سٹیمر یعنی بڑی لانچ کے ذریعے جس جزیرے پر پہنچا وہاں جرائم پیشہ لوگوں کا راج تھا۔ سٹیمر کھلے سمندر میں دو گھنٹے سفر کرنے کے بعد اس جزیرے پر پہنچ گیا۔ ایک تو رات کا وقت تھا۔ میں عرشے پر رسوں اور پرانے ٹائروں میں چھپ کر بیٹھا تھا۔ دوسری بات یہ تھی کہ سٹیمر کے سمگلر گوریلوں کو اسلحہ فروخت کر کے آئے تھے۔ چنانچہ وہ کسی کیبن میں بیٹھے کھانے پینے میں مصروف تھے۔ میں بڑا خوش ہو رہا تھا کہ گوریلا چھاپہ ماروں کی محبت بھری قید سے چھٹکارا ملا۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو وہ کبھی وہاں سے نکلنے کا خطرہ مول نہ لیتا۔ لیکن میری آزاد اور ایڈونچرس طبیعت کا وہاں گذارہ ناممکن تھا اور مجھے یہ خطرہ مول لینا ہی تھا۔ خطرہ بھی کیسا بلکہ میں تو اس خیال سے سمگلروں کے سٹیمر میں سوار ہو گیا تھا کہ شاید کسی جزیرے میں بحری ڈاکوؤں کو دیکھنے کا موقع مل جائے۔ آسمان پر چاند چمک رہا تھا۔ جن لوگوں نے سمندر پر چاند چمکتے دیکھا ہے وہ جانتے ہیں کہ وہ منظر کتنا دلفریب ہوتا ہے۔ سمندر کی موجیں چاند کی کشش کے باعث یوں اوپر اٹھ رہی ہوتی ہیں جیسے چاند سے ملنے کو بے تاب ہوں۔ اس وجہ سے

سٹیمر بھی ڈول رہا تھا۔

اتنے میں دو چھوٹے قد کے ملائی سیلر عرشے پر نمودار ہوئے وہ سٹیمر کے سامنے جانب جہاں سٹیمر کے دونوں پہلو آکر ملتے تھے کھڑے ہو گئے۔ ان میں سے ایک نے ٹارچ کو بار بار جلا کر دور جزیرے کے ساحل پر اپنے خاص سگنل دیئے اور پھر ایک دوسرے سے ہنس ہنس کر باتیں کرتے نیچے چلے گئے۔ میں اپنی جگہ سے نکل کر عرشے کے سامنے جنگلے کے پاس آیا۔ کوئی جزیرہ قریب آرہا تھا جس میں کالے کالے سیاہ پہاڑ ابھرے ہوئے تھے۔ ان کے دامن میں کہیں کہیں روشنی جھلملا رہی تھی۔ یہ ملائی سمگلر بڑے خونخوار قسم کے لوگ ہوتے ہیں اور آدمی کو مار ڈالنا ان کے لئے ایسے ہی ہوتا ہے جیسے ہم مچھر یا مکھی مار ڈالتے ہیں۔ سٹیمر جزیرے سے کچھ دور گہرے پانیوں میں رک گیا۔ یا تو ساحل کے قریب پانی کم گہرا تھا اور یا وہاں پانی کے نیچے نوکیلے پتھروں والی چٹانیں تھیں کہ سٹیمر آگے نہیں گیا تھا۔ کوئی سمگلر ملاح ڈیک پر نہیں آیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ سٹیمر کی دوسری منزل کا بھی ایک گیلری نما ڈیک یعنی عرشہ تھا اور اس عرشے پر سے تختہ ایک بڑی کشتی کے ساتھ لگا دیا گیا تھا جو ساحل سے آئی تھی۔ یہ لوگ کشتی میں بیٹھ کر ساحل کی طرف چلے گئے جو وہاں سے بمشکل ایک فرلانگ کے فاصلے پر تھا۔ جب سٹیمر پر گہری خاموشی چھا گئی تو میں نے اوپر والے ڈیک کے جنگلے سے جھانک کر نیچے دیکھا۔ تختہ نچلے ڈیک کی گیلری میں کھینچ لیا گیا تھا۔ وہاں ضرور کوئی نہ کوئی گارڈ موجود ہو گا۔ اب مجھے اس سٹیمر سے نکل کر جزیرے پر پہنچنا تھا۔ تھوڑی دیر بعد نیچے تھائی میوزک کی آواز آنے لگی۔ شاید گارڈ ڈیوٹی والے نے چھوٹا ٹرانسسٹر لگا دیا تھا۔ میں سٹیمر کی دوسری طرف آکر جائزہ لینے لگا۔ مجھے خیال ہی نہیں آیا تھا کہ ان لوگوں نے سمندر میں لنگر ڈال رکھا ہے۔ لنگر کی موٹی فولادی زنجیر عرشے کے اوپر سے نیچے سمندر کے پانی تک چلی گئی تھی۔ میں زنجیر کے ساتھ لٹک گیا اور آہستہ آہستہ جھولتا ہوا سمندر میں اتر گیا۔ یہاں سے تیرتا ہوا میں کنارے پر آیا اور جھاڑیوں درختوں کے اندھیرے میں ایک طرف چلنے لگا۔ یہاں جاپانیوں کے علاوہ زہریلے سانپوں کا بھی خطرہ تھا۔ مجھ سے جتنی احتیاط ہو سکتی تھی احتیاط کر رہا تھا۔ مجھے جلد معلوم

ہو گیا کہ جزیرہ زیادہ بڑا نہیں ہے اور وہاں صرف ایک ہی اونچی جگہ روشنی جھلملا رہی تھی۔ یہ لوگ اسلحہ کے سمگلر تھے۔ اور یہیں سے گوریلا کمانڈوز کو اسلحہ سپلائی ہوتا تھا۔ یہ گوریلا کمانڈوز وہ اسلحہ جاپانیوں کے خلاف استعمال کرتے تھے۔ ظاہر ہے جاپانی اس جگہ کی تلاش میں ہوں گے کیونکہ انڈونیشیا کے حریت پسند مسلمان ہالینڈ والوں اور انگریزوں کے بعد اب جاپانیوں کا بھی بڑا نقصان کر رہے تھے حالانکہ یہ سارے جزیرے جاپانیوں کے تسلط میں تھے۔ میں اس طرف بڑھا جہاں روشنی ہو رہی تھی۔ یہ روشنی ایک لالٹین کی تھی جو ایک لمبی بارک کے برآمدے میں ستون کے ساتھ لٹکا دی گئی تھی۔ میں نے ان لوگوں کو دیکھا جو سٹیمر پر اسلحہ لے کر آئے تھے۔ یہ لوگ کھانے پینے اور خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ میرا ان لوگوں کے پاس کوئی کام نہیں تھا۔ یہ گوریلا چھاپہ مار نہیں تھے بلکہ اسلحہ سمگل کرنے والے تھے جو مجھے پکڑ کر قید بھی کر سکتے تھے۔ اور مجھے گولی سے بھی اڑا سکتے تھے۔ بہت ممکن تھا کہ یہ گوریلا لڑکی عائشہ اور لانس نائیک اللہ داد کی واقفیت کو بھی خاطر میں نہ لائیں۔ کیونکہ ان کا اسلحہ کا لاکھوں ڈالر کا کاروبار تھا اور وہ یہ گوارا نہیں کر سکتے تھے کہ ان کے سپلائی کیمپ میں کوئی غیر آدمی آئے۔ جزیرے پر کسی دوسری جگہ کوئی روشنی بھی نظر نہیں آرہی تھی کہ جس سے مجھے یہ خیال ہوتا کہ وہاں کچھ اور لوگ بھی رہتے ہیں۔ میرا خیال یہ تھا کہ یہاں وہ لوگ ہوں گے جو بحری ڈاکوؤں کا لوٹا ہوا مال خریدنے کے لئے ایک چور بازار سجاتے ہیں اور ڈاکوؤں سے اونے پونے ان کا قیمتی مال خرید لیتے ہیں۔ پھر بھی میں نے ہمت نہ ہاری۔ اور سمگلروں کی بارک سے ہٹ کر جزیرے کے شمال کی طرف چلنے لگا۔ علاقہ غیر ہموار تھا۔ زمین سخت لاوے کی تھی اور درخت بھی کافی تھے۔ زمین پر گھاس بھی کہیں کہیں بڑی اونچی تھی۔ مجھے سمگلروں کے قہقہوں کی ہلکی ہلکی آواز آرہی تھی۔ چاندنی کی وجہ سے چلنے میں خاص دشواری پیش نہیں آرہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ زمین سے تھوڑی سی اونچی جگہ پر ایک چھوٹا سا جھونپڑی نما کیبن بنا ہوا ہے جس میں اندھیرا ہے۔ میں پچھلی طرف سے ہوتا ہوا۔ کیبن کے برآمدے میں آگیا۔ کیبن کے دونوں دروازے غائب تھے۔ دھندلی چاندنی میں مجھے اندر ایک طرف

لوہے کی جالی دار چارپائی دیوار کے ساتھ کھڑی نظر آئی۔ اس کے سوا وہاں کچھ نہیں تھا۔ کیبن کی چھت کا بڑا سا تختہ ایک طرف سے اکھڑا ہوا تھا جہاں سے ہلکی ہلکی چاندنی اندر آرہی تھی۔ میں نے چارپائی ڈال دی اور یہ سوچ کر اس پر لیٹ گیا کہ اب دن کی روشنی میں ہی پتہ چلے گا کہ اس جزیرے پر سمگلروں کے علاوہ اور لوگ بھی رہتے ہیں کہ نہیں ..... سمندر کی طرف سے مرطوب ہوا کے جھونکے آرہے تھے۔ مجھے نیند آگئی۔ آنکھ اس وقت کھلی جب دھماکوں سے جزیرے کی فضا گونج رہی تھی۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ دھماکے ایسے تھے جیسے کوئی بم برسا رہا ہو۔ مگر کسی ہوائی جہاز کی آواز نہیں تھی۔ میں یہ سمجھا کہ سمگلروں کے اسلحہ کے ڈمپ میں آگ لگ گئی ہے اور ان کا گولہ بارود پھٹ رہا ہے۔ زمین دھماکوں سے ہل رہی تھی۔ جس طرف سمگلروں کی بارک تھی اس طرف سے ہر دھماکے کے ساتھ شعلے سے اٹھتے اور آسمان روشن ہو جاتا تھا۔ میں وہیں چارپائی کے پاس فرش پر بیٹھ گیا بہت جلد مجھ پر اس حقیقت کا انکشاف ہوا کہ دھماکے ایک خاص ترتیب سے ہو رہے ہیں۔ جیسے کسی طرف سے گولے آکر جزیرے میں گر رہے تھے۔ ہر دو سیکنڈ کے بعد ایک گولہ آکر پھٹتا تھا۔ جزیرہ یوں ہل رہا تھا جیسے زلزلہ آرہا ہو۔ تھوڑی دیر بعد وہاں گہری خاموشی چھا گئی۔ میں دھڑکتے دل کے ساتھ ہمہ تن گوش ہو کر وہاں بیٹھا رہا مجھ میں اٹھ کر کیبن سے باہر جانے کی ہمت نہیں تھی۔ بمشکل پانچ منٹ گذرے ہوں گے کہ دو تین سٹیمروں کی آوازیں آئیں اور پھر ان سٹیمروں پر سے جزیرے پر سرچ لائٹوں کی روشنیاں پھینکی جانے لگیں۔ اس کے ساتھ ہی خاص قسم کی اونچی اونچی انسانی آوازیں بلند ہونے لگیں جن کو میں بڑی اچھی طرح سے پہچانتا تھا یہ جاپانی سپاہیوں کی آوازیں تھیں۔ اب ساری بات میری سمجھ میں آگئی تھی جاپانی بحریہ کی کسی یونٹ نے اس جزیرے پر موجود سمگلروں کے اسلحہ ڈپو کو تباہ کرنے کے لئے حملہ کر دیا تھا۔ پہلے چھوٹی توپوں سے وہاں گولہ باری کی اور اب اپنی جنگی کشتیاں لے کر جزیرے پر اتر رہے تھے۔

میں نے سر پکڑ لیا۔ جس مصیبت سے بھاگا تھا اب وہی مصیبت ایک بار پھر میرے سر پر منڈلا رہی تھی۔ بہرحال میں نے اتنی احتیاط ضرور کی کہ اس کیبن سے نکل آیا۔ کیونکہ

سمگلروں کو تلاش کرتے ہوئے جاپانی فوجی اس کیبن تک آسکتے تھے۔ میں پیچھے درختوں میں غائب ہو گیا اور پھر ایک گھنی شاخوں والے درخت میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ جزیرے پر ہ آہستہ دن کی روشنی پھیلنے لگی۔ درخت پر سے میں نے شاخوں کو ہٹا کر دیکھا کہ ل سمندر کے قریب جاپانیوں کی تین جنگی کشتیاں کھڑی تھیں اور جاپانی فوجی ایک رے کو پکارتے ادھر ادھر چل پھر رہے تھے۔ میرا خیال تھا کہ چونکہ جزیرے پر جاپانیوں قبضہ کر لیا ہے سمگلروں کا اسلحہ بھی تباہ کر دیا ہو گا اور سمگلر یا تو سارے کے سارے ے گئے ہوں گے یا گرفتار کر لئے گئے ہوں گے اور اب جاپانی واپس چلے جائیں گے۔ ن ایسا نہ ہوا۔ اس کی بجائے یہ ہوا کہ میرے دیکھتے دیکھتے دو جاپانی جنگی کشتیاں واپس گئیں اور ایک کشتی اور اس کے سپاہی وہیں جزیرے پر ہی رہ گئے۔ اب مجھے افسوس نے لگا کہ میں عائشہ کے گوریلا کیمپ سے کیوں نکلا۔ میں گڑھے سے نکل کر کنوئیں میں گیا تھا۔ جاپانیوں نے جزیرے پر پوسٹیں قائم کر دی تھیں۔ جنگی لانچ میں لگی ہوئی چار پوں کی نالیاں مجھے صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ ڈیک پر بھی جاپانی سپاہی پہرہ دے رہے ے۔ ساحل پر ایک جگہ انہوں نے جاپانی جھنڈا بھی لہرا دیا تھا۔ میں مشکل میں پڑ گیا۔ اب یا کروں؟ سمگلروں کی لانچ مجھے کہیں نظر نہیں آرہی تھی۔ شاید وہ گولہ باری سے ڈوب گئی تھی۔ ان کی بارک میں سے ابھی تک دھواں اٹھ رہا تھا۔ چار جاپانی فوجی ٹائی گنیں ٹھائے اس کیبن کی طرف بھی آگئے جہاں میں نے لوہے کی چارپائی بچھا رکھی تھی۔ پانیوں کو وہاں کچھ نہ ملا تو چارپائی اٹھا کر لے گئے۔ میں کافی دیر سے درخت میں چھپا بیٹھا ک گیا تھا۔ میں نے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ جاپانی فوجیوں کی سرگرمیاں جزیرے پر قبضے کے د اس ساحل تک ہی محدود تھیں جہاں سمندر میں ان کی جنگی کشتی کھڑی تھی اور جہاں وں نے ایک پوسٹ بھی بنا لی تھی۔ ان کا جھنڈا بھی لہرا رہا تھا۔ شاید سمگلروں کی بارک ایک حصہ گولہ باری سے بچ گیا تھا جہاں جاپانیوں نے اپنا کیمپ بنا لیا تھا۔

تب میں درخت سے اتر آیا۔ کیبن کی طرف جانے کی بجائے میں اس کے پیچھے ایک ر جھاڑیوں میں بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہئے۔ میرے سامنے دو ہی

راستے تھے یا تو سمندر میں کود جاؤں اور عقب کی جانب سے سمندر میں تیر کر کر دوسرے جزیرے تک پہنچنے کی کوشش کروں اور یا پھر اسی جزیرے میں بیٹھ کر جاپانی سپاہیوں کی واپسی کا انتظار کروں۔ یعنی وہ کب جزیرے کو خالی کر کے واپس جاتے ہیں۔ پہلی ترکیب پر عمل کرنا اپنے آپ کو سمندری شارک مچھلیوں کے آگے ڈالنے کے برابر تھا۔ مجھے لامحالہ دوسری ترکیب پر ہی عمل کرنا تھا۔ اب سوال یہ تھا کہ میں بغیر پانی اور خوراک کے زندہ کیسے رہوں گا۔ سمندر کا پانی پی نہیں سکتا تھا۔ درختوں کے پتے اور گھاس بھی نہیں کھا سکتا تھا۔ مگر رہنا مجھے اسی جگہ پر تھا۔ دوپہر گذری تو بھوک اور پیاس کے مارے برا حال ہونے لگا۔ بھوک کو تو میں کنٹرول کر سکتا تھا مگر پیاس مجھ سے برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ پھر بھی میں صبر کر کے بیٹھا رہا۔ دوپہر کے بعد میں جھاڑیوں سے اٹھ کر خالی کیبن میں آگیا اونچی جگہ ہونے کی وجہ سے وہاں سے مجھے ساحل سمندر پر کھڑی جاپانیوں کی فوجی لانچ صاف نظر آرہی تھی۔ بارک کی عقبی دیوار بھی تھوڑی سی دکھائی دیتی تھی۔ اس کا آدھا حصہ گولہ باری سے اڑ گیا تھا۔ بھوکا پیاسا بیٹھا رہا۔ تیسرا پہر بھی گذر گیا پھر جزیرے پر شام کا اندھیرا چھانے لگا۔ پیاس کی وجہ سے میری زبان لکڑی کی طرح سخت ہونے لگی تھی میں نے گھاس اور پتوں کو چبا کر ان کی رطوبت سے زبان کو تھوڑی تر دی۔ گھاس اتنی کڑوی تھی کہ میں اسے کھا نہیں سکتا تھا۔ اسی حالت میں بیٹھے بیٹھے جب رات ہو گئی تو میں نے ایک فیصلہ کر لیا۔ یہ فیصلہ بڑا خطرناک تھا لیکن اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا کیونکہ بھوک اور پیاس نے مجھے موت کے کنارے پہنچا دیا تھا۔ جب طرف جزیرے پر خاموشی چھا گئی اور ساحل کی طرف سے آتی جاپانیوں کی آوازیں خاموش ہو گئیں تو میں اپنے کیبن سے نکلا اور درختوں جھاڑیوں کی اوٹ لیتا جاپانیوں کیمپ والی بارک کی طرف چل پڑا۔ بارک کی دیوار والی کھڑکی کا ایک پٹ کھلا تھا۔ آسمان پر بادل چھانے لگے تھے جس کی وجہ سے چاندنی غائب ہو گئی تھی میں نے کھڑکی کے اندر جھانک کر دیکھا۔ یہ بارک کا ایک چھوٹا سا سٹور تھا جہاں لکڑی کے کھوکھوں اور بڑی میز پر بوتلیں اور ڈبے پڑے تھے۔ مجھے ڈبل روٹی کی خوشبو بھی آئی اور میں اندر کود

یہاں مجھے وہ ساری چیزیں مل گئیں جن کی مجھے تلاش تھی۔ میں نے ڈبل روٹی کے پیکٹ، بسکٹ کے ڈبے، آڑو اناس کے جوس کے ٹین اور ٹھنڈے مشروب کی بوتلیں اور سارڈین مچھلی کے ٹن جلدی جلدی ایک تھیلے میں ڈالے اور اسے کھڑکی سے باہر لڑھکا دیا۔ اس کے ساتھ ہی میں خود بھی باہر ڈھلان پر لڑھک گیا۔ جاپانی سپاہی دوسری طرف گارڈ ڈیوٹی پر تھا جس کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ یہاں سٹور سے کوئی چیز چرائی جا سکتی ہے۔ آدھا راستہ تو میں نے رینگ کر طے کیا۔ پھر لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے چلتا واپس اپنے کیبن میں آگیا اور تھیلا کھول کر کھانے کی چیزوں پر ٹوٹ پڑا۔ ایک چاقو ہر وقت میری جیب میں رہا کرتا تھا۔ اس کی مدد سے میں نے کولڈ ڈرنک کے ڈبوں کو کاٹا اور اوپر تلے چار ڈبے پی گیا۔ پھر ڈبل روٹی کے ساتھ سارڈین مچھلی جو ابال کر ڈبوں میں بند کی جاتی تھی کھائی۔ جسم کی توانائی واپس آگئی۔ اب میں زیادہ روشن دماغی سے وہاں سے کسی طرف نکل جانے کی ترکیب پر غور کرنے لگا۔ میں نے باقی کی کھانے پینے کی چیزیں کیبن سے باہر پیچھے کی طرف ایک جھاڑی میں چھپا کر رکھ دیں۔ میں کیبن کی طرف واپس آرہا تھا کہ کسی کے کراہنے کی آواز آئی۔ میں وہیں بیٹھ گیا۔ غور سے سنا یہ کسی عورت کی آواز تھی۔ میں ڈرتے ڈرتے آواز کی طرف گیا کیا دیکھتا ہوں کہ ایک چھوٹے سے گڑھے میں ایک عورت ایسے پڑی ہے جیسے مر چکی ہو یا مر رہی ہو۔ لگتا تھا کہ وہ گڑھے میں گر پڑی ہے۔ میں گڑھے میں اتر گیا۔ عورت انڈونیشی تھی اور اس کی عمر بیس بائیس سال سے زیادہ کی نہیں تھی۔ میں اسے باہر نکالنے کے لئے جھکا تو اس نے اپنی زبان میں پانی مانگا۔ وہاں کی مقامی زبان مجھے آگئی تھی میں بھاگ کر جھاڑیوں کی طرف گیا اور اس کو کولڈ ڈرنک کا ٹن کھول کر پلایا۔ میں نے اردو میں پوچھا۔ "تم کون ہو اور یہاں کیسے آگئی ہو؟

عورت نے کمزور آواز میں جواب دیا "کچھ پتہ نہیں، کچھ معلوم نہیں" اور وہ بے ہوش ہو گئی۔

===== ❑ ❑ =====

میں سمجھا کہ یہ عورت مصیبت زدہ ہے۔ اسے جاپانی کسی جزیرے سے اٹھا کر ساتھ لے آئے ہوں گے۔ موقع پا کر یہ بھاگ نکلی اور اب بھوکی پیاسی ان سے چھپتی پھر رہی ہے ۔ میں نے اپنے تھیلے میں سے کچھ کھانے پینے کی چیزیں ساتھ لیں اس بے ہوش عورت کو اٹھایا اور اپنے ٹوٹے پھوٹے کیبن میں لے آیا۔ تھوڑی دیر میں اسے ہوش آگیا۔ میں نے اسے کچھ کھانے پینے کو دیا۔ تو وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے مجھے اپنا نام سومی بتایا۔ وہ ایک صحت مند خاتون تھی مگر اس کی آنکھوں میں حلقے پڑے ہوئے تھے۔ جو کیبن کے نیم اندھیرے میں مجھے زیادہ گہرے نظر آرہے تھے۔ ایک بات کی وضاحت یہاں میں کرتا چلوں کہ جو لوگ دوسری جنگ عظیم کے دنوں میں یا اس سے پہلے جنوب مشرقی ایشیا کے ان علاقوں میں رہ چکے ہیں انہیں خوب معلوم ہو گا کہ وہاں مقامی زبانیں تو بولی جاتی تھیں مگر دو غیر ملک کے آدمی ایک دوسرے سے ٹوٹی پھوٹی اردو میں بات کرتے تھے جسے ہندوستانی کہا جاتا تھا۔ مثلاً اب جانے کو مانگتا ادھر تم جانے کا نہیں ہے۔ ادھر تم گاڑی کھڑی کرنے کا نہیں ہے۔ پڑھے لکھے گھرانوں کے لوگ اور ان کی عورتیں اس سے اچھی اردو بھی بول لیتی تھیں۔ اس خاتون کا تعلق بھی کسی پڑھے لکھے گھرانے سے تھا جیسا اس نے بعد میں بتایا چنانچہ وہ ذرا بہتر ہندوستانی بول لیتی تھی۔ یہاں ڈچ زبان کو وہی حاصل تھا جو انگریزوں کی حکومت کے زمانے میں ہمارے ہاں تھا۔

اس عورت کا لباس انڈونیشی نہیں تھا۔ اس نے پرانی سی جین اور جیکٹ پہن رکھی تھی ۔ بال گردن تک کٹے ہوئے تھے۔ پاؤں میں ربڑ کے جوتے تھے۔ اس کا نام جو

میں نے بتایا سومی تھا۔ اس کے باپ کا ایک قریبی جزیرے میں جنرل سٹور تھا۔ جاپانی جزیرے میں داخل ہوئے تو انہوں نے وہاں لوٹ مار اور قتل عام شروع کر دیا۔ سومی اس وقت اپنے باپ کے ساتھ سٹور میں ہی تھی۔ جاپانی سپاہی اندر داخل ہوئے۔ انہوں نے سومی کے باپ کو گولی مار دی اور سومی کو اپنے ساتھ لے گئے وہ اس سے پوچھ گچھ کرنا چاہتے تھے۔ پھر وہ اسے اس جزیرے میں لے آئے جہاں وہ گولہ باری کے بعد جان بچا کر نکل میں چھپ گئی اور اب میرے سامنے بیٹھی تھی۔ میں نے سومی سے کہا۔

"جاپانی تو تمہیں سارے جزیرے میں تلاش کریں گے"۔

وہ بولی۔ "اسی لئے میں یہاں سے جتنی جلدی ہو سکے فرار ہو جانا چاہتی ہوں"۔

میں نے کہا۔ "وہ تو میں بھی چاہتا ہوں مگر ہمارے چاروں طرف سمندر ہے ہم یہاں سے فرار کیسے ہو سکتے ہیں"؟

سومی نے کہا۔

"تمہیں شاید پتہ نہیں کہ اس سمندر میں بے شمار چھوٹے چھوٹے جزیرے ہیں۔ یہاں سے بھی بیس پچیس میل کے فاصلے پر ایک ایسا جزیرہ موجود ہے جہاں قبضہ تو جاپان کا ہے مگر جاپانیوں نے وہاں کوئی کیمپ قائم نہیں کیا۔ کیونکہ اس جزیرے میں جرائم پیشہ لوگ رہتے ہیں اور ان کا تال میل علاقے کے بحری ڈاکوؤں سے قائم ہے"۔

بحری ڈاکوؤں کے نام پر میرے کان کھڑے ہو گئے۔ میں نے سومی سے پوچھا کہ ہم اس جزیرے پر کیسے پہنچ سکتے ہیں؟ سومی کہنے لگی۔

"جاپانی اپنے ساتھ کچھ علاقائی ماہی گیر بھی لائے ہیں جن کی چھ سات چھوٹی کشتیاں جزیرے کے جنوبی ساحل پر کھڑی ہیں۔ یہ لوگ دن کے وقت جاپانیوں کے لئے تازہ مچھلیاں پکڑتے ہیں ہم ان کی کوئی ایک کشتی لے کر یہاں سے بھاگ سکتے ہیں۔"

اس وقت سومی کی یہ تجویز بھی بڑی معقول لگی میں نے کہا۔ "میں آج رات ان کا جائزہ لوں گا"۔

وہ کہنے لگی۔ "اگر تم جائزہ لیتے رہ گئے تو جاپانیوں کی گولیاں ہمیں بہت جلد بھون

ڈالیں گی ہمیں ابھی چل کر کشتی اڑا لینی ہو گی تا کہ ہم جزیرے سے نکل جائیں۔"

میں نے ٹن فوڈ کا تھیلا نکالا اور سومی کے ساتھ جزیرے کے جنوبی ساحل کی طرف چلا۔ سومی آگے آگے تھی ہم پھونک پھونک کر قدم رکھ رہے تھے۔ جزیرے کا جنوبی ساحل غروب ہوتے چاند کی دھندلی چاندنی میں دور تک نظر آرہا تھا۔ تھوڑے فاصلے پر کچھ جھونپڑیاں تھیں۔ اور پانچ چھ چھوٹی کشتیاں ساحل کی ریت پر کھڑی تھیں۔ سومی بولی۔

"ایک کشتی کھینچ کر ادھر لے آؤ"۔

میں نے تھیلا وہیں رکھا اور کشتی کی طرف بڑھا یہ بات ہمارے حق میں جاتی تھی کہ وہاں کوئی جاپانی سپاہی گارڈ ڈیوٹی پر موجود نہیں تھا۔ مچھیرے جھونپڑیوں کے اندر سو رہے تھے میں ایک کشتی نکال کر لے آیا۔ ہم اس میں بیٹھ گئے اور کشتی کو ایک طرف چلانے لگے۔ سومی چاند ستاروں کے حساب سے راہ نمائی کر رہی تھی۔ وہ اس جزیرے میں پہلے بھی دو چار مرتبہ جا چکی تھی۔ اصل میں وہاں اس کا ایک رشتے دار رہتا تھا جو بحری ڈاکوؤں سے لوٹ مار کا مال خرید کر پیچھے اپنے ایجنٹوں کو روانہ کر دیتا تھا اس طرح سے اس جزیرے میں مجھے یہ سہولت تھی کہ کچھ دیر ٹکنے کو ایک ٹھکانہ مل سکتا تھا۔ ہماری کشتی کو ایک ڈیڑھ گھنٹے کے بعد چوروں کے جزیرے میں پہنچ گئی۔ وہاں کے لوگوں نے اس جزیرے کا یہی نام رکھا ہوا تھا۔ کیونکہ جب بھی کوئی بحری ڈاکوؤں کا جہاز وہاں آتا تو چور بازار لگتا تھا۔ جزیرے میں دور دور کہیں کہیں دھندلی روشنیاں جھلملا رہی تھیں سومی کو اپنے رشتے دار کے مکان کا پورا علم تھا۔ چنانچہ وہ ایک محفوظ راستے سے مجھے وہاں لے گئی۔ اس کا رشتے دار سو رہا تھا سومی کی آوازیں دینے پر وہ آنکھیں ملتا باہر نکل آیا۔ چھوٹے قد کا گول مٹول سا آدمی تھا جس کے سر کے بال سفید ہو رہے تھے۔ پہلے سومی اور پھر اس کے ساتھ مجھے دیکھ کر وہ حیران ہوا۔ سومی نے اپنی زبان میں اس کے ساتھ تعارف کرایا اور پھر مختصر لفظوں میں اپنے اغواء ہونے اور اپنے والد کے مارے جانے کی کہانی سنائی۔ وہ ہمیں اندر لے گیا۔ یہ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جہاں فرش پر چٹائی بچھی تھی ایک طرف پلنگ تھا ٹیبل لیمپ روشن تھا۔ کھڑکیوں پر جالی دار ریشمی پردے لٹک

اس آدمی کا نام شوانگ تھا۔ سومی کے آنے سے وہ کافی پریشان ہو گیا تھا۔ میری طرف کنکھیوں سے بار بار دیکھ رہا تھا۔ بہرحال رات گذر گئی۔ اگلے دن ناشتے کے بعد وہ سومی سے دیر تک باتیں کرتا رہا۔ میں باہر برآمدے میں چٹائی پر بیٹھا اس کی آواز سنتا رہا۔ باتیں میری سمجھ میں نہیں آرہے تھے۔ بعد میں سومی نے مجھے بتایا کہ اس کا رشتے دار تمہارے بارے میں پریشان ہے کیونکہ میری شکل سے پتہ چل جاتا ہے کہ میں انڈونیشیا کا رہنے والا نہیں ہوں اور اگر کسی جاسوس نے مجھے دیکھ لیا تو وہ جاپانیوں کو خبر کر دے گا اور میرے ساتھ وہ بھی پکڑ لیا جائے گا۔ میں نے سومی سے کہا۔

"مجھے دو چار روز یہاں رہنے کی اجازت لے دو۔ اس کے بعد میں خود ہی کسی طرف چلا جاؤں گا۔"

میرا پروگرام یہ تھا کہ جونہی جزیرے میں کوئی بحری ڈاکوؤں کا جہاز آیا میں وہاں سے نکل کر ان لوگوں میں شامل ہونے کی کوشش کروں گا۔ میں سومی کے اس رشتے دار کے ہاں رہنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ میری خوش قسمتی کہ دوسرے ہی دن بحری قزاقوں کا ایک جہاز وہاں آگیا۔ جہاز جزیرے سے کافی دور کھلے سمندر میں ہی لنگر ڈالے ہوئے تھا۔ قزاق کشتیوں میں مال لاد کر جزیرے پر آئے اور وہاں چور بازار کا کاروبار شروع ہو گیا۔ بحری قزاقوں کے چہرے اکھڑ اور وحشی تھے۔ ان میں جنوب مشرقی ایشیاء کے لوگوں کی تعداد زیادہ تھی۔ کئی ایک کے کانوں میں سونے چاندی کی بالیاں تھیں اور سروں پر رنگدار رومال بندھے تھے۔ کوئی قزاق ایسا نہیں تھا جس کی پیٹی کے ساتھ پستول نہ لٹک رہا ہو۔ وہ لوٹے ہوئے مال کے تھیلے الٹ رہے تھے اس کے عوض غیر ملکی کرنسی وصول کر رہے تھے۔ ان کے آنے سے وہاں ایک شور سا مچ گیا تھا۔ میں نے ساحل کے پاس دو جاپانی سپاہیوں کو بھی دیکھا جو ان قزاقوں سے ایک خاص ٹیکس وصول کر رہے تھے۔ ظاہر ہے ان کی اجازت کے بغیر یہ لوگ جزیرے پر نہیں آسکتے تھے۔ میں ایک ریستوران میں آگیا جہاں کچھ قزاق بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ کافی اور دیگر مشروب پی رہے تھے۔ انہوں نے پستول نکال کر میز پر رکھے ہوئے تھے۔ میں اس فکر میں تھا کہ کسی بحری قزاق سے بات کروں اور وہ مجھے اپنے

عملے میں شامل کرے اور یوں میرے ایک بالکل نئے ایڈونچر کا آغاز ہو۔ مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ اس علاقے میں ایسے جزیرے بھی تھے جہاں اگر کوئی بحری ڈاکو پکڑا جاتا تو لوگ اسے وہیں گولی مار دیتے تھے۔ کیونکہ بہرحال یہ لوگ ڈاکو اور قاتل تھے اور کسی بھی ملک کے قانون کی نظروں میں ان کی سزا موت تھی۔ لیکن یہ لوگ بھی بڑے ہوشیار تھے اور سوائے اس چوروں کے جزیرے کے دوسرے کسی بھی جزیرے کے قریب نہیں پھٹکتے تھے۔ ریستوران میں ان لوگوں کے قہقہوں اور باتوں سے ایک شور سا مچا تھا۔ میں ایک طرف کونے میں چھوٹی سی میز کے پاس بیٹھ گیا اور کافی منگوا کر پینے لگا۔ میری ساتھ والی میز پر ایک چوڑے نتھنوں گھنگھریالے بالوں والا باڈی بلڈر ٹائپ کا قزاق بیٹھا بھنی ہوئی بطخ کھا رہا تھا۔ یہ قزاق جب اٹھ کر جانے لگا تو اس کی پتلون میں سے خدا جانے کیسے ایک بٹوا نکل کر نیچے گر پڑا۔ قزاق کو اس کی خبر نہ ہوئی اور وہ جھومتا جھامتا ریستوران سے نکل گیا۔ میں نے جلدی سے بٹوا اٹھا کر کھولا تو وہ ڈالر اور پاؤنڈ کے نوٹوں سے بھرا ہوا تھا۔ اچانک ایک خیال میرے دماغ میں بجلی کی طرح چمک گیا۔ میں بٹوا لے کر اس قزاق کے پیچھے دوڑ پڑا۔ وہ ریستوران سے ابھی تھوڑی دور ہی گیا تھا۔ میں بھاگ کر اس کے سامنے آگیا اور بٹوا دکھا کر ٹوٹی پھوٹی اردو میں کہا کہ یہ اس کا بٹوا ہے ریستوران میں گر گیا تھا۔ قزاق نے جھپٹ کر بٹوا مجھ سے چھین لیا۔ اسے کھول کر دیکھا پھر بڑی حیرت بھری نظروں سے میری طرف تکنے لگا۔ شاید اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس چوروں کے جزیرے میں ایک ایماندار لڑکا کہاں سے نکل آیا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ میں نے ایمانداری سے نہیں بلکہ حکمت عملی سے کام لیا تھا۔ قدرت نے مجھے ایک موقع مہیا کر دیا تھا اور میں اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ وہ بولا۔ "تم نے یہ بٹوا واپس کیوں کر دیا؟"

میں نے جھوٹ بولتے ہوئے کہا۔ "میں امانت میں خیانت نہیں کرنا چاہتا تھا"۔

وہ قہقہہ لگا کر ہنسا اور میرے کاندھے پر ہاتھ مار کر بولا۔ "یہاں نئے نئے آئے لگتے ہو۔"

تب میں نے اس کے آگے اپنی کہانی ڈال دی اور کہا کہ میں ان لوگوں میں شامل ہو کر کھلے سمندروں کی سیر کرنا چاہتا ہوں۔ اس قزاق نے غور سے مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھا اور پھر اپنی بیلٹ میں سے پستول نکال کر میرے ہاتھ میں تھما دیا اور ایک طرف اشارہ کر کے بولا۔ "وہ جو آدمی سامنے والے کھوکھے میں بیٹھا پیسے گن رہا ہے اس کو گولی مار دو۔ اگر وہ مرگیا تو میں تمہیں اپنے ساتھ جہاز پر لے چلوں گا۔"

مجھے پسینہ آگیا۔ ایک بے گناہ کو میں کیسے گولی مار سکتا تھا۔ میں نے فوراً کہا۔ "میں کھانا بڑا اچھا پکا لیتا ہوں۔ آلو بھی چھیل سکتا ہوں مجھے اپنے ساتھ لے چلو۔ میں ڈیک کی صفائی بھی کر لیتا ہوں۔"

بحری قزاق نے ایک اور قہقہہ لگایا۔ پستول میرے ہاتھ سے لے کر پیٹی میں لگائی اور سگار کو ایک طرف پھینک کر بولا۔ "تم ایماندار ہو مجھے پسند ہو چلو میرے ساتھ"۔

میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا اس نے میرا نام پوچھا میں نے یونہی اپنا نام پرسی بتا دیا۔ اس کا نام لوبو تھا اور وہ جزائر ہوائی کا رہنے والا تھا۔ وہاں کئی قتل کرنے کے بعد بحری ڈاکوؤں میں آن شامل ہوا تھا۔ اس نے مجھے جہاز کے کپتان سے ملایا اور اپنی زبان میں اس کے آگے شاید میری ایمانداری کی تعریف کے ساتھ ساتھ میرے شوق کا اظہار بھی کیا۔ قزاقوں کے جہاز کا کپتان ہاتھی کی طرح گرانڈیل تھا۔ اس کی کمر میں دو پستول لگے تھے۔ گنجان داڑھی اس کے پھولے ہوئے پیٹ تک پھیلی تھی۔ وہ خنجر کی نوک سے اپنا پیالے جتنا بڑا پائپ صاف کر رہا تھا۔ میری طرف لال لال آنکھوں سے دیکھ کر کچھ غرایا۔ پھر لوبو کی طرف دیکھا اور ایک بار پھر غرایا۔ لوبو مجھے لے کر باہر آگیا اور بولا۔ "کپتان نے تمہیں رکھ لیا ہے۔ مگر تم جہاز پر صرف میرے لئے کھانا بنایا کرو گے۔ تنخواہ تمہیں میں دوں گا"۔

مجھے اور کیا چاہئے تھا۔ دوسرے دن سارے بحری قزاق کشتیوں میں سوار ہو کر اپنے جہاز کی طرف چل پڑے۔ ایک کشتی میں میں بھی لوبو کے ساتھ بیٹھا تھا۔ بحری قزاقوں کے ساتھ کھلے سمندروں میں سیاحت کرنے کی میری دیرینہ خواہش پوری ہو رہی تھی۔ اس لئے میں بہت خوش تھا۔ چوروں کے جزیرے سے لنگر اٹھانے کے بعد یہ جہاز دو دن تک خدا جانے کن کن سمندروں میں چکر لگاتا رہا۔ اس جہاز کے انجن کافی پرانے تھے اور جہاز

کی حالت بھی خستہ ہی تھی مگر وہ کام دے رہا تھا۔ تیسرے روز قزاق جہاز پر اچانک ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ لوبو بھی کیبن سے نکل کر ڈیک پر آ گیا۔ میں اس کے ساتھ تھا۔ دور سے ایک جہاز کے مستول نظر آ رہے تھے۔ لوبو کہنے لگا۔ "شکار نظر پڑ گیا ہے۔ تم نیچے کیبن میں ہی رہنا۔ ہم تھوڑی دیر میں حملہ کرنے والے ہیں"۔

اسی وقت جہاز پر انسانی کھوپڑی اور ہڈیوں والا کالا جھنڈا لہرا دیا گیا۔ یہ بحری قزاقوں کے جہاز کا خاص نشان ہوتا تھا۔



ہمارے بحری قزاقوں کے جہاز نے سمندر میں ایک جہاز کو دیکھ لیا تھا اور اس کے ساتھ ہی جہاز پر بحری قزاقوں کا سیاہ جھنڈا لہرا دیا گیا تھا۔ میرے محسن بحری قزاق لوبو نے مجھے کیبن میں رہنے کی ہدایت کی اور خود اوپر چلا گیا۔ مگر میں دیکھنا چاہتا تھا کہ بحری قزاق کس طرح حملہ کرتے ہیں۔ چنانچہ میں کیبن سے کھسک کر عرشے پر آ گیا اور ایک طرف چھپ کر سب کچھ دیکھنے لگا۔ ہمارے جہاز پر چار پرانی مارٹر توپیں بھی تھیں۔ ہمارا جہاز اپنے شکار کے قریب آ گیا تھا۔ تب یکے بعد دیگرے دوسرے جہاز پر مارٹر توپ کے گولے پھینکے گئے۔ گولے اس طرح پھینکے گئے تھے کہ جہاز کے آس پاس سمندر میں گر کر پھٹیں۔ مطلب جہاز کے مسافروں کو خوف زدہ کرنا تھا۔ وہ جہاز زیادہ بڑا نہیں تھا اور اس پر کوئی توپ بھی نہیں لگی تھی۔ قزاق جہاز مزید قریب آ گیا اور پھر ڈاکو للکارتے ہوئے رسوں کی مدد سے دوسرے جہاز پر کودنے لگے۔ ایک قیامت سی برپا ہو گئی جس میں عورتوں کی چیخیں اور بچوں کے رونے کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ مجھے یہ سب کچھ سخت ناگوار لگا۔ میرے دل میں بحری ڈاکوؤں کے ایڈونچر کا جو شوق پیدا ہوا تھا وہ اس ظلم و ستم کو دیکھ کر رفو چکر ہو گیا۔ مجھے ان بحری قزاقوں پر سخت غصہ آنے لگا جو عورتوں اور بچوں پر بھی ظلم کر رہے تھے۔ ڈاکوؤں نے جہاز کو جی بھر کر لوٹا اور سارا سامان اپنے جہاز پر لے آئے۔ میں چھپا بیٹھا یہ سارا دردناک منظر دیکھ رہا تھا۔ میرے دل میں ان ڈاکوؤں کے خلاف بغاوت کے شدید جذبات پیدا ہو گئے تھے۔ ان سنگدل قزاقوں نے لوٹ مار کے علاوہ جہاز پر ضرور کچھ بے گناہ مسافروں کو قتل بھی کیا ہو گا۔

شام کے وقت جب ملاح ڈاکو عرشے پر بیٹھے اپنے حصے کا مال سنبھال رہے تھے میں نے لوبو سے کہا۔ "مجھے یہ سب کچھ اچھا نہیں لگا"۔

لوبو نے میری طرف گردن گھما کر دیکھا اور کوئی جواب نہ دیا۔ اسے لوٹ مار سے اپنا حصہ روپوں کی شکل میں ملا تھا جنہیں وہ گن کر تھیلی میں ڈالتا جا رہا تھا۔ بحری ڈاکوؤں کا جہاز سورج غروب ہو جانے کے بعد شفق کی گہری سرخ ہوتی روشنی میں سمندر میں ایک طرف جا رہا تھا۔ ہوا بڑی تیز تھی اور اس میں سمندری لہروں کی نمی تھی۔ میں رات کو لوبو کے واسطے بلیک کافی کا مگ لے کر آیا تو وہ اپنی برتھ پر لیٹا جیسے کسی گہری سوچ میں گم تھا۔ میں نے اسے پہلے ایسے فلسفیانہ موڈ میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ برتھ سے اتر کر کیبن کے فرش پر بیٹھ گیا اور مجھ سے کافی کا مگ لے لیا۔ میں بھی وہیں بیٹھ گیا۔ کافی کا گھونٹ بھرنے کے بعد لوبو نے میری طرف دیکھا اور بولا۔ "تم کیا سمجھتے ہو کہ میں ان بحری ڈاکوؤں کے ساتھ اپنی خوشی سے رہ رہا ہوں۔ نہیں مجھے بھی یہ لوٹ مار اور ظلم کی زندگی بالکل پسند نہیں۔"

میں نے کہا۔ "تو پھر تم ان کے ساتھ کیوں رہتے ہو"۔ انہیں چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟"

لوبو نے کوئی جواب نہ دیا۔ خاموشی سے کافی پیتا رہا۔ پھر اچانک گردن میری طرف گھماتے ہوئے کہنے لگا۔ "ہمارا جہاز یہاں سے سو میل دور ایک ویران جزیرے کی طرف جا رہا ہے۔ وہاں ہم لوگ دو دن ٹھہریں گے۔ دو دن بعد جب جہاز وہاں سے روانہ ہو گا تو میں اس میں نہیں ہوں گا۔"

"کیا مطلب؟" میں نے تجسس کے ساتھ پوچھا۔

لوبو فیصلہ کن انداز میں بولا۔ "مطلب یہ کہ بحری ڈاکوؤں والی زندگی کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ رہا ہوں"۔

میں نے جلدی سے کہا۔

"میں خود اس جہاز پر نہیں رہنا چاہتا۔ کیا تم مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو گے"۔

لوبو میری طرف دیکھتا رہا۔ پھر بولا۔ "مگر تمہیں تو بحری ڈاکوؤں کے ساتھ رہنے کا بڑا ں تھا۔"

میں نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔

"وہ میری حماقت تھی۔ یہ لوگ مجرم ہیں قتل کرتے ہیں۔ لوگوں کو لوٹتے ہیں۔ یہ رحم اور سنگدل ہیں میں نے توبہ کر لی ہے۔ تم مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو۔ میں اری خدمت کیا کروں گا۔"

لوبو بولا۔ "میں اس کا جواب جزیرے پر پہنچ کر دوں گا۔ اتنی دیر تم اپنے فیصلے پر ی طرح غور کر لو"۔

غور کیا کرنا تھا۔ فیصلہ میں نے کر لیا تھا مجھے بحری ڈاکوؤں سے نفرت ہو گئی تھی۔ ان ظلم دیکھ کر۔ ان کی سنگدلی دیکھ کر۔ ساری رات جہاز سمندر میں سفر کرتا رہا۔ سرے دن سمندر میں ایک جزیرے کا دھبہ سا نظر آنے لگا۔ یہ ایک ویران جزیرہ تھا مگر اں میٹھے پانی کے چشمے تھے۔ جہاز کو یہاں سے پانی ذخیرہ کرنا تھا۔ سارے ڈاکو جہاز سے اتر ر جزیرے میں آرام کرنے لگے دوپہر تک میں عرشے کی صفائی میں لگا رہا۔ پھر کچن میں گیا یہاں لوبو مل گیا۔ اس نے مجھے آہستہ سے کہا۔

"کیا اب بھی اپنے فیصلے پر قائم ہو پرس؟"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ مسکرا کر کچن سے باہر چلا گیا۔ دوسرا دن بھی گذر گیا۔

رات کے وقت لوبو مجھے ایک طرف لے گیا اور کہنے لگا "اب بولو کیا کہتے ہو؟"

میں نے اس کی منت کی کہ کسی طرح مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلے۔ میں ان وحشی قزاقوں کے جہاز پر ایک دن بھی نہیں رہ سکتا۔"

لوبو نے ایک چشمے کی طرف اشارہ کیا جہاں زنگ آلود پتھروں کے درمیان سے شفاف پانی کی لکیر بہہ رہی تھی۔

"جہاز منہ اندھیرے جزیرے کو چھوڑ دے گا۔ اب تم جہاز پر مت جانا۔ اسی جنگل ں کسی جگہ باقی کی رات گذار دو۔ صبح جب جہاز لنگر اٹھا کر یہاں سے روانہ ہو جائے گا تو

میں تمہیں اسی چشمے کے پاس آکر ملوں گا۔ خبردار کسی سے کوئی بات نہ کرنا۔"

لوبو جہاز کی طرف چلا گیا۔ میں نے سمندر میں کھڑے بحری ڈاکوؤں کے جہاز کی جھلملاتی روشنیوں کو دیکھا اور دل میں کہا۔ اب کبھی تم پر سوار نہیں ہوں گا۔ یہ کہہ کر میں چشمے کی طرف جو درخت تھے ادھر نکل گیا۔ کسی نہ کسی طرح میں نے وہاں درختوں میں رات گذار دی۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ لوبو کہاں تھا اور کیا کر رہا تھا۔ میں کچھ وقت کے لئے سو بھی گیا تھا۔ جب آنکھ کھلی تو آسمان پر صبح کاذب کی نیلی نیلی روشنی پھیل رہی تھی۔ پھر جہاز کے انجن کی آواز آنے لگی۔ میں دوڑ کر ایک درخت کی اوٹ میں آگیا۔ بحری ڈاکوؤں کا جہاز آہستہ آہستہ جزیرے سے دور ہٹ رہا تھا۔ مجھے ایسے لگا میں اس غیر آباد جزیرے پر اکیلا رہ گیا ہوں۔ مگر دوسرے ہی لمحے مجھے لوبو اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ اس نے کاندھے پر پلاسٹک کا ایک تھیلا اٹھا رکھا تھا۔ وہ میرے پاس آکر رک گیا۔ تھیلے میں وہ میرے لئے کچھ کھانے پینے کی چیزیں لایا تھا۔ میں نے جزیرے کی ویرانی پر ایک نظر ڈالتے ہوئے اس سے پوچھا کہ اب ہم اس جزیرے سے کیسے نکلیں گے۔ بولا۔ "اس کا بھی سارا بندوبست ہو گیا ہے۔ تم یہ جلدی سے کھاؤ اور میرے ساتھ چلو۔" وہ مجھے جزیرے کے جنوبی ساحل کی طرف لے گیا۔ یہاں سمندر کا پانی ایک چھوٹی کھاڑی کی شکل میں جزیرے کے اندر تک آگیا تھا۔ کنارے کنارے بھورے پتھروں کی چٹانیں تھیں۔ یہاں ایک جگہ اس نے جھاڑیوں کو ادھر ادھر ہٹایا تو مجھے وہاں ایک چھوٹی سی کشتی دکھائی دی۔ لوبو ہنسا "یہ کشتی ہم لوگوں نے اس لئے چھپا رکھی تھی کہ کبھی کسی ہنگامی حالت میں اس کی ضرورت پڑ جائے۔" میرے پوچھنے پر کہ ہم یہاں سے کدھر جائیں گے لوبو نے کہا۔ "یہاں سے مشرق کی طرف آسٹریلیا کا ملک ہے مگر ادھر جنگ ہو رہی ہے۔ ہم ادھر نہیں جا سکتے۔ جنوب کی طرف اتنا بڑا سمندر ہے کہ ہم زندہ نہیں پہنچ سکتے۔ مجھے ایک راستے کا پتہ ہے۔ یہ راستہ یہاں سے شمال کی جانب جزیروں کی آبنائے سے گذر کر مغرب کی طرف پوڈانگ کو جاتا ہے جہاں بڑے گھنے جنگل ہیں۔ ان جنگلوں میں ایک دریا بہتا ہے اس دریا کے کنارے تین کالی چٹانیں ساتھ ساتھ زمین سے باہر نکلی ہوئی ہیں۔ وہاں کچھ جنگلی قبیلے آباد ہیں۔ اسی جگہ ایک سپیرن عورت رہتی ہے۔ وہ میری منہ بولی ماں ہے۔ اس کے پاس میں نے اپنی کچھ دولت ہیروں کی شکل میں جمع کرا رکھی ہے۔ میں وہ اس سے واپس لے لوں گا اور لنکا میں جا کر نئی زندگی شروع کروں گا۔ میں نے پوچھا۔ "وہاں سے لنکا ہم کس طرح جائیں گے۔ سارے علاقے پر تو جاپانیوں کا قبضہ ہے اور لنکا تک جو سمندر ہے وہاں جاپانی جنگی جہاز گشت کر رہے ہوں گے۔"

لوبو کہنے لگا۔ "وہ سپیرن عورت سارا انتظام کر دے گی۔ اس کے پاس علاقے کے لٹیرے سمگلر آتے رہتے ہیں اور وہ ان سے اپنی کمیشن بھی وصول کرتی ہے۔"

میں نے کہا "مگر وہ وہاں کیا کرتی ہے؟" لوبو نے کہا۔ "اس کی ساری زندگی اس جنگل میں گذری ہے۔ جنگلی قبیلے کے لوگ بھی اس کی بڑی عزت کرتے ہیں۔ اسے سانپ پالنے کا شوق ہے۔ جنگلی لوگ اس سے اس لئے بھی ڈرتے ہیں کہ کہیں وہ کسی سانپ کو بھیج کر انہیں ہلاک نہ کروا دے۔" لوبو نے بڑے لمبے اور خطرناک سفر کا منصوبہ سامنے رکھ دیا تھا۔ اب میں پچھتانے لگا کہ میں کیوں بحری قزاقوں کے جہاز پر سوار ہو گیا۔ مگر اب پچھتانے سے کچھ نہیں ہو سکتا ہے۔ اس لئے کہا گیا ہے کہ آدمی کو کوئی بھی قدم اٹھانے سے پہلے اچھی طرح سوچ سمجھ لینا چاہئے۔ مگر وہ میرے جذبات کا زمانہ تھا جذبات کی اپنی کشش اپنی ایک جنت ہوتی ہے۔ میرا عزم جوان تھا۔ کھلے سمندروں میں سفر کرنے کا جذبہ بھی تھا۔ کبھی کبھی میرا دماغ مجھے آنے والے خطروں سے ڈراتا مگر میرے جذبات اس پر غالب آجاتے۔ ہم کشتی جھاڑیوں سے نکال کر کھاڑی کے پانی میں لے آئے۔ لوبو اس ویران جزیرے میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ہم نے کچھ تازہ ناریل کشتی میں رکھ لئے۔ لوبو کے تھیلے میں تین دن کی خشک خوراک اور پانی سے بھرا ہوا ایک پلاسٹک کا تھیلا بھی تھا۔ اگرچہ لوبو کے حساب کے مطابق موسم ٹھیک رہنے کی صورت میں ہمیں تیسرے دن پوڈانگ کے ساحل پر جا لگنا تھا۔ یہ سب کچھ اندازے سے ہی ہو رہا تھا۔ مگر لوبو کو سمندری سفر کا بڑا تجربہ تھا۔ میرے سامنے اب ایک ہی منزل تھی کہ لوبو کے منصوبے کے مطابق لنکا پہنچ جاؤں اور وہاں سے پنجاب کی طرف نکل جانے کی کوشش کروں کیونکہ یہ

علاقہ ابھی انگریزوں کے پاس ہی تھا۔ مشکل صرف یہ تھی کہ پوڈانگ سے لنکا کے ساح
تک پہنچنے کے لئے ہم جاپانیوں کے سمندری دفاع سے نکلنے میں کیسے کامیاب ہوں گے۔
بہرحال یہ مسئلہ پوڈانگ پہنچنے کے بعد شروع ہوتا تھا۔ ہم دونوں کشتی میں سوار ہو گئے۔
لوبو چپو چلانے لگا۔ وہ کشتی کو بڑی مہارت سے چلاتا کھاڑی سے نکال کر سمندر میں لے
آیا۔ میں کچھ گھبرا بھی رہا تھا کہ کھلے سمندر میں یہ کشتی کب تک چلے گی۔ جب میں نے
لوبو سے اپنی تشویش کا اظہار کیا تو وہ کہنے لگا۔

"ہم کھلے سمندر میں نہیں جائیں گے۔ بلکہ ہم اس علاقے میں بکھرے ہوئے
چھوٹے چھوٹے ان گنت جزیروں کے درمیانی پانیوں میں سفر کریں گے۔ میں اس سمن
سے واقف ہوں۔ اگر راستے میں کوئی طوفان آ گیا تو میں بڑی آسانی سے کشتی کو کسی
قریبی جزیرے میں لے جا سکتا ہوں۔"

ہمارا سفر شروع ہو گیا۔ یہ بڑا تکلیف دہ سفر تھا۔ طوفان تو راستے میں کوئی نہ آیا مگر
اپنی باری پر چپو چلاتے چلاتے میرے ہاتھوں میں چھالے پڑ گئے۔ رات کے وقت تجربہ کا
ملاح لوبو نے کشتی کو ایک تیز رفتار سمندری لہر پر ڈال دیا اور کشتی اپنے آپ ساری رات
اور دوسرا سارا دن سفر کرتی رہی۔ دوسری رات بھی گزر گئی۔ اس دوران ہمیں دائیں
بائیں کسی نہ کسی جزیرے کی پہاڑیوں کے رقبے کسی وقت دکھائی دے جاتے تھے۔ اگ
روز دوپہر کے بعد ہماری کشتی پوڈانگ کی کھاڑی میں داخل ہو گئی۔ یہاں اتنے گ
درخت تھے کہ ان کے درمیان ساحل پر دور تک اندھیرا چھا رہا تھا۔ لوبو بڑی احتیاط
کشتی چلاتا کنارے کی طرف آ گیا۔ یہاں ایک جگہ اس نے کشتی روک دی۔ ہم کشتی
اتر کر گیلی ریت پر لیٹ گئے۔ جب جسم میں خون پوری طرح سے دوبارہ گردش کرنے لگا
لوبو کہنے لگا۔ "سپیرن کا جھونپڑا اسی جنگل میں کافی آگے جا کر ہے۔ ہمیں اب ایک ا
جنگل میں سے پیدل گزرنا ہو گا جہاں ایک وحشی جنگلی قبیلے کی حکومت ہے۔ یہ جنگلی
خور تو نہیں ہیں مگر انہیں انسانی کھوپڑیاں جمع کرنے کا بڑا شوق ہے۔ یہ لوگ مسافروں
اچانک حملہ کر دیتے ہیں اور ان کی گردنیں اڑا دیتے ہیں۔ یہ انسانی کھوپڑیوں کے شا

ہیں۔ اگرچہ وہ میری منہ بولی ماں سپیرن سے ڈرتے ہیں مگر جب تک ہم سپیرن کی
جھونپڑی میں نہیں پہنچتے ہمیں ان جنگلیوں کی طرف سے خطرہ ہے۔" لوبو نے پستول ہاتھ میں
لے لیا تھا۔ اس نے خنجر مجھے دے دیا۔ اور اس دہشت ناک جنگل میں ہمارا خطرناک سفر
شروع ہو گیا۔



یہ جنگل بھی اپنی طرز کا ایک انوکھا جنگل تھا۔ کہیں درخت اتنے گھنے ہو جا
میرے بحری قزاق ساتھی لوبو کو بھی سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا پڑتا حالانکہ وہ ادھر سے کئی
گذر چکا تھا۔ اور کبھی چھوٹی چھوٹی سیاہ چٹانوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ کبھی دلدلیں
آجاتے جن میں سبز رنگ کی دلدل جیسے سانس لے رہی ہوتی۔ لوبو کہنے لگا "ان دل
نے کئی ہاتھی کئی بھولے بھٹکے مسافروں کو نگلا ہے۔ ایک بار آدمی ان میں گر پڑے
اس کا بچنا ناممکن ہے۔ دلدل اسے آن کی آن میں نیچے کھینچ لیتی ہے۔"

ہم ایک ایسی پگڈنڈی سے گذر رہے تھے جو لوبو نے ڈھونڈھ نکالی تھی۔ خدا خدا
کے ان خطرناک آدم خور دلدلوں کا سلسلہ ختم ہوا تو پھر وہی کالے کالے درختوں کا
شروع ہو گیا۔ ان درختوں کی شاخیں زمین پر اگی ہوئی لمبی گھاس سے گلے مل رہی تھیں
یہاں ایک درخت پر بہت بڑا اژدہا لٹک رہا تھا۔ میں نے لوبو سے کہا اسے گولی مار
کہنے لگا۔ "یہ تمہیں کچھ نہیں کہے گا۔ صرف اس کے قریب سے گذرتے ہوئے سانس
تھوڑی دیر کے لئے روک لینا۔ کیونکہ اگر تم نے سانس لیا تو یہ تمہیں وہیں جھپٹ
جائے گا۔"

میں نے سبز و سیاہ رنگ کا اژدہا سے چار قدم پہلے سانس روک لی اور اس کے
دس قدموں تک سانس کو روکے رکھا۔ ابھی تک ہمیں کھوپڑیوں کا شکار کرنے والی
میں سے کوئی نہیں ملا تھا۔ لوبو ان کے لئے ہر آن چوکس تھا اور اپنی پیلے رنگ کی
آنکھوں سے ادھر ادھر دیکھ لیتا تھا۔ چلتے چلتے شام ہو گئی۔ خود رو جنگلی جھاڑیوں اور
اونچی گھاس کی وجہ سے ہم زیادہ تیز نہیں چل سکتے تھے۔ لوبو کہنے لگا۔

"ہمیں یہیں کسی جگہ رات گذارنی ہو گی"۔
میں نے سنسان جنگل کی بھیانک خاموشی سے گھبرا کر کہا۔
"اگر رات کو سوتے میں کھوپڑیوں کے شکاری یا کوئی شیر چیتا آگیا تو کیا ہو گا؟"
لوبو ہنس کر بولا۔
فکر نہ کرو رات کے پہلے حصے میں تم پہرہ دینا۔ اس کے بعد میں پہرہ دوں گا اور یہ شیر
رات کے دوسرے حصے میں ہی شکار کے لئے نکلتے ہیں۔ اور پھر ہم کسی محفوظ جگہ پر
بنائیں گے"۔
محفوظ جگہ یہ تھی کہ لوبو نے ایک چٹان کے اندر بنی ہوئی قدرتی غار کو منتخب کر لیا۔
ار کوئی چھ سات فٹ کے گھیرے میں پھیلا تھا اور اس کے منہ کے آگے جنگلی جھاڑیوں
پردہ سا ڈال رکھا تھا۔ وہ غار میں گھستے ہی زمین پر لیٹ گیا اور بولا۔ "باہر پہرہ دو آدھی
کے وقت مجھے جگا دینا۔ پھر میں پہرہ دوں گا"۔
میں پستول ہاتھ میں لے کر غار کے دہانے پر ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا۔
لوبو ایک بے فکر نیم جنگلی قسم کا آدمی تھا جس کی زندگی کا زیادہ حصہ بحری ڈاکوؤں
کے ساتھ غارت گری کرتے گذرا تھا۔ وہ لیٹتے ہی سو گیا اور اس کے ہلکے ہلکے خراٹوں کی
آنے لگی۔ اگرچہ یہ میری نوجوانی اور خوش فکری کا زمانہ تھا مگر میری پرورش شہری
میں ہوئی تھی جہاں آدمی فکر فاقے کے جنجال میں الجھا رہتا ہے جہاں سونے سے پہلے
کو نیند آور گولیاں کھانی پڑتی ہیں۔ جہاں نیند کے پاؤں پڑ کر اسے اپنے بستر تک لایا
ہے۔ اس کے علاوہ مجھے کھوپڑی اڑا کر لے جانے والے جنگلیوں کا زیادہ خوف لگا ہوا
کیونکہ لوبو نے کہا تھا کہ وہ پیچھے سے آکر اچانک حملہ کر دیتے ہیں اور آدمی کو اس
پتہ چلتا ہے جب اس کی کٹی ہوئی گردن زمین پر پڑی ہوتی ہے۔ اس وجہ سے میں
دیوار کے ساتھ لگ کر پہرہ دے رہا تھا۔ وہاں کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ رات کتنی
گذر چکی ہے کسی وقت تو مجھے لگتا کہ رات ایک جگہ رکی ہوئی ہے اور اب کبھی دن نہیں
نکلے گا۔ مچھر مجھے بہت تنگ کر رہے تھے۔ ان کی وجہ سے بھی میری نیند غائب ہو گئی

تھی۔ خدا جانے اس وقت رات کا کیا بجا ہو گا کہ بگری قزاق لوبو کی آنکھ کھل گئی۔ وہ
کر غار کے باہر آگیا اور نیند بھری آواز میں بولا۔ "جاؤ اب تم جا کر سو جاؤ۔ باقی رات
پہرہ دوں گا"

میں زمین پر لیٹ گیا۔ آنکھیں نیند سے بھری ہوئی تھیں۔ میں سو گیا مجھے سو
خیال ہے زیادہ وقت نہیں گذرا ہو گا کہ لوبو نے مجھے جھنجھوڑ کر جگا دیا اور بولا۔

"جلدی یہاں سے نکل چلو۔ مجھے کچھ گڑبڑ لگتی ہے۔"

میں اس کے ساتھ غار سے باہر نکل آیا۔ لوبو فضا میں کچھ سونگھتا ہوا جھاڑیوں
جھک کر چل رہا تھا۔ پھر اس نے ایک درخت کی طرف اشارہ کیا۔ وہ مجھے درخت
چڑھنے کے لئے کہہ رہا تھا۔ میں درخت پر چڑھا تو وہ بھی تیزی سے درخت پر چڑھ آیا
ہم زمین سے کوئی پندرہ بیس فٹ کی اونچائی پر گھنے درخت کی شاخوں میں چھپ گئے۔
میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ لوبو نے فضا میں کونسا خطرہ محسوس کیا تھا۔ میں کچھ پوچھنے
تو اس نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ کر مجھے خاموش کر دیا۔

عین اس وقت ایسی آواز آئی جیسے کچھ لوگ جھاڑیوں میں سے گذرتے چلے آ
ہیں۔ دوسرے لمحے اندھیرے میں مجھے چار پانچ آدمیوں کے سائے دکھائی دیئے۔ ان
ہاتھوں میں تیر کمان تھے۔ وہ جھک کر اس غار کی طرف بڑھ رہے تھے جہاں تھوڑی دیر
ہم پناہ لئے ہوئے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ یہ وہی جنگلی ہیں جو آدمیوں کے سر اتار کر
جاتے ہیں۔ خوف کی ایک سرد لہر میرے جسم میں دوڑ گئی۔ یہ جنگلی حملہ کرنے کے
میں آگے بڑھ رہے تھے۔ ان میں سے دو آدمی غار میں داخل ہو گئے۔ فوراً ہی باہر
اور ایک نے اپنی زبان میں کچھ کہا۔ باقی کے جنگلی ادھر ادھر تکنے لگے شاید انہیں
تلاش تھی۔ لوبو نے پستول کی نالی کا رخ شاخوں میں نکال کر ان کی طرف کر دیا۔ لوبو
سے زیادہ ایک دو کو ہلاک کر سکتا تھا لیکن اتنی دیر میں ان کے تیروں کی بوچھاڑ ہمیں
کر سکتی تھی۔ میں لوبو کو منع کرنا چاہتا تھا۔ مگر میں بول نہیں سکتا تھا۔ میں نے اس کا
والا ہاتھ پیچھے کھینچنے کی کوشش کی تو اس نے میرے ہاتھ کو جھٹک دیا۔ ایسا کرنے سے

میں ہلکی سی آواز پیدا ہوئی۔ جنگلیوں میں سے ایک نے کنارے درخت کی طرف دیکھا۔
ہماری زندگی ابھی باقی تھی۔ عین اس وقت نہ جانے درخت کی کونسی شاخ میں سے ایک
پرندہ پھڑپھڑا کر اڑ گیا۔ جنگلی یہی سمجھا کہ یہ پرندے کی آہٹ تھی۔ وہ لوگ ہمارے
درخت کے نیچے سے گذرتے ہوئے جنگل کے اندھیرے میں گم ہو گئے۔ انہیں گئے جب
کافی دیر ہو گئی تو لوبو نے آہستہ سے کہا۔

"نیچے اترتے ہیں"۔

ہم ایک بار پھر اسی غار میں آ گئے۔ لوبو کا خیال تھا کہ جنگلی اب اس طرف نہیں
آئیں گے اور ایسا ہی ہوا۔ جب دن کی روشنی جنگل میں چاروں طرف پھیل گئی تو وہ بگری
قزاق جنگل کے محفوظ راستوں سے ہوتا ہوا اپنی منہ بولی ماں سپیرن کے ڈیرے کی طرف
چل پڑا۔ مجھے قدم قدم پر یہی ڈر لگا رہا کہ ابھی کسی نہ کسی طرف سے جنگلی لوگ نکل کر
ہم پر حملہ کر دیں گے۔ مگر لوبو قزاق بڑے اطمینان سے چل رہا تھا۔ جیسے اسے یقین ہو کہ
جنگلی اس طرف نہیں آ سکتے۔ ہم ایک چھوٹی سی ندی کے کنارے آ گئے۔ یہ ندی اصل
میں سمندر کا پانی ہی تھا جو کھاڑی سے ندی کی شکل میں نکل کر جنگل میں آ گیا تھا۔ اس
ندی کے کنارے میں نے سرخ اور زرد رنگ کے عجیب و غریب پھول کھلے ہوئے دیکھے۔
ندی پیچھے رہ گئی۔ ہم ایک بہت زیادہ گنجان جنگل میں آ گئے تھے۔ بگری قزاق ایک جگہ
رک گیا۔ اس نے ایک طرف اشارہ کر کے مجھے ساتھ ساتھ کھڑی تین چٹانیں دکھائیں۔
کہنے لگا "ہم سپیرن ماں کے ڈیرے پر پہنچ گئے ہیں۔"

بڑے ہی دشوار گذار راستوں سے ہوتے ہوئے ہم آخر ایک جھونپڑے کے پاس
پہنچ گئے۔ جھونپڑے کا بانس کا دروازہ کھلا تھا۔ باہر مٹی کے دو مٹکے پڑے تھے۔ دن کی
روشنی میں مجھے جھونپڑے کے کھلے دروازے میں سے کچھ پٹاریاں رکھی نظر آ رہی تھیں۔
یقیناً ان پٹاریوں میں سانپ تھے۔ سپیرن نظر نہیں آ رہی تھی۔ میرا ساتھی قزاق جھونپڑی
کے باہر ایک طرف بیٹھ گیا اور بولا۔ "وہ یہیں کہیں ہو گی۔ ابھی آ جائے گی"۔

اتنے میں ایک کالی سیاہ فام پختہ عمر کی عورت درختوں کے درمیان سے نکل کر ہماری

طرف آئی۔ اس نے گیروے رنگ کی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ بال شانوں پر کھلے تھے آنکھیں شنگرف کی طرح چمک رہی تھیں۔ سب سے خوفناک بات یہ تھی کہ اس کے گلے میں تین چار سانپ پڑے تھے جن میں ایک سانپ نے اپنا پھن اٹھا رکھا تھا۔ قزاق لوبو کو دیکھ کر وہ عورت بہت خوش ہوئی۔ پھر میری طرف دیکھا اور پوچھا کہ یہ کون ہے قزاق نے میرا مختصر سا تعارف کرایا۔ وہ عورت ہمیں وہیں بیٹھے رہنے کا اشارہ کر کے جھونپڑی کے اندر چلی گئی۔ پھر اندر سے کچھ کیلے اور ناریل لا کر ہمیں کھانے کو دیئے۔ وہ ہمارے سامنے بیٹھ گئی۔ اب ایک سبز رنگ کا سانپ اس کے ہاتھ میں تھا جس سے وہ بچوں کی طرح کھیل رہی تھی۔ سانپ کے منہ سے کسی کسی وقت پھنکار کی ہلکی سی آواز نکل جاتی تھی۔ مجھے وہاں بڑا خوف محسوس ہونے لگا تھا اور میں چاہتا تھا کہ جتنی جلدی ہو سکے اس بھیانک سپیرن سے رخصت ہو جاؤں مگر میرے ساتھی قزاق نے ابھی اس سے اپنے ہیروں کی امانت واپس لینی تھی۔ آخر اس نے سپیرن سے ہیروں کی بات کر دی اور کہا کہ میں نے بحری ڈاکوؤں کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیا ہے اور اب لنکا جا کر شریف لوگوں کی طرح زندگی بسر کرنا چاہتا ہوں۔ سپیرن کی شنگرفی رنگ کی آنکھیں لوبو کے چہرے پر جمی تھیں مجھے لگ رہا تھا کہ یہ عورت ہیرے واپس کرنے کا ارادہ نہیں رکھتی۔ لیکن میرا اندازہ غلط نکلا۔ وہ اٹھ کر جھونپڑی کے اندر گئی اور جب واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں چمڑے کی ایک تھیلی تھی تھیلی سپیرن نے قزاق کے حوالے کی اور کہا۔ "گن کر پورے کر لو تمہارے ہیرے جواہرات بالکل ویسے کے ویسے ہیں"۔

قزاق نے تھیلی کھول کر غور سے دیکھا اور مسکرا کر کہنے لگا۔ "ماں! مجھے تم پر اعتبار نہیں ہو گا تو اور کس پر ہو گا؟" اس کے بعد سپیرن نے خبردار کیا کہ پوڈانگ سے لنکا تک کا آدھا سمندر جاپانیوں کے قبضے میں ہے۔ تم ان کے درمیان سے کیسے نکلو گے؟ قزاق لوبو نے کہا۔ "میں اس کا انتظام کر لوں گا پوڈانگ میں میرے کچھ دوست ہیں جو مجھے سمندری سرحد پار کرا دیں گے"۔

وہ رات ہم نے وہیں کاٹی۔ میں تو رات بھر جاگتا رہا۔ اس ڈر نے سونے نہ دیا کہ

کہیں کسی پٹاری سے کوئی سانپ نکل کر مجھ پر حملہ نہ کر دے۔ دوسرے دن ہم جانے لگے تو سپیرن نے قزاق سے کہا۔

"بیٹا! تمہارے پاس ہیرے ہیں راستہ خطرناک اور طویل ہے ہو سکتا ہے راستے میں ڈاکو مل جائیں۔ میں تمہاری حفاظت کے لئے تمہارے پیچھے اپنے دو سانپ روانہ کر دوں گی۔ وہ پوڈانگ تک تمہاری حفاظت کریں گے"۔ اس کے بعد سپیرن نے پٹاری میں سے دو سانپ باہر نکالے۔ دونوں سانپ سیاہ رنگ کے تھے۔ آنکھیں سرخ تھیں اور چار چار فٹ لمبے تھے۔ سپیرن قزاق کی طرف بڑھی اور دونوں سانپوں کو قزاق کی گردن میں ایک بار پھیر دیا اس کے بعد میری طرف آئی تو میں ڈر کر پیچھے ہٹ گیا۔ سپیرن ہنس کر بولی۔ "یہ میرے بیٹے سانپ ہیں۔ تمہیں کچھ نہیں کہیں گے یہ صرف تمہارے جسم کی خاص خوشبو سونگھنا چاہتے ہیں۔ اس طرح سے انہیں جنگل میں تمہارا پیچھا کرنے میں آسانی ہو گی"۔

قزاق لوبو نے بھی مجھے حوصلہ دیا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ سپیرن نے میری گردن میں دونوں سانپوں کو لپیٹ دیا۔ میں نے سانس روک لیا۔ مجھے یوں لگا جیسے کسی نے میری گردن میں پھانسی کا پھندا ڈال دیا ہے۔ خدا خدا کر کے سانپوں نے میرے گلے کا ایک چکر پورا کیا اور سپیرن نے انہیں پرے ہٹا لیا۔ میری جان میں جان آئی۔ سپیرن کہنے لگی۔ "میرے بچو' میرے سانپوں نے تمہارے جسموں کی بو لے لی ہے۔ تم جہاں بھی ہو گے یہ تمہیں تلاش کر لیں گے اور اگر تم پر کوئی مصیبت آئی تو یہ تمہاری مدد کریں گے"۔

دوپہر کو تھوڑا بہت کھا کر ہم دونوں سپیرن سے رخصت ہو کر پوڈانگ کی طرف روانہ ہو گئے۔ یہ واپسی کا سفر تھا۔ ہم انہی راستوں پر چل رہے تھے جن پر چلتے ہوئے ہم یہاں تک پہنچے تھے۔ شام تک جنگل میں ہمارا سفر جاری رہا۔ رات کو ایک چٹان کی کھوہ میں آرام کیا۔ دوسرے دن کا سورج نکلا تو دوبارہ سفر پر چل پڑے۔ اس روز آسمان پر بادل چھا گئے اور ہوا چلنے لگی۔ ہم ایک ٹیلے سے نکلے ہی تھے کہ اچانک تین جنگلی ہاتھیوں میں

چھرے پکڑے ہمارے سامنے آگئے۔ پستول قزاق کی پیٹی میں لگی تھی۔ قزاق نے کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ ایک جنگلی نے چھرے سے حملہ کر دیا اور قزاق کی اڑانے ہی والا تھا کہ اچانک سانپ کے پھنکار کی آواز آئی اور جنگلی جیسے کھڑا تھا ویسے دھڑام سے گھاس پر گر پڑا۔ یہی حال دوسرے جنگلی کا ہوا۔ تیسرا جنگلی ڈر کر بھاگ اس کے بعد گھاس میں سے سپیرن کے دونوں سانپ اپنا پھن اٹھائے نکلے۔ لاشوں پاس آکر ان کا ایک ایک چکر لگایا اور گھاس میں غائب ہو گئے۔ قزاق میری طرف بولا۔ "ہمیں اب راستہ بدل کر چلنا ہو گا۔"



اس وقت اگر سانپ ہماری مدد کو وہاں نہ پہنچتا تو ان خونخوار جنگلیوں سے ہمارا بچ نکلنا ناممکن تھا۔ یہ سانپ میرے قزاق ساتھی لوبو کی منہ بولی سپیرن ماں نے ہماری حفاظت کے لئے ہمارے ساتھ کر دیا تھا جو ہماری نظروں سے اوجھل رہ کر ہماری نگرانی کر رہا تھا قزاق نے اپنے چہرے کا پسینہ صاف کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے اپنی جان کی پروا نہیں ہے۔ افسوس یہ ہوتا کہ میرے قیمتی ہیرے جواہرات ہاتھ سے نکل جاتے۔"

میں نے کہا۔ "تمہیں یہ ہیرے جواہرات اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہیں کیا؟"

قزاق نے ایک قہقہہ لگایا' بولا۔

"اگر میرے پاس دولت نہیں ہو گی تو خالی جان لے کر کیا کروں گا؟ دولت کی خاطر تو میں اپنی جان بھی قربان کر دوں۔ آخر دوسروں کی جان لے کر میں نے یہ دولت جمع کی ہے۔"

اس قزاق کی منطق میری سمجھ سے باہر تھی۔ بہرحال ہم کسی نہ کسی طرح ان دشوار گذار خطرناک جنگلوں میں سفر کرتے پوڈانگ پہنچ گئے۔ یہاں آتے ہی ہمیں پتہ چل گیا کہ پوڈانگ پر جاپانیوں نے قبضہ کر لیا ہوا ہے۔ جس بات سے میں ڈرتا تھا آخر وہی بات ہوئی۔ یعنی ایک بار پھر جاپانیوں سے آمنا سامنا ہو گیا تھا۔ میرے ساتھی قزاق پر اس خبر سے صرف یہی اثر پڑا کہ وہ سپیرن کے خاص آدمی کے بارے میں فکر مند ہوا کہ اب اسے کہاں تلاش کیا جائے۔ کیونکہ پوڈانگ کا چھوٹا سا بندرگاہی قصبہ نما شہر جاپانیوں کی گولہ باری سے تقریباً تباہ ہو چکا تھا اور کرفیو لگا تھا۔ ہم دن کے وقت وہاں پہنچے تھے۔ اس وقت

آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ بارش ہو کر ہٹی تھی اور زمین گیلی تھی۔ قزاق اس خاص آدمی کے ٹھکانے سے واقف تھا۔ مگر کرفیو کی وجہ سے وہاں تک جانا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ ہم گھنے جنگل سے نکل آئے تھے اور اب دھان کے کھیتوں میں سے گذرتے ہوئے شہر کی ایک سڑک پر آکر رک گئے۔

"قزاق بولا۔ یہ شہر کے لوگ کہاں چلے گئے ہیں۔"

میں نے جاپانی سپاہیوں کو سڑک پر گشت لگاتے دیکھ لیا تھا۔ اور سمجھ گیا تھا کہ یہ علاقہ جاپانی قبضے میں آچکا ہے اور کرفیو لگا ہے۔ میرے ساتھی قزاق کی کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کرفیو کیا ہوتا ہے۔ جب میں نے اسے بتایا کہ اگر وہ جاپانی سپاہی کے سامنے گیا تو اسے شوٹ کر دیا جائے گا تو وہ کہنے لگا۔

"یہ تمہارا کرفیو کب ختم ہو گا؟"

میں نے کہا۔

"کچھ معلوم نہیں ----- ہمیں کسی محفوظ جگہ پر چھپ جانا چاہئے۔ جب شہر کے لوگ سڑکوں پر نکلیں گے تو ہم بھی باہر آجائیں گے"۔

قزاق نے ہیرے جواہرات کی تھیلی اپنی کمر کے ساتھ باندھ رکھی تھی۔ کہنے لگا۔

"ٹھیک ہے چلو وہاں جا کر چھپ جاتے ہیں۔"

اس نے جس طرف اشارہ کیا تھا وہاں بانس کا جھنڈ تھا جس کے سائے میں سیمنٹ کا ایک بہت بڑا پائپ پڑا ہوا تھا۔ ہم اس کے اندر جا کر بیٹھ گئے۔ پائپ کا دہانہ چھ سات فٹ ہو گا۔ اس کا عقبی منہ کسی نے پتھروں سے بند کر دیا ہوا تھا۔ لگتا تھا کہ یہاں کوئی غریب آدمی رہتا ہو گا۔ پائپ کے اندر اخباروں کے کچھ کاغذ بھی بکھرے ہوئے تھے۔ چھپنے کے لئے ہمیں بڑی اچھی جگہ مل گئی تھی۔ یہاں سے ہمیں ناریل کے درختوں کے بیچ میں شہر کی سڑک بھی دکھائی دے رہی تھی۔ جو سنسان پڑی تھی۔ کسی وقت کوئی فوجی گاڑی تیز رفتاری سے گذر جاتی تھی۔

میں قزاق ساتھی سے زیادہ پریشان تھا۔ کیونکہ میں جاپانیوں کی قید سے بھاگا ہوا تھا۔

اگرچہ مجھے یقین تھا کہ پوڈانگ پر قابض جاپانی فوجی مجھے شاید ہی پہچان سکیں پھر بھی میں نادانستہ طور پر ایک بار پھر خطرے کے منہ میں آگیا تھا۔ اس بارے میں میں نے اپنے قزاق ساتھی کو کچھ نہ بتایا اور پائپ کے اندر بیٹھا سوچنے لگا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہئے۔ کیونکہ صاف ظاہر تھا ہم وہاں سے کوئی بھی بحری جہاز پکڑ کر کسی دوسرے ملک کی طرف نہیں جا سکتے تھے۔ میرے قزاق ساتھی کو چونکہ صورت حال کی سنگینی کا علم نہیں تھا اس لئے وہ بڑا مطمئن تھا۔ جب میں نے اسے بتایا کہ اب ہم سمندر میں جہاز میں سفر نہیں کر سکیں گے تو وہ میری طرف منہ کھول کر تکنے لگا۔ "کیوں"؟

میں نے کہا کہ یہ سارا علاقہ اب جاپانیوں کے قبضے میں ہے۔ جونہی ہم شہر میں داخل ہوں گے ہمیں مشتبہ سمجھ کر پکڑ لیا جائے گا اور پھر خدا جانے ہمارا کیا حشر ہو۔ قزاق نے بے نیازی سے کہا۔

"سیرن ماں کے آدمی کو تم نہیں جانتے وہ خفیہ طریقے سے ہمیں یہاں سے کسی جہاز میں سوار کروا دے گا۔ تم دیکھ لینا"۔

قزاق احمقوں کی جنت میں رہ رہا تھا۔ اسے کچھ احساس نہیں تھا کہ حالات اچانک پلٹا کھا چکے ہیں۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ دن کسی نہ کسی طرح گذار لوں۔ پھر واپس جنگل میں سفر شروع کر دوں گا۔ آگے جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہاں بھی جاپانی سپاہی آجائیں گے۔ یہ سب کچھ اس قدر اچانک ہو گیا تھا کہ میں ہکا بکا ہو کر رہ گیا۔ چار جاپانی فوجی اچانک ہمارے سامنے آگئے۔ انہوں نے رائفلیں تان رکھی تھیں۔ ہم پائپ سے باہر نکل آئے میں نے فوراً ہاتھ کھڑے کر دیئے۔ میں جاپانی فوجیوں کے مزاج سے خوب واقف تھا۔ مگر میرے ساتھی قزاق کو ان باتوں کا پہلے سے کوئی تجربہ نہیں تھا۔ اس نے یہ حماقت کی کہ پائپ سے باہر نکلتے ہی بیلٹ میں سے پستول نکال کر فائر کر دیا۔ ایک جاپانی فوجی کے سر پر گولی لگی اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ جاپانیوں نے اس پر اندھا دھند فائر کھول دیا۔ میں وہیں بیٹھ گیا۔ قزاق کا جسم گولیوں سے چھلنی ہو کر تڑپنے لگا۔ ایک فوجی نے رائفل کا رخ میری طرف کیا۔ میں نے فوراً ہاتھ کھڑے کر دیئے ایک فوجی نے میری

گردن پر رائفل کی نالی لگا دی۔ ایک فوجی جلدی سے اپنے شدید زخمی ساتھی کو اٹھا کر پیچھے لے گیا جہاں شاید ان کی کوئی میڈیکل پوسٹ تھی۔ باقی سپاہیوں نے قزاق کی جیبوں کی تلاشی لی تو ہیرے جواہرات سے بھری ہوئی تھیلی نکل آئی۔ جاپانی بڑے خوش ہوئے۔ میں نے ہاتھ نیچے کر لئے تھے اور اس وقت کو کوس رہا تھا جب میں نے اس قزاق کے ساتھ پوڈانگ کا رخ کیا تھا۔ مگر اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔

جاپانیوں نے میرے ہاتھ پشت پر رسی سے باندھ دیئے اور مجھے لے کر بندرگاہ آگئے۔ یہاں ایک فوجی حوالات میں بند کر دیا۔ جہاں وہاں کے کچھ مقامی لوگ پہلے سے قید تھے۔ پندرہ منٹ کے اندر اندر صورت حال ایک دم بدل گئی تھی۔ میں اس آئے دن کی جاپانی قید سے تنگ آگیا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو حالات کے سپرد کر دیا کہ جو ہو گا مجھے قبول ہو گا۔ میں فرار کے بارے میں بھی نہیں سوچ رہا تھا۔ میرے ساتھی قیدی پژمردہ اور بے یقینی کی کیفیت میں حوالات کی دیوار کے ساتھ لگ کر ادھر ادھر بیٹھے تھے۔ کسی نے میری طرف زیادہ توجہ نہیں دی تھی۔ میں نے بھی کسی سے کوئی بات نہ کی اور خاموش ہو کر بیٹھ گیا۔

قدرتی طور پر میں یہی سوچ رہا تھا کہ ہمیں اس کوارٹر گارڈ سے نکال کر پوڈانگ کے کسی قیدی کیمپ میں ڈال دیا جائے گا۔ جہاں ہم جنگ کے ختم ہونے تک اذیت ناک زندگی بسر کریں گے۔ وہ بھی اگر ہم زندہ رہے تو ---- لیکن میرا اندازہ غلط نکلا۔ دوسرے روز ہمیں بندرگاہ پر لے جا کر ایک بہت بڑے جنگی جہاز پر سوار کرا دیا گیا جس کی توپوں کی نالیاں صاف نظر آ رہی تھیں۔ یہ بات میرے لئے ایک معمہ بن گئی کہ ہمیں جنگی جہاز پر کیوں لادا گیا ہے۔ پھر خیال آیا کہ ہو سکتا ہے جاپانی ہمیں یہاں سے آگے کسی جزیرے میں بنے ہوئے جنگی قیدی کیمپ میں لے جا رہے ہوں۔

ہمیں جہاز کے نیچے لے جا کر ایک سٹور میں بند کر دیا جہاں لکڑی کے خالی کھوکھے ادھر ادھر بکھرے پڑے تھے وہاں پر کسی کھڑکی یا روشندان کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ جہاز کا یہ نچلا حصہ سمندر کے اندر تھا۔ ہم چھ سات قیدی تھے۔ دو برمی تھے۔ ایک

ڈونیشیا کا مزدور تھا اور باقی فلپینی تھے جو اس شہر میں محنت مزدوری کرنے آئے ہوئے تھے جاپانیوں نے انہیں پکڑ کر قید میں ڈال دیا۔ رات کے کسی لمحے جہاز چل پڑا۔ جب جہاز سمندر میں سفر کرتے دو دن گذر گئے تو ہمیں تشویش ہوئی کہ یہ جاپانی ہمیں کہاں لے جا رہے ہیں۔ اس روز جہاز سمندر میں کسی جگہ رکا۔ ایک جاپانی فوجی آیا اور ہم قیدیوں میں سے دو کو پکڑ کر لے گیا۔ ایک گھنٹے بعد جہاز چل پڑا مگر دونوں قیدی واپس نہ آئے۔ دو گھنٹے بعد جہاز ایک بار پھر رکا اور وہی جاپانی فوجی آیا اور ہم میں سے دو مزید قیدیوں کو پکڑ کر لے گیا۔ ہم سمجھ گئے کہ آخری وقت آگیا ہے۔ جاپانی ہمارے ساتھیوں کو جہاز کے عرشے پر لے جا کر شوٹ کر رہے ہیں۔ پھر خیال آتا کہ جہاز رکتا کیوں ہے؟ یہ چلتے جہاز پر بھی قیدیوں کو شوٹ کر کے لاشیں سمندر میں پھینک سکتے ہیں۔ تیسری بار جہاز رکا تو دو مزید قیدیوں کو لے گئے چوتھی بار جہاز رکا تو صرف میں اکیلا ہی قیدی رہ گیا تھا۔ جاپانی سپاہی مجھے بازو سے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا اوپر عرشے پر لے آیا۔ میں دل میں خدا کو یاد کرنے لگا۔ یہ صاف ظاہر تھا کہ جاپانی اوپر عرشے پر لے جا کر مجھے یا شوٹ کر دیں گے یا اٹھا کر سمندر میں پھینک دیں گے۔ میں نے دیکھا کہ جہاز ایک چھوٹے سے سرسبز جزیرے کے ساحل سے کچھ فاصلے پر سمندر میں کھڑا ہے۔ صبح کی روشنی چاروں طرف پھیل رہی ہے۔ جہاز پر سے ایک کشتی اتار دی گئی۔ مجھے اس کشتی میں بٹھایا اور جزیرے کے ساحل پر لا کر چھوڑ دیا گیا۔ میرا خیال تھا کہ مجھے جزیرے کے ساحل پر گولی سے اڑایا جائے گا مگر ایسا نہ ہوا اور جاپانی سپاہی کشتی میں بیٹھ کر اپنے جہاز کی طرف واپس چلے گئے۔ تب معلوم ہوا کہ ان جاپانیوں نے قیدیوں کو الگ الگ ویران جزیروں میں جلا وطن کر دیا تھا۔ آخر میں مجھے اکیلے ہی اس جزیرے پر اتار دیا گیا۔ کیونکہ میرا ساتھی بننے والا کوئی دوسرا قیدی نہیں بچا تھا۔

تھوڑی دیر بعد جاپانی جنگی جہاز نے لنگر اٹھا لیا اور پھر سمندر میں چلتا ہوا میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ میں نے اردگرد کا جائزہ لیا مجھے یقین تھا کہ یہ جزیرہ غیر آباد نہیں ہے یہاں ضرور ماہی گیر قسم کے لوگ جنوبی ساحل کی طرف آباد ہوں گے۔ میں نے

سارے جزیرے کو دیکھ ڈالا مجھے کسی انسان کی شکل نظر نہ آئی۔ یہ جزیرہ بہت چھوٹا تھا۔ قریباً ایک گھنٹے میں میں نے سارا جزیرہ گھوم کر دیکھ لیا۔ جزیرے کے اندر بڑے بڑے درخت تھے۔ ساحل سمندر پر جگہ جگہ بھوری چٹانیں زمین سے باہر نکلی ہوئی تھیں۔ جزیرے پر ایک دہشت ناک قسم کا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ سمندر کی لہریں بڑے سکون سے ساحل تک آکر واپس چلی جاتیں۔ ناریل درختوں کے نیچے کافی تعداد میں گرے ہوئے تھے۔ یہی ناریل اب میری خوراک تھے۔ رات بسر کرنے کے لئے میں نے جھاڑیوں میں تھوڑی سی جگہ بنالی۔ سمندر میں شام کی روشنی جسے انگریزی میں کہتے ہیں بڑی دیر تک رہتی ہے۔ شام کو بھی درختوں پر کوئی پرندہ نہ آیا جس سے ثابت ہوا کہ یہ جزیرہ سمندر میں کافی فاصلے پر واقع ہے۔ مجھے رابنسن کروزو ناول یاد آگیا۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ مجھے بھی یہاں پندرہ بیس سال اکیلے گذارنے پڑیں گے؟ اس خیال سے ہی میں کانپ اٹھا آدھی رات کے وقت آسمان پر چاند نکل آیا جس کی روشنی سمندر اور جزیرے پر پھیل گئی۔ خاموشی اور گہری ہو گئی تھی میں سونے کی کوشش کر رہا تھا کہ مجھے ایسی آواز سنائی دی جیسے کوئی چپو چلاتا کشتی کو ساحل کی طرف لا رہا ہے۔



چپوؤں کی آواز قریب آتی جا رہی تھی۔ صاف لگ رہا تھا کہ کوئی کشتی ساحل کی طرف آ رہی ہے۔ میں جلدی سے جھاڑیوں سے نکل کر ساحل کی طرف آیا۔ اور ناریل کے درختوں کی اوٹ سے دیکھنے لگا۔ چاندنی میں ہر شے صاف نظر آ رہی تھی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ساحل سے کچھ دور سمندر میں ایک بحری جہاز کھڑا ہے اور ایک بڑی سی کشتی جس میں کچھ آدمی سوار ہیں سمندری لہروں پر ڈولتی ساحل کی طرف بڑھ رہی ہے۔ کشتی ساحل پر آکر رک گئی۔ اس میں سے چھ سات آدمی چھلانگیں لگا کر اترے پھر انہوں نے کشتی میں سے ایک ایسے آدمی کو کھینچ کر نیچے اتارا جس کے دونوں ہاتھ رسی سے بندھے ہوئے تھے۔ اس آدمی کے بال کاندھوں تک آئے ہوئے تھے۔ چاندنی میں اس کا چہرہ مجھے دکھائی نہیں دیا۔ وہ گھسٹ گھسٹ کر چل رہا تھا۔ جیسے اس کے پاؤں میں کوئی تکلیف ہو۔ چار آدمی اس کو اپنی نگرانی میں چلا رہے تھے۔ انہوں نے رائفلیں تان رکھی تھیں۔ دو آدمی تیزی سے آگے ساحل کی ریت پر ایک جگہ زمین میں لوہے کی لمبی لمبی میخیں ٹھونکنے لگے۔ میں یہ پر اسرار منظر بڑی حیرانی سے دیکھ رہا تھا۔ میرا اندازہ یہی تھا کہ یہ کوئی بحری ڈاکو قسم کے لوگ ہیں اور اپنے کسی دشمن کو جزیرے پر قتل کرنے کے لئے لائے ہیں۔ اگر ایسی بات تھی تو پھر یہ زمین میں لوہے کی لمبی لمبی میخیں کس لئے گاڑی جا رہی تھیں؟ یہ بات میری سمجھ سے باہر تھی۔ لیکن بہت جلد یہ معمہ حل ہو گیا۔

جب چاروں طرف لوہے کی چار میخیں زمین میں اچھی طرح سے گاڑ دی گئیں تو ان لوگوں نے قیدی آدمی کو رائفل کی نوک پر ریت پر سیدھا لٹایا اور اس کے دونوں ہاتھ اور

دونوں پاؤں لوہے کی میخوں کے ساتھ زنجیروں کی مدد سے مضبوطی سے باندھ دیئے۔ پھر ایک آدمی نے قیدی کے پیٹ پر زور سے لات ماری۔ قیدی زمین پر ان میخوں کے ساتھ اتنی مضبوطی سے کس کر بندھا ہوا تھا کہ وہ اپنا جسم نہ ہلا سکا اور صرف درد کی وجہ سے سر کو دائیں بائیں کرتا رہا۔ اس کے بعد ایک آدمی نے آگے بڑھ کر بندھے ہوئے قیدی کی کمر کے گرد ایک بیلٹ کس کر باندھ دی۔ پھر وہ سارے کشتی میں بیٹھ کر واپس اپنے جہاز کی طرف چل دیئے۔ ان کی کشتی جہاز پر اٹھالی گئی۔ کچھ دیر بعد جہاز نے آہستہ آہستہ اپنا رخ بدلا اور دوسری طرف سمندر میں روانہ ہو گیا۔ میں درختوں میں اسی طرح چھپا بیٹھا رہا۔ جب جہاز کافی دور چلا گیا تو جلدی سے اس آدمی کے پاس گیا جس کو اس کے دشمن مرنے کے واسطے زمین پر باندھ گئے تھے۔

چاندنی کھلی ہوئی تھی۔ اس آدمی نے حیرانی سے میری طرف دیکھا میں نے اس علاقے میں عام بولی جانے والی شکستہ زبان میں کہا۔ "فکر نہ کرو۔ میں تمہارا دشمن نہیں دوست ہوں"۔

اب بھی وہ آدمی حیرانی سے مجھے تکے جا رہا تھا۔ گویا اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ اس ویران اور بے آباد جزیرے پر بھی کوئی انسان موجود ہو سکتا ہے۔ اس نے کسی قدر بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"میری کمر کے ساتھ جو بیلٹ بندھی ہے اسے اتار کر سمندر میں پھینک دو جلدی کرو"۔

میں سمجھ گیا کہ بیلٹ میں ضرور کوئی دھماکہ خیز مادہ بھرا ہوا ہے۔ میں نے جلدی سے بیلٹ کھولی اور اسے دوڑ کر سمندر میں پھینک دیا۔ اس نے پیچھے سے آواز دی واپس بھاگو میں واپس دوڑ پڑا۔ جب اس کے قریب پہنچا تو اس نے چلا کر کہا زمین پر لیٹ جاؤ۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ کوئی بیس سیکنڈ بعد جزیرہ ایک دھماکے کی آواز سے گونج اٹھا۔ بیلٹ کے ساتھ بندھا ہوا ٹائم بم پھٹ گیا تھا۔ میں نے اس آدمی کی زنجیریں کھول کر اسے آزاد کر دیا۔ ریت پر بیٹھا اپنی کلائیوں اور ٹخنوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے میری طرف دیکھ کر بولا۔ "

...ت کا فرشتہ بن کر کہاں سے آگئے کون ہو تم؟ یہ جزیرہ تو غیر آباد ہے"۔

میں نے اپنے بارے میں اصل حقیقت کو بیان نہ کیا اور صرف اتنا بتایا کہ سمندر میں ایک تجارتی جہاز کسی جاپانی آب دوز کا تارپیڈو لگنے سے ڈوب گیا تھا۔ میں کسی طرح بچ کر آج صبح ہی یہاں پہنچا ہوں۔ پھر میں نے اس سے پوچھا کہ تم کون ہو اور یہ کون لوگ تھے جو تمہیں ہلاک کرنے کی غرض سے یہاں باندھ گئے تھے۔

اس آدمی کی عمر پچاس سے اوپر تھی۔ رنگ زردی مائل تھا۔ چہرے کے نقش ہسپانوی خانہ بدوشوں ایسے تھے۔ بال سیاہ کالے اور چھوٹی چھوٹی سیاہ مونچھیں تھیں۔ اس نے میری طرف ایک بھرپور گہری نگاہ ڈالی اور بولا۔

"تم نے میری جان بچائی ہے۔ میں تم سے کچھ نہیں چھپاؤں گا۔ میرا نام کارلو ہے۔ میرا تعلق ملک سپین کے ایک خانہ بدوش قبیلے سے ہے۔ میں ملک ملک کی سیر کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ میری ملاقات ایک شخص برونو سے ہو گئی جو سمگلروں کے ایک بین الاقوامی گروہ سے وابستہ تھا۔ میں بھی اس میں شامل ہو گیا لیکن جب میں نے دیکھا کہ یہ لوگ منشیات کا دھندا کرتے ہیں تو میں نے برونو سے کہا کہ میں یہ کام نہیں کر سکتا اور تم لوگوں سے الگ ہو رہا ہوں۔ اس وقت یہ لوگ اپنے بحری جہاز میں آسٹریلیا کی طرف جا رہے تھے مجھ سے غلطی ہو گئی تھی مجھے ان کو بتانے کی بجائے خاموشی سے کسی بندرگاہ پر اترنے کے بعد غائب ہو جانا چاہئے تھا۔ مگر میں نے برونو پر اعتبار کیا کیونکہ میں اسے اپنا دوست سمجھتا تھا۔ تب انہوں نے مجھے ہلاک کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اسی وقت مجھے باندھ کر جہاز کے تہہ خانے میں ڈال دیا اور پھر اس جزیرے پر مرنے کے لئے چھوڑ گئے۔ اگر تم دس پندرہ منٹ دیر کر دیتے تو میری کمر کے ساتھ بندھا ہوا ٹائم بم پھٹ جاتا اور میرے جسم کے پرخچے اڑ جاتے۔ میں تمہارا شکریہ ادا کرتا ہوں"۔

میں نے کہا۔

"یہ سب کچھ خدا کی مرضی سے ہوا ہے۔ ابھی تمہاری زندگی باقی تھی پس خدا نے ... مجھے اس جزیرے پر بھیج دیا تاکہ میں تمہیں موت کے منہ سے بچا سکوں"۔

کارلو نے جزیرے کے درختوں کی طرف دیکھا اور بولا۔

"کیا اس جزیرے میں جنگلی پھلوں کے درخت ہیں؟"

میں نے جواب میں کہا۔ "میں کل صبح ہی یہاں آیا ہوں میں نے سارے جزیرے کا دیکھا ہے۔ مجھے سوائے ناریل کے کوئی پھل دار درخت نظر نہیں آیا۔"

کارلو نے اپنے گھٹنے کو دباتے ہوئے کہا۔

"جہاز میں انہوں نے مجھ پر تشدد بھی کیا تھا۔ برونو چاہتا تھا کہ میں منشیات کے دھندے میں ان کا ساتھ دوں۔ مگر میرے ضمیر کو یہ گوارا نہیں تھا۔ میں منشیات کو انسانیت کا دشمن سمجھتا ہوں۔ میرے گھٹنے پر انہوں نے لوہے کی سلاخیں ماری تھیں۔ کوئی بات نہیں یہ بہت جلد ٹھیک ہو جائے گا۔ میں جنگلی جڑی بوٹیوں کا بھی ماہر ہوں۔ ہم کے خانہ بدوشوں کو جڑی بوٹیوں کا بڑا علم ہوتا ہے۔ اس جزیرے میں مجھے وہ بوٹی مل جائے گی جو میرے گھٹنے کا درد ختم کر کے رکھ دے گی۔ میرا خیال ہے کہ کچھ دیر آرام کر لیتے ہیں صبح اٹھ کر جزیرے کا جائزہ لوں گا۔"

ہم وہیں ریت پر لیٹ گئے۔ چاند مغرب میں ڈھلنے لگا تھا۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی ہم بہت جلد گہری نیند سو گئے۔ آنکھ اس وقت کھلی جب ساحل پر چاروں طرف دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ کارلو وہاں نہیں تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ ناریل کے درختوں کی قطار سے نکل کر میری طرف آیا۔ وہ ناریل کو توڑ کر کھا رہا تھا۔ ریت پر بیٹھ گیا اور کہنے لگا۔

"میں نے سارا جزیرہ دیکھ لیا ہے۔ یہاں سوائے ناریل کے کھانے کے واسطے دو کوئی جنگلی پھل نہیں ہے اور خالی ناریل پر ہم زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہ سکتے۔"

"میں نے کہا" مگر یہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ بھی تو نہیں ہے۔"

کارلو سر ہلا کر بولا۔ "کچھ نہ کچھ انتظام ہو جائے گا۔ میں فلپائن کی طرف جاتے ہو اس علاقے سے کئی بار گذر چکا ہوں۔" پھر اس نے اپنی پرانی پتلون اوپر کھسکا کر مجھے گھٹنا دکھایا جس پر کوئی سرخ رنگ کی دوا لگی تھی۔ کہنے لگا۔ "مجھے میرے مطلب کی یہاں مل گئی تھی۔ اس کا رس گھٹنے پر لگا دیا ہے درد بہت کم ہو گیا ہے۔" وہ جزیرے

رب کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"میرے ساتھ آؤ"۔

ہم ساحل کی ریت پر سمندر کے ساتھ ساتھ چلتے جزیرے کے مغربی علاقے میں گئے۔ یہاں بھورے رنگ کی چھوٹی بڑی بے شمار چٹانیں پھیلی ہوئی تھیں۔ کارلو بولا۔

"یہاں سے اگر ہم جنوب مغرب کی طرف سمندر میں سفر کرنا شروع کریں تو پہلے اسکر اور پھر جنوبی افریقہ آجائے گا۔ شمال مشرق مغرب میں زوروں کی جنگ ہو رہی ۔ جنوبی افریقہ میں ابھی تک امن ہے۔ اگرچہ وہاں بھی جنگی حالت ہے۔ جنوبی افریقہ پر ز قابض ہیں۔ وہاں ہمیں پناہ مل جائے گی۔ اس کے بعد سوچیں گے کہ ہمیں آگے اں جانا ہے"۔

میں نے کہا۔ "لیکن مڈغاسکر تک ہم کیسے پہنچیں گے کارلو؟"

کارلو بولا "یہی سوال مجھے پریشان کر رہا ہے۔ کیونکہ اس جزیرے اور جنوبی افریقہ کے ے مڈغاسکر تک بحرالکاہل کا ایک بہت بڑا سمندر پھیلا ہے۔ صرف ایک بات حوصلہ ہے کہ یہ سمندر ہمیشہ پرسکون رہتا ہے۔ اگر ہم درختوں کے تنے جوڑ کر اس کا تختہ بنا سمندر میں چل پڑیں تو میرے اندازے کے مطابق سمندر کی لہریں ہمیں بیس بائیس میں مڈغاسکر یا افریقہ کے مشرقی ساحل پر پہنچا دیں گی"۔

کارلو کی سکیم کافی خطرناک تھی۔ اس میں زندہ ساحل تک پہنچنے کی امید بہت کم ۔ لیکن اس کے سوا دوسرا کوئی راستہ بھی نہیں تھا۔ چنانچہ ہم نے گرے پڑے ں کے تنوں کو جوڑنا شروع کر دیا۔ ہم ایک ایسی ناپائیدار کشتی تیار کر رہے تھے جو ال جیسے عظیم الشان سمندر میں کہیں بھی ہمارا ساتھ چھوڑ سکتی تھی۔



درختوں کے گرے پڑے تنوں کو ہم نے ایک دوسرے سے اچھی طرح مضبوطی باندھ لیا۔ اس کام کے لئے ہم نے وہ زنجیریں بھی استعمال کیں جن سے کارلو کو اس دشمن باندھ کر چلے گئے تھے۔ ان کے علاوہ جنگلی بیلوں کی موٹی موٹی رسیوں کو بھی کام لائے۔ یہ ایک کافی چوڑا سا تختہ بن گیا جس پر ہم نے درمیان میں ناریلوں کا ڈھیر لگا اسے بھی قدرتی رسیوں کے جال سے جکڑ دیا تاکہ سمندر میں ڈولنے کی وجہ سے نا سمندر میں نہ پھسل جائیں۔ یہ کوئی ایسا پختہ اور یقینی انتظام نہیں تھا۔ لیکن ہم اس زیادہ کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ ہم جب بھی اس جزیرے سے نکلتے ہمیں یہی کرنا پڑتا۔

کارلو ایک ماہر ملاح بھی تھا۔ اسے سمندری سفر کا بڑا تجربہ تھا اس نے تخت درمیان میں درخت کی ایک شاخ گاڑ کر اس کے ساتھ اپنی قمیض باندھ دی تاکہ ہوا رخ کا پتہ چل سکے۔ آخر ایک روز منہ اندھیرے ہم اپنی ناپائیدار تختہ نما کشتی پر بیٹھ کارلو نے رسی کو کھول دیا۔ رسی کے نکلتے ہی تختہ سمندر میں ایک طرف آہستہ آہستہ بڑا۔ پھر ایک بڑی سی موج نے اسے پہلے اوپر اٹھایا پھر پیچھے کی طرف ڈال دیا۔ ہمارا جزیرے کے ساحل سے تیزی کے ساتھ دور ہونا شروع ہو گیا اور پھر کوئی ایک گھنٹے بعد جزیرہ نظروں سے اوجھل ہوا اور ہم کھلے سمندر میں آ گئے۔

کھلے سمندر میں آتے ہی میرا دل بیٹھنے لگا۔ چاروں طرف سبز رنگ کا وسیع سمندر ہی سمندر تھا۔ جس کی اوپر نیچے ہوتی سطح پر ہمارا تختہ اپنے آپ ایک طرف

کافی نیچے ہوتی ہے اور انسان کو اتنا خوف محسوس نہیں ہوتا لیکن ہم تو بالکل سمندر کے اوپر بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ بھی خطرہ تھا کہ کوئی شارک مچھلی ٹکر مار کر ہمارے تختے کو نہ الٹ دے۔ مگر کارلو بڑا مطمئن تھا۔ کہنے لگا۔

"یہ سمندر سارا سال پرسکون رہتا ہے۔ اس میں بہت کم طوفان آتے ہیں۔ اور اگر کوئی طوفان آ بھی گیا تو ہم اپنے آپ کو رسیوں سے باندھ لیں گے۔ ویسے بھی یہ تختہ ڈوب نہیں سکتا نہ اس میں پانی بھر سکتا ہے۔ بس کسی نہ کسی طرح ہمیں اس کے ساتھ چپٹے رہنا ہو گا۔"

کارلو نے ہدایت کر دی تھی کہ ہم دن میں چار چار ناریلوں سے زیادہ نہیں کھائیں گے۔ انہی کا پانی پئیں گے اور گری کھا کر بھوک مٹائیں گے۔ اس حساب سے ہمارے پاس دو مہینے کی خوراک تھی۔ ایک خطرہ بہرحال اپنی جگہ پر موجود تھا کہ کہیں کسی جاپانی یا جرمن جنگی جہاز سے سامنا نہ ہو جائے۔ پھر اس سمندر میں جنگی آبدوزیں بھی پانی کے اندر چل پھر رہی تھیں۔ پھر ساحل کے قریب پہنچ کر ہماری کشتی یا تختہ سمندر میں تیرتی کسی بارودی سرنگ سے ٹکرا کر تباہ ہو سکتا تھا۔ غرض کہ ہم ہزاروں قسم کے خطرات کو ساتھ لئے سمندر میں سفر کر رہے تھے۔

پہلے تین دن سکون سے گزر گئے۔ چوتھے دن دوپہر کے بعد بادل چھا گئے اور تیز ہوائیں چلنے لگیں۔ ہمارا تختہ بری طرح ہچکولے کھا رہا تھا۔ کارلو بڑی مہارت سے تختے کو اپنے قابو میں رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کئی بار یہ تختہ گھوم جاتا۔ مگر اس کا رخ جنوب مغرب کی طرف ہی رہا۔ کیونکہ سمندری موجوں کا رخ بھی اسی طرف تھا۔ تیز ہواؤں نے طوفان کی شکل اختیار کر لی۔ سمندری موجوں اور ہواؤں کے شور سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ ہم نے اپنے آپ کو رسیوں سے جکڑ لیا تھا اور تختے پر لیٹ گئے تھے۔ ایک زبردست طوفانی موج نے ہمیں نیچے سے اٹھا کر کئی گز دور دوسری موج پر پھینک دیا۔ خدا کا شکر ہے کہ تختہ الٹا نہیں تھا۔ وہ رسی ٹوٹ گئی جس کے ساتھ ناریلوں کا جال بندھا تھا۔ کتنے ہی ناریل جال میں سے نکل کر سمندری لہروں کی نذر ہو گئے کارلو نے اپنے

آپ کو جال کے اوپر گرا دیا اور باقی ناریلوں کو گرنے سے بچالیا۔ خدا خدا کر کے طوفان کا زور کم ہوا۔ مگر ہوا اب بھی بڑی تیز چل رہی تھی۔ بارش بھی ہو رہی تھی۔ جب طوفان تھم گیا اور سمندر بھی قدرے پرسکون ہوا تو ہم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ میں نے کارلو سے کہا۔ "تم تو کہتے تھے کہ اس سمندر میں طوفان نہیں آتے۔ یہ طوفان کہاں سے آگیا؟"

کارلو بولا۔ "میں نے تو کہا تھا کہ اس سمندر میں کبھی کبھار ہی طوفان آتے ہیں۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ وہ کبھی کبھار کا طوفان آج ہی آجائے گا۔ بہرحال ہمارے پاس اتنے ناریل بچ گئے ہیں کہ ہم مزید تین ہفتے گذارہ کر سکتے ہیں۔"

لیکن آگے کیا ہونے والا تھا اس کی ہمیں خبر نہیں تھی۔ ہمارا بے یارومددگار سمندری سفر ایک بار پھر شروع ہو گیا میرا خیال ہے بحرالکاہل کے وسیع و عریض سمندر میں یہ ہمارا سولہواں سترھواں دن تھا۔ ناریل کی گری ہمارے جسموں کی پوری نشوونما نہیں کر سکتی تھی۔ ہم بھوک پیاس سے تو بچ گئے تھے مگر میں اپنے جسم میں کمزوری محسوس کرنے لگا تھا۔ کارلو کا بھی یہی حال تھا۔ ہم زیادہ تر تختے پر لیٹے رہتے۔ سمندری لہریں اسے اپنے آپ جنوب مغرب کی طرف دھکیلے لئے جا رہی تھیں۔ اس وقت مجھے دو ایک بار اپنا شہر بڑا یاد آیا۔ اور دل نے کہا تمہیں کس نے اپنا شہر چھوڑنے کو کہا تھا۔ لیکن پھر یہ خیال بھی آتا کہ آخر ایڈونچر ایڈونچر ہوتا ہے۔ اس کا تجربہ شہروں میں بیٹھ کر نہیں ہو سکتا۔ دنیا کی زندہ قوموں کے افراد نے اسی طرح سمندروں میں خطرات مول لے کر نئے نئے ملک دریافت کئے ہیں اور مسلمان عرب علاقوں نے آج سے سینکڑوں برس پہلے سمندروں کا سفر کر کے ملایا اور چین تک تجارتی راستے دریافت کئے تھے۔ اس خیال سے میرا حوصلہ بڑھ جاتا مگر سمندر میں بالکل کھلی حالت میں سفر کرنے سے ہمارا برا حال ہو گیا تھا۔ سمندری ہوا نے ہمارے جسموں پر نمک کی ایک تہہ قلم کی طرح چڑھا دی تھی جو سخت پریشان کر رہی تھی۔ سمندر کی کوئی لہر ہمارے اوپر سے گذرتی تو وہ مزید نمک کی تہہ چڑھا جاتی ہمارے رنگ سانولے ہو گئے تھے۔ آنکھوں میں حلقے پڑنے لگے تھے۔ میں کسی وقت

حوصلہ ہارنے لگتا تو کارلو اپنی باتوں سے دوبارہ میرے اندر نئی طاقت بھر دیتا۔ ایک دن سمندر پر دھوپ پھیلی تھی۔ اس کی چمک ہمیں حسب معمول پریشان کر رہی تھی۔ ہم پھر ناریل کا لنچ کر رہے تھے۔ یعنی ایک ایک ناریل ہمارے ہاتھ میں تھا۔ اس کا پانی پینے کے بعد اس کی گری کھا رہے تھے کہ اچانک ہمیں کچھ فاصلے پر سمندر میں ایک جزیرہ سا ابھرا ہوا دکھائی دیا۔ میں نے خوشی سے تقریباً چیخ کر کہا۔

"کارلو! زمین آگئی"۔

زمین کی قدر کھلے سمندر میں پہنچ کر ہی ہوتی ہے۔ کارلو نے اس طرف دیکھا تو بجائے خوش ہونے کے وہ پریشان ہو گیا۔ کہنے لگا "یہ زمین نہیں ویل مچھلی ہے"۔

میرے دیکھتے دیکھتے اس ویل مچھلی کی گردن سے پانی کا ایک فوارہ سا نکلا اور پھر وہ سمندر میں غوطہ لگا گئی۔ کارلو نے گھبرا کر کہا۔

"اپنے آپ کو رسی سے جکڑ کر لیٹ جاؤ۔ اس نے ہمیں دیکھ لیا ہے۔ وہ اب ہمارے نیچے آکر ہمیں الٹانے کی کوشش کرے گی"۔

ہم نے جلدی جلدی اپنے آپ کو رسیوں میں باندھا اور تختے سے چمٹ گئے۔ کوئی دو منٹ بعد تختہ اوپر کو اٹھا اور پھر وہ سمندر کی سطح سے کوئی پندرہ بیس فٹ اوپر کو اچھلا۔ ہمارے منہ سے خوف کے مارے چیخ نکل گئی۔ تختہ الٹنے کی بجائے بالکل اسی طرح سمندر کی لہروں پر آن گرا۔ کارلو چلایا۔

"اسی طرح لیٹے رہنا۔ ویل نے دیکھ لیا تو وہ اسے تباہ کر دے گی"۔

ہماری خوش قسمتی تھی کہ ویل دوبارہ ہمیں نہ دیکھ سکی اس کے خیال میں ہم تختے سے گر کر سمندر میں ڈوب چکے تھے۔ ہم بھی ویل کو نہ دیکھ سکتے تھے۔ لہریں بڑے زور سے ٹکرا رہی تھیں۔ کچھ دیر بعد سکون ہو گیا۔ کارلو نے سر اٹھا کر دیکھا اور بولا۔

"ویل نکل گئی ہے"۔

پہاڑ جتنی بڑی ویل مچھلی ضرور نکل گئی تھی لیکن ہمارے باقی بچے ہوئے کافی ناریل سمندر کی نذر ہو گئے تھے۔ اب کارلو کو بھی تشویش ہوئی۔ کہنے لگا۔

"ہمارے پاس صرف چار دن کی خوراک رہ گئی ہے۔ اب کوئی نہ کوئی ساحل
نظر آجانا چاہئے۔"

میں نے کہا۔ "کہیں ہم سمندر میں بھٹک تو نہیں گئے؟"

کہنے لگا۔ "رات کو ستارے دیکھ کر ہی بتا سکوں گا"۔

جب رات آئی تو ہم بے دم سے ہو کر تختے پر پڑے تھے۔ کارلو نے ستاروں
سے دیکھا۔ پھر آہستہ سے بولا۔

"ہم ٹھیک سمت کو جا رہے ہیں"

میں نے لیٹے ہی لیٹے دل میں خدا کا شکر ادا کیا۔ اب میری یہ حالت ہو گئی
کسی وقت دل چاہتا آہستہ سے سمندر میں پھسل جاؤں خدا جانے یہ سمندر کا طلسم
بات تھی کہ سمندر مجھے اپنی طرف کھینچنے لگا تھا۔ بلانے لگا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا کہ
لئے سمندر میں بڑا سکون ہے۔ سمندر میں گرتے ہی میری ساری تکلیفیں دور ہو جا
گی۔ لیکن اللہ نے ہماری بڑی مدد کی اور عین اسی وقت دور سے زمین کی کالی لکیر نظر
جب ہم زندگی سے بالکل مایوس ہو چکے تھے۔

سب سے پہلے یہ لکیر کارلو نے دیکھی۔ پھر اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے
۔ یہ سیاہ لکیر سمندری موجوں میں کسی وقت ڈوب بھی جاتی تھی۔ کارلو نے کہا "یہ
ہے" ضرور یہ مڈغاسکر کا ساحل ہو گا"

یہ لکیر آہستہ آہستہ پھیلتی جا رہی تھی۔ اب سمندر میں ہمیں لہروں کے ساتھ
اور جھاڑیاں بھی تیرتی نظر آنے لگی تھیں۔ کچھ بگلے بھی ہمارے اوپر سے اڑتے
گذر گئے۔ یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ ہم خشکی کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ کافی دیر
ہمارا تختہ لہروں پر بہتا رہا۔ اب لہروں کا زور اور رخ ساحل کی طرف ہو گیا تھا
ہمارے تختے کو بڑی تیزی سے ساحل کی طرف لے جا رہی تھی۔ درختوں کے جھنڈ
ہونے لگے۔ چٹانیں بھی نظر آنے لگیں۔ آخر سمندری لہروں نے ہمارے تباہ شدہ
اچھال کر ساحل کی گیلی ریت پر پھینک دیا۔ ہم تختے پر سے پھسل کر ریت پر اوندھے

اور وہیں پڑے رہے۔ جیسے ٹھنڈی زمین کا شکریہ ادا کر رہے ہوں کہ اس نے آخر
ہمیں اپنے ساتھ لگا لیا۔ پھر ہم ریت پر بیٹھ گئے۔ ایک نگاہ ساحل کے ساتھ ساتھ دور تک
پھیلے درختوں پر ڈالی۔ کارلو نے مجھے ایک لائٹ ہاؤس کا مینار دکھاتے ہوئے کہا۔
ہم کسی براعظم پر پہنچ گئے ہیں۔ یہ کوئی جزیرہ نہیں ہے"۔

===== ❑ ❑ =====

ہم ساحل کی ریت پر تھکے ہارے بیٹھے تھے کہ وہاں کچھ لوگ آ گئے۔ یہ حبشی
تھے مگر جنگلی نہیں تھے۔ ان میں سے کچھ نے نیکریں پہن رکھی تھیں اور سر پر ٹوپ
ہیٹ تھے۔ میرا ساتھی کارلو فرانسیسی زبان جانتا تھا۔ اس نے ان سے پوچھا کہ یہ کون
ملک ہے۔ ایک حبشی نے کہا۔ یہ موزمبیق کا ملک ہے کارلو نے انہیں اپنے خوف
سمندری سفر کی داستان مختصراً سنائی۔ وہ ہمیں اٹھا کر ایک قصبے میں لے گئے جہاں
کھانے پینے کو چیزیں دی گئیں۔ یہ لوگ بڑے نیک دل تھے۔ انہوں نے ہمیں تین
وہاں رکھا اور ہماری خوب خاطر مدارات کی۔ ان کی زبانی ہمیں پتہ چلا کہ جرمنوں
انگریزوں کی جنگ اوپر شمال میں بن غازی کے مقام پر لڑی جا رہی ہے۔ ہم اس
جنوب مشرقی افریقہ میں تھے جہاں جنگ کے اثرات نہ ہونے کے برابر تھے۔ تین دن
ہماری طاقت بحال ہو گئی تھی۔ کارلوس کہنے لگا۔

"یہاں سے سپین جانے کا ایک ہی راستہ ہے کہ ہم یہاں سے سوڈان جائیں۔
موریطانیہ سے ہوتے ہوئے مراکو پہنچیں۔ مراکو کی شمالی بندرگاہ تانجیر سے سپین بالکل
تھوڑے فاصلے پر ہے۔ درمیان میں آبنائے جبرالٹر ہے۔ مگر اس کے لئے ہمیں سا
وسطی افریقہ کے گھنے جنگلوں اور موریطانیہ کے صحرا سے گزرنا پڑے گا۔ جو بہت
کام ہے۔ مگر دوسرا کوئی راستہ نہیں ہے۔ اوپر شمال کی طرف جنگ ہو رہی ہے۔
سارے راستے بند ہوں گے۔"

میں بھی سوچ میں پڑ گیا۔ میرا ارادہ بھی یہی تھا کہ کارلو کے ساتھ سپین کے

ں میں شامل ہو جاؤں گا اور ان کے رسم و رواج اور رومانوی زندگی کا مطالعہ کروں
ونکہ میں نے ہسپانوی خانہ بدوشوں کے بارے میں بڑی دلچسپ رومانٹک باتیں سن
ھیں۔ اور پھر دل میں یہ خواہش بھی تھی کہ اس ملک کو دیکھوں گا جہاں مسلمانوں
ات سو سال حکومت کی تھی۔ جہاں مسلمان سائنس دانوں نے ایسے ایسے تجربات
ے اور سائنسی کارنامے انجام دیئے تھے کہ جن سے آج بھی یورپ فائدہ اٹھا رہا
یں غرناطہ، الحمراء اور مسجد قرطبہ دیکھنا چاہتا تھا۔ لیکن کارلو نے وہاں تک پہنچنے کی جو
بیان کی تھی وہ بڑی خطرناک ہی نہیں تھی بلکہ بہت حد تک ناممکن بھی تھی۔ ہم
ساتھ لے کر سمندری سفر تو کر سکتے تھے مگر آدم خوروں اور زہریلے سانپوں والے
جنگلوں اور سورج کی تپش میں جلتے ہوئے صحراؤں کو عبور نہیں کر سکتے تھے۔ اس
سفر کے واسطے روپوں کی بھی ضرورت تھی۔ جو ہمارے پاس نہیں تھے۔ میں نے کارلو
ورہ دیا کہ ہمیں سپین تک پہنچنے کے لئے کوئی دوسرا راستہ تلاش کرنا چاہئے۔ کارلو
ی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"دوسرا کوئی راستہ نہیں ہے۔ یہی ایک نزدیکی اور ممکن راستہ ہے۔ فکر نہ کرو۔ ہم
سامان اور اسلحہ لے کر چلیں گے۔"

جب یہ فیصلہ ہو گیا کہ ہم افریقہ کے سارے وسطی علاقے سے ہی گزر کر سپین تک
ی کوشش کریں گے تو اس کے لئے ہم نے پیسے جمع کرنے کا سلسلہ بھی بنا لیا۔ ہم
بندرگاہ پر کام کرنے لگے۔ کوئی دو ماہ بعد اتنی رقم اکٹھی ہو گئی جو ہمارے اخراجات
لئے کافی تھی۔ سب سے پہلے ہم نے ایک ایک رائفل اور ایک ایک پستول
ے۔ دو خچر بھی خرید لئے جن پر سوار ہو کر ہمیں یہ خطرناک سفر کرنا تھا۔ دو چار تھیلے،
ں اور خشک دودھ اور خشک گوشت کے ڈبے بھی ساتھ رکھ لئے اور ایک نقشہ بھی لیا
غور سے دیکھنے کے بعد کارلو نے جگہ جگہ نشان لگا دیئے۔ موزمبیق نام ہی کے ساحلی
ے ریل گاڑی ویلا کبرال تک جا کر ختم ہو جاتی تھی۔ یہاں سے آگے افریقہ کی سب
بڑی جھیل بناسا یا ملاوی جھیل تھی۔ جھیل پار کرنے کے بعد ہم ملاوی کے ملک میں

داخل ہو جاتے۔ وہاں سے ہمیں زمبابوے اور پھر زائر کے ممالک سے گذر کر نائجیریا
ہوتے ہوئے موریطانیہ اور شمال مغرب میں مراکو پہنچنا تھا۔ یہ اتنا طویل سفر تھا کہ آج بھ
میں افریقہ کا نقشہ دیکھتا ہوں تو حیرت میں گم ہو جاتا ہوں کہ ہم نے اتنے بڑے براعظم
خطرناک جنگلوں اور خونی صحراؤں میں اکیلے سفر کرنے کا ارادہ کیسے کر لیا۔

بہرحال ہم نے ارادہ ہی نہیں کیا تھا بلکہ اس پر عمل بھی شروع کر دیا تھا اور ٹرین
سوار ہو کر جھیل ملاوی کے مشرقی کنارے والے ویلا کبرال کے ریلوے سٹیشن پر آ
گئے۔ ابھی اس ملک کا نام نیا سالینڈ ہی تھا۔ یہاں سے ہم نے سب سے آخری ڈبے
سے اپنے خچروں کو اتارا اور جھیل نیاسا کی طرف روانہ ہو گئے۔ اب ہمیں جھیل پار
کے Living Stone نام کے قصبے سے زمبابوے کے بارڈر کے ساتھ ساتھ سفر کر
ہوئے وسطی افریقہ کے ملک زائر میں داخل ہونا تھا۔ اس ملک کے شروع میں جنگل
اور شمال کی طرف صحرا تھا۔

بہرحال ہم نے رات کو ایک جگہ آرام کیا۔ دوسرے دن نقشے کے مطابق اور د
کے لوگوں کی راہ نمائی میں جھیل نیاسا کے کنارے آ گئے۔ اس جھیل کا نام وکٹوریہ جھ
بھی تھا۔ اسے مشہور انگریز سیاح Living Stone نے دریافت کیا تھا اور یہ دریائے نیل
منبع بھی ہے ----- میں جانتا ہوں آپ اس تمہید سے ضرور بور ہو رہے ہوں گے لیکن
کریں آگے آپ کی دلچسپی کی اتنی باتیں اور واقعات آنے والے ہیں کہ آپ کسی
ششدر سے ہو کر رہ جائیں گے۔ صرف تھوڑی دیر کی بوریت برداشت کر لیں۔ کیو
ان تفصیلات کے بغیر میرا سفرنامہ مکمل نہیں ہوتا ----- جھیل وکٹوریہ بہت بڑی جھیل
اسے دیکھ کر خدا کی شان یاد آ گئی۔ میں حیران تھا کہ عین خشکی کے درمیان سمندر
وسیع جھیل کہاں سے پیدا ہو گئی۔ جھیل کو ہم نے ایک بہت بڑے بجرے کے ذریعے
کیا اور اسے پار کرتے ہوئے کئی گھنٹے لگ گئے۔ اس قصبے میں ہم نے رات ایک سرا
میں بسر کی۔ سرائے میں ایک بوڑھے نیگرو سے ملاقات ہوئی۔ اس نے ہمیں مشورہ دیا
ہمیں زائر جانے کی بجائے وہیں سے اوپر تنزانیہ سے ہوتے ہوئے نیروبی پہنچنے کی کو

ی چاہیے۔ کیونکہ زائر کے راستے میں ایسے ایسے گنجان جنگل ہیں جہاں آج تک کوئی
ن نہیں گیا اور جہاں بڑے وحشی جنگلی قبیلے آباد ہیں کارلو مجھے ایک طرف لے گیا اور
ے لگا۔
نیروبی کینیا میں ہے اور وہاں انگریزوں کی حکومت ہے اور میری اطلاع کے مطابق
ہو رہی ہے۔ ہمیں وہاں پہنچتے ہی پکڑ لیا جائے گا"۔
میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ کارلو انگریزی علاقے کی طرف جاتے ہوئے گھبرا رہا ہے۔
کی کوئی وجہ ضرور تھی جو مجھے معلوم نہیں تھی ہو سکتا ہے وہ کوئی مفرور قاتل ہو۔
ال میں کارلو کے رحم وکرم پر تھا اور اکیلا کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے لامحالہ کارلو
تجویز کیے ہوئے پروگرام کے مطابق ہی سفر کرنا تھا۔ چنانچہ ہم نیروبی کی سمت جانے کی
ے Living Stone سے زائر کی طرف روانہ ہو گئے۔ ہم بارڈر سے ذرا ہٹ کر ایک
ں میں سے گذر رہے تھے۔ راستے میں ایک دریا آ گیا جس کا پاٹ زیادہ چوڑا نہیں تھا۔
کا پانی گدلا اور تیز تھا۔ یہاں ایک ملاح نے اپنی کشتی پر ہمیں دریا پار کرایا اور ہمیں
ے جنگل کے راستے سفر کرنے کی بجائے مشورہ دیا کہ ہم دریا کے کنارے کنارے اوپر
طرف جائیں مگر کارلو نے پھر وہی ضد کی کہ اس طرح سفر لمبا ہو جائے گا اور ہم جنگ
لے علاقے میں پہنچ جائیں گے۔
چنانچہ ہم دریا کو چھوڑ کر جنگل میں داخل ہو گئے۔ ہم نے کھانے پینے کی کافی چیزیں
پنے ساتھ رکھ لی ہوئی تھیں اور خچر برابر ہمارا ساتھ دے رہے تھے۔ دو دن تک ہم
یک براعظم افریقہ کے ان گھنے وسطی جنگلوں میں سفر کرتے رہے۔ راستے میں ہم نے
ا سانپ مارے۔ ایک شیر کو بھی زخمی کیا۔ ابھی تک ہمیں کسی وحشی قبیلے کے لوگ
ہا ملے تھے۔

تیسرے دن ہم خچروں سے اتر کر جنگل کی دشوار گذار جھاڑیوں کو کاٹتے ہوئے قدم
م آگے بڑھ رہے تھے کہ ہمیں اپنے بائیں جانب مہاگنی کے سیاہ کالے اور گنجان
نتوں کے درمیان ایک چھوٹی سی کچی سڑک نظر پڑی۔ ہم جلدی سے وہاں آئے اور

سڑک کو غور سے دیکھنے لگے۔ میں نے کہا۔

"خدا کا شکر ہے سڑک تو آئی اب ہم خچروں پر بیٹھ کر سفر کر سکیں گے"

مگر کارلو خوش ہونے کی بجائے کچھ پریشان سا ہو گیا تھا۔ وہ سڑک پر ایک جگہ دھبے کو جھک کر غور سے دیکھ رہا تھا۔ میری طرف اشارہ کر کے بولا۔

"یہ ڈیزل کا نشان ہے"۔

میں نے کہا۔ "کوئی شکاری ادھر سے جیپ پر گذرا ہو گا۔"

کارلو نفی میں سر ہلا کر بولا۔

"نہیں یہ ٹرک کے پہیوں کے نشان ہیں"۔

ابھی ہم ان نشانوں کا معائنہ ہی کر رہے تھے کہ پیچھے سے کسی ٹرک کے انجن کی آواز سنائی دی۔ کارلو میرا بازو پکڑ کر مجھے کھینچتا ہوا درختوں کے پیچھے لے گیا۔ یہاں ہمارے بھی جھاڑیوں کے پتے کھا رہے تھے۔ ہماری آنکھیں سڑک پر لگی تھیں۔ ٹرک کی آواز قریب آ رہی تھی۔ پھر ہم نے دیکھا کہ ایک بڑا سا ٹرک جس کی چھت نہیں تھی سڑک پر نمودار ہوا۔ اسے ایک گورے رنگ کا مونچھوں والا آدمی چلا رہا تھا۔ اس نے سر پر چیتے کی کھال کا ہیٹ پہن رکھا تھا۔ ٹرک میں پندرہ بیس حبشی اس حالت میں بیٹھے تھے کہ دو گورے رنگ کے آدمی رائفلیں ہاتھوں میں لئے ان کے سر پر کھڑے تھے۔ ٹرک گذرا تو کارلو کسی گہری سوچ میں گم ہو گیا۔ پھر میری طرف دیکھ کر بولا۔

"ہم ایک ایسے جرائم پیشہ لوگوں کے علاقے میں آ گئے ہیں جو آدم خور جنگلیوں سے زیادہ خونخوار ہیں"۔

میں اس کا منہ تکنے لگا کہ یہ کس نئی مصیبت کا سامنا ہو گیا۔

===== □ □ =====

میں اور میرا ہسپانوی ساتھی کارلو وسطی افریقہ کے گھنے جنگل میں گنجان درختوں کے نیچے جھاڑیوں میں چھپ کر بیٹھے تھے۔ کارلو جلدی سے اٹھ کر اس طرف گیا جدھر سے ابھی ابھی ٹرک گذرا تھا پھر وہ واپس آ کر بیٹھ گیا اور اپنی چمکیلی آنکھوں سے ماحول کا جائزہ لینے لگا۔ میرے ایک سوال کے جواب میں وہ بولا۔

"میں نے سن رکھا ہے کہ افریقہ کے جنگلوں میں کہیں کہیں جرائم پیشہ گوروں نے اپنے ناجائز کاروبار کے ایسے اڈے بنا رکھے ہیں جہاں وہ لوگوں کو اغوا کر کے لاتے ہیں۔ پھر انہیں یا تو بھاری تاوان لے کر چھوڑتے ہیں یا انہیں ہلاک کر ڈالتے ہیں۔ انہوں نے گرد لوگوں کو زبردستی غلام بھی بنا رکھا ہے۔ میرا خیال ہے ہم بھٹک کر ایسے ہی کسی جرائم پیشہ علاقے میں نکل آئے ہیں"۔

"ہمیں فوراً یہاں سے واپس چل دینا چاہئے۔" میں نے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ کارلو بولا۔

"میں بھی یہی سوچ رہا ہوں"۔

اس کے فوراً بعد ہم دونوں اس راستے پر واپس جا رہے تھے جدھر سے چل کر ہم ان گنجان درختوں کے ذخیرے میں آئے تھے۔ ابھی ہم نے تھوڑا فاصلہ ہی طے کیا تھا کہ خدا جانے کدھر سے مشین گن کا فائر آیا اور درختوں کی ٹہنیاں ٹوٹ کر ہم پر گریں۔ ہم فوراً زمین پر لیٹ گئے۔ کارلو نے ریوالور نکال لیا ہم کہنیوں کے بل رینگنے لگے۔ مشین گن کا دوسرا برسٹ فائر ہوا۔ گولیاں ہمارے قریب ہی دائیں بائیں آ کر گریں۔ کارلو نے گھٹنوں

کے بل بیٹھ کر پیچھے کو دو چار فائر کر دیئے۔ مگر ہم جرائم پیشہ لوگوں کے نرغے میں آچکے تھے۔ چھ سات آدمی برین گنیں تانے جھاڑیوں کے پیچھے سے نمودار ہوئے اور ہمیں ہاتھ اٹھانے کا حکم دیا۔ وہ سب گورے تھے۔ سروں پر چیتے کی کھال کے شکاری ہیٹ تھے۔ کمر کے ساتھ لمبے چھرے لٹک رہے تھے۔ تقریباً سبھی کی بڑی بڑی مونچھیں تھیں۔ میرے پاس پستول وغیرہ کچھ بھی نہیں تھا۔ کارلو نے ریوالور پھینک دیا۔ ہم نے ہاتھ اوپر اٹھا لئے ۔ اسی وقت ہمارے ہاتھ پیچھے باندھ دیئے گئے اور ہمیں جنگل میں ایک طرف دھکیلا جانے لگا۔ کچھ دور تک یہ لوگ ہمیں درختوں میں چلاتے رہے پھر چھوٹے چھوٹے ٹیلے آگئے۔ یہاں جنگل میں چھوٹی سی کچی سڑک پر ایک جیپ کھڑی تھی۔ ہماری آنکھوں پر پٹی باندھ کر ہمیں جیپ میں بٹھا دیا گیا۔ جیپ نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہو گئی۔ جنگل میں کتنے ہی موڑ گھومنے کے بعد ایک جگہ جیپ رکی تو ہماری آنکھوں سے پٹی اتار دی گئی۔ میں نے دیکھا کہ جیپ اونچی خاردار دیوار کے سامنے گیٹ کے پاس کھڑی تھی ۔ گیٹ بھی خاردار تاروں والا تھا۔ اندر ایک بہت بڑا احاطہ تھا۔ جہاں جگہ جگہ درختوں میں جھونپڑے اور لکڑی کے کیبن بنے ہوئے تھے۔ ان کے باہر کہیں کہیں حبشی غلام کام کر رہے تھے۔ ان کے پیروں میں لوہے کے موٹے موٹے کڑے پڑے تھے۔ ہمیں ایک کیبن میں لے جا گیا۔ جہاں ایک سفاک شکل والا بھاری بھرکم گورا آدمی لکڑی کی میز پر دونوں ٹانگیں رکھے پائپ پی رہا تھا۔ اس کی بڑی بڑی گھنی مونچھیں تھیں۔ اس نے شکاریوں والا لباس پہن رکھا تھا۔ کمر میں پستول لگا تھا۔ میز پر ایک برین گن رکھی تھی۔ اس نے ہمیں گھور کر سر سے پاؤں تک دیکھا۔ ہماری تلاشی پہلے ہی لی جا چکی تھی۔ جو تھوڑا بہت اسلحہ اور روپ پیسے ہمارے پاس تھے وہ انہوں نے اپنے قبضے میں کر لئے تھے۔ یہ گورا اس گروہ کا سرغ تھا اور اسے وہاں چارلی کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ ہمیں تین دن تک ایک گڑھے میں ڈال دیا گیا جہاں اوپر سے رسی کی مدد سے ہمیں کھانے کے لئے ڈبل روٹی پانی ملتا تھا۔ اس کے بعد صبح سے شام تک ایک درخت کے تنے سے باندھ کر رکھا گیا۔ ہمیں پینے کو پا تک نہ دیا گیا۔ اس کے بعد چارلی نے ہمارا الگ الگ انٹرویو کیا۔ وہ یہ معلوم کرنا چاہتا

کہ کیا ہمارے ایسے لواحقین ہیں جو ہماری رہائی کے عوض تاوان ادا کر سکیں؟ جب چارلی کو پتہ چلا کہ میں ایک مفلوک الحال آوارہ گرد لڑکا ہوں اور کارلو ایک سابق بحری قزاق ہے جو قزاقی سے توبہ کر کے واپس اپنے وطن سپین جا کر شریفانہ زندگی بسر کرنا چاہتا ہے تو اس نے کارلو کو اسی روز درخت سے باندھا اور میری آنکھوں کے سامنے برین گن کا برسٹ مار کر ہلاک کر دیا۔ میں تو سکتے میں آگیا۔ شاید اب میرے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک کیا جانے والا تھا۔ مگر چارلی کے حکم پر میرے ایک پاؤں میں لوہے کا کڑا یعنی بیڑی ڈال کر مجھے ایک جگہ زمین کھود کر صاف کرنے کے کام پر لگا دیا گیا۔ کارلو اتنی جلدی مر جائے گا یا مار دیا جائے گا میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ میں جرائم پیشہ خونی لوگوں میں تنہا بے یارومددگار ہو کر رہ گیا تھا۔ جس جگہ ان جرائم پیشہ گوروں نے اپنا اڈہ بنایا ہوا تھا اس کی ایک جانب تو اونچی پہاڑی تھی جس کے اوپر دو مشین گن پوسٹیں بنی تھیں یہاں چوبیس گھنٹے آدمی پہرہ دیتے تھے۔ اور باقی تین اطراف کو ایک دریا نے اپنے گھیرے میں لے رکھا تھا جس کی سرخ دلدلی ریت پر پندرہ سولہ مگرمچھ ہر وقت لیٹے رہتے تھے۔ وہاں کوئی بگلہ بھی آکر بیٹھتا تو مگرمچھ چشم زدن میں اسے ہڑپ کر جاتے۔ احاطے کے اردگرد اونچی خاردار دیوار تھی جس میں ہر وقت بجلی کا کرنٹ جاری رہتا تھا۔ یعنی وہاں سے فرار ناممکن تھا۔ صرف دریا کا راستہ کھلا تھا مگر اس طرف آدم خور مگرمچھوں کا قبضہ تھا۔ سنگدل چارلی ان مگرمچھوں کے آگے کئی مفرور غلام ڈال کر انہیں آدم خور بنا چکا تھا۔ وہاں دوسرے حبشی غلام بھی کام کرتے تھے مگر ہمیں ایک دوسرے سے بات کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ رات کو مجھے ایک جھونپڑی میں دھکیل کر زنجیر سے باندھ دیا جاتا۔ میں سوچتا کہ یہ کس نئی مصیبت میں پھنس گیا ہوں اور جانے اس عذاب سے کب نجات ملے گی۔ اسی طرح دو مہینے گزر گئے۔ پھر بارشیں شروع ہو گئیں۔ ایسی موسلادھار بارشیں ہوتیں کہ میں نے برما کے جنگلوں میں بھی ایسی بارشیں نہیں دیکھی تھیں۔ مجھے کچھ علم نہیں تھا کہ جنگ کی کیا صورتحال ہے۔ ایک روز میں چارلی کے کیبن کے باہر کیاریوں میں تازہ مٹی ڈال رہا تھا۔ اندر ریڈیو کھلا تھا۔ انگریزی میں خبریں ہو رہی تھیں۔ میں نے کان لگا دیئے۔ معلوم ہوا کہ

ہیروشیما پر امریکہ نے کوئی بڑا زبردست ایٹم بم گرا دیا ہے۔ جاپان نے ہتھیار ڈال دیئے ہیں اور اتحادی فوجیں برلین میں داخل ہو گئی ہیں۔ مجھے ایک اطمینان ہوا کہ اب جاپانی مجھے نہیں پکڑ سکیں گے ان کی قید سے ہمیشہ کے لئے آزاد ہو گیا ہوں۔ مگر ان جرائم پیشہ لوگوں کی قید نے میری زندگی کو ایک عذاب میں تبدیل کر دیا تھا۔ نہ میں احاطے سے باہر جا سکتا تھا۔ نہ کسی سے بات کر سکتا تھا۔ فرار کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ صرف ایک دریا رہ گیا تھا جس پر آدم خور مگرمچھوں کی حکمرانی تھی ----- اس دریا کی طرف سے ہفتے میں ایک بار ایک بوڑھا حبشی ایک پندرہ سولہ سال کی نیگرو لڑکی کے ساتھ کشتی میں تازہ پھل اور سبزیاں وغیرہ لے کر آتا تھا۔ میں وہاں کے قیدی غلاموں میں سب سے کم عمر اور صاف رنگت کا تھا۔ چنانچہ یہ حبشی میرے قریب سے گزرتے ہوئے مجھے غور سے دیکھا کرتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں میرے لئے ہمدردی ہوتی تھی۔ ایک روز شام کے وقت میں دریا کنارے والی خاردار باڑ کے پاس جنگلی گھاس کاٹ رہا تھا کہ میں نے نیگرو لڑکی کو دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں پلاسٹک کا خالی تھیلا تھا اور وہ شام کی ملگجی دھند میں تھوڑی تھوڑی دیر بعد پیچھے مڑ کر دیکھ لیتی تھی۔ وہ جھاڑیوں کی اوٹ لیتی سیدھی میرے پاس آئی اور ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں کہا۔

"یہاں سے بھاگو گے؟"

میں اس کا منہ تکنے لگا۔ پھر اثبات میں سر ہلایا۔ وہ یہ کہہ کر خاردار باڑ کی طرف چل دیا۔ "کل رات اپنے جھونپڑے میں تیار رہنا"۔

میں سمجھ نہ سکا کہ یہ اچانک نیکی کا فرشتہ کہاں سے آ گیا۔ میرے دل میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔



میرا یہ سفر ان سیاحتوں کا ایک حصہ ہے جو میں نے ملک ملک کے شہروں، صحراؤں، خوفناک جنگلوں اور سمندروں میں کی۔ یہ میری نوجوانی کا زمانہ تھا اور میرے اندر مصیبتوں اور تکلیفوں کو برداشت کرنے کی زبردست صلاحیت موجود تھی۔ یہ ایک طرح کی خانہ بدوشی تھی جس نے مجھے بہت کچھ سکھایا۔ زندگی کے گہرے حقائق سے روشناس کیا۔ مجھے ایسے ایسے تجربے حاصل ہوئے جو میں گھر بیٹھ کر کبھی حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ ان تجربوں سے ایک یہ بات بھی مجھ پر واضح ہوئی کہ ایک تو ہماری مادی یعنی جسمانی زندگی ہے مگر ایک روحانی یا غیر مادی زندگی بھی ہے۔ اسے ہم دیکھ تو نہیں سکتے۔ مگر کبھی کبھی اس کے بڑے واضح اشارے بلکہ ثبوت ہمیں ضرور مل جاتے ہیں ---- یہ تمہید میں اس لئے باندھ رہا ہوں کہ میری آپ بیتی میں اب ایک ایسی شخصیت نمودار ہونے والی ہے جس کا ہماری مادی زندگی سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ وہ ضرور کوئی روح ہی تھی۔ لیکن اتنا مجھے یقین ہے اور اس وقت بھی تھا کہ یہ شخصیت غیر مادی ہے اور ہماری دنیا سے اس کا صرف اتنا ہی تعلق ہے کہ وہ کبھی کبھی ہم سے رابطہ قائم کر لیتی ہے۔

اب میں اپنی کہانی وہیں سے شروع کرتا ہوں جہاں میں نے اسے چھوڑا تھا۔ یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ میں وسطی افریقہ کے ایک گھنے جنگل میں عادی مجرموں کے ایک خطرناک گروہ کے ہتھے چڑھ گیا تھا جو ہر طرح کے جرائم کرتے تھے۔ میرے علاوہ وہاں کئی دوسرے نیگرو بھی تھے اور ہم سب سے صبح سے شام تک جانوروں کی طرح کام لیا جاتا۔ کھانے کو سوائے سوکھی ڈبل روٹی اور پانی کے اور کچھ نہ ملتا۔ ہمیں جنگل میں جس مقام پر نظر میں رکھا گیا تھا اس کی ایک جانب بالکل سیدھی دیوار والی ایک پہاڑی تھی اور باقی

تینوں سمت وہ خونی دریا تھا جس میں آدم خور مگرمچھ ہروقت چلتے پھرتے رہتے تھے۔ جیسا کہ آپ پڑھ چکے ہیں کہ مجھے وہاں قید میں پڑے دو تین مہینے گذر گئے تھے اور ایک نیگرو لڑکی اپنے دادا کے ساتھ ہفتے میں ایک بار کشتی میں بیٹھ کر وہاں سبزیاں اور دودھ وغیرہ دینے آتی تھی۔ یہ دونوں مسلمان تھے اور انہیں کسی طرح معلوم ہو گیا تھا کہ میں بھی مسلمان لڑکا ہوں۔ چنانچہ انہوں نے مجھے وہاں سے نکالنے کا فیصلہ کر لیا۔ پھر ایک روز نیگرو لڑکی نے میرے قریب سے گذرتے ہوئے سرگوشی میں کہا کہ آج رات تیار رہنا۔ ہم تمہیں یہاں سے نکالنے آئیں گے اب میں اپنی آپ بیتی آگے بیان کرتا ہوں۔

میں سوچتا کہ یہ لڑکی اور اس کا بوڑھا دادا مجھے اس جگہ سے کیسے باہر نکالیں گے؟ وہ احاطے کے گیٹ سے آتے جاتے تھے جہاں جرائم پیشہ گروہ کے پہریدار لائٹ مشین گنیں لئے ہروقت موجود ہوتے تھے۔ اس رات مجھے نیند نہ آئی۔ میں اپنے جھونپڑے میں جاگتا رہا۔ آدھی رات کے وقت جب جنگل پر سناٹا چھایا تھا آہٹ سی ہوئی۔ میرے جھونپڑے کا دروازہ نہیں تھا۔ باہر ستاروں کی بہت ہی دھیمی غبار کی طرح کی دھندلی روشنی میں مجھے ایک سایہ اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ یہ وہی نیگرو لڑکی تھی۔ "میرے ساتھ آؤ" اس نے کہا۔ وہ مجھے احاطے کی جنوبی دیوار کی طرف لے گئی۔ یہاں خاردار باڑھ کے قریب اس نے گھاس کے ایک ڈھیر کو ہٹا دیا۔ پھر جھک کر مٹی ہٹانے لگی۔ نیچے ایک تختہ تھا۔ اس نے تختہ اٹھایا تو وہاں ایک تاریک زینہ دھندلا سا نظر پڑا۔ لڑکی مجھے سرنگ میں سے گذار کر دریا کنارے لے آئی جہاں کشتی میں اس کا بوڑھا دادا تیار بیٹھا تھا۔ میں جلدی سے کشتی میں سوار ہو گیا۔ دو مگرمچھ کنارے سے لپک کر کشتی کی طرف بڑھے' بوڑھے نیگرو نے ٹین کے ڈبے میں بھرا ہوا کوئی تیل دریا میں انڈیل دیا جس کی ناگوار تیز بو کی وجہ سے مگرمچھ تیزی سے واپس بھاگ گئے۔ دریا کے دوسرے کنارے پر پہنچے ہی تھے کہ جرائم پیشہ مجرموں کے احاطے میں الارم چیخ اٹھا۔ ساتھ ہی دریا پر سرچ لائٹ کی روشنی پڑی اور ساتھ ہی دریا میں سٹیمر کے سٹارٹ ہونے کی آواز آئی۔ بوڑھے نیگرو نے کشتی کھینچ کر جھاڑیوں میں چھپا دی اور مجھے کہا۔

"یہاں سے شمال مغرب کی طرف بھاگ جاؤ۔ آگے دو دن کا سفر ہے۔ موریطانیہ کی سرحد آجائے گی۔ وہ مسلمان ملک ہے۔ ہم بھی مسلمان ہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ تم بھی مسلمان ہو۔ اب نکل جاؤ یہ لوگ تمہارا پیچھا کریں گے۔ اب جو خدا کو منظور۔"

اور میں نے رات کے اندھیرے میں کاندھے تک آتی ہوئی جھاڑیوں میں دوڑ لگا دی۔ تھوڑی دیر بعد جرائم پیشہ لوگوں کا سٹیمر دریا کے اس کنارے سے پر آگیا جس کے ساتھ ساتھ میں جنگل میں بھاگ رہا تھا۔ وہ میرے پیچھے لگ گئے۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد جنگل کی فضا فائرنگ کی آواز سے گونج اٹھتی۔ مگر میں رکا نہیں۔ اندھا دھند بھاگتا گیا۔ وہ لوگ جنگل کے چپے چپے سے واقف تھے۔ چنانچہ میرے گرد ان کا گھیرا تنگ ہو رہا تھا۔ دراصل انہوں نے مجھے دریا کنارے بھاگ کر جنگل میں داخل ہوتے دیکھ لیا تھا۔ دوڑتے دوڑتے میرا سانس پھول گیا۔ جنگل میں میکلوڈ روڈ ایسی کوئی سڑک نہیں ہوتی کہ جس پر آپ کسی اتھلیٹ کی طرح دوڑتے چلے جائیں۔ یہاں قدم قدم پر جھاڑیاں' اونچی گھاس اور درخت اور طرح طرح کے جھاڑ جھنکاڑ میرے راستے میں حائل ہو رہے تھے۔ میں سخت تھک گیا۔ اچانک سامنے درختوں کے درمیان ایک چھوٹی سی کھلی جگہ آگئی۔ جہاں ایک کنواں بھی تھا۔ میں کنوئیں کے پاس بیٹھ کر سانس درست کرنے لگا۔ مجھے سخت پیاس لگ رہی تھی۔ فائرنگ کی آواز ذرا ہلکی سی آ رہی تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ میرا پیچھا کرنے والے خونی مجھ سے کافی فاصلے پر ہیں۔ اردگرد بڑے گھنے درخت تھے۔ کنوئیں کی منڈیر پر ٹین کا ایک ڈبا پڑا تھا جس کے ساتھ باریک رسی بندھی تھی۔ میں نے کنوئیں میں جھانک کر دیکھا مجھے وہاں پانی نظر نہ آیا۔ یہاں اندھیرا اور گہری خاموشی تھی۔

میں نے اللہ کا نام لے کر کنوئیں میں ٹین کا ڈبا ڈال دیا۔ کنوئیں میں پانی موجود تھا۔ پانی نکال کر چکھا۔ وہ تازہ اور خوش مزہ تھا۔ جلدی جلدی پانی پیا۔ کچھ سر پر ڈالا وہاں سے بھاگنے ہی والا تھا کہ اچانک ایک سفید انسانی ہیولا میرے سامنے آن کھڑا ہوا۔ دہشت کے مارے میں وہیں ساکت ہو کر رہ گیا۔ اس انسانی ہیولے کا چہرہ ہاتھ پاؤں کچھ بھی نظر نہیں آتا تھا۔ اس کا قد اتنا لمبا تھا کہ سر درختوں کی ٹہنیوں کو چھو رہا تھا۔ میں نے دل میں آیت

الکرسی پڑھنی شروع کر دی۔

"مجھے پانی پلاؤ"

یہ ایک خشک اور گہری انسانی آواز تھی جو اسی انسانی ہیولے کی ہو سکتی تھی۔ یہ سخت خوف زدہ تھا۔ اس نے پھر آواز دی۔

"مجھے پیاس لگی ہے۔ پانی پلاؤ"۔

شاید یہ آیت الکرسی کے ورد کا اثر تھا کہ میرے اندر حوصلہ پیدا ہو گیا اور خوف کافی حد تک دور ہو گیا۔ میرے ہاتھ خود بخود ڈبے کی طرف بڑھے اور کنوئیں میں سے پانی نکال کر کنوئیں کی منڈیر پر رکھ دیا۔ انسانی ہیولے نے جھک کر اپنا چہرہ ڈول کے سامنے لگا دیا۔ ایک سیکنڈ بعد ڈبہ خالی تھا۔ بولا۔

"اور پانی پلاؤ۔"

وہ پانی کے بھرے ہوئے پندرہ سولہ ڈبے پی گیا۔ پھر اپنی پر اسرار آواز میں مجھ سے مخاطب ہوا۔

"تم نے میری برسوں کی پیاس بجھائی ہے۔ میں جس کو پانی پلانے کے لئے کہتا وہ یا بے ہوش ہو جاتا یا چیخ مار کر بھاگ جاتا تھا۔ تم بڑے بہادر لڑکے ہو۔ آج سے تم میرے دوست ہو"۔

اس کی آواز انسانی تھی۔ اگرچہ شکل نظر نہیں آتی تھی۔ میرا کچھ حوصلہ بڑھا۔ اس کے ساتھ ہی جنگل میں فائر کی آواز آئی۔ یہ آواز بڑے قریب سے آئی تھی۔ میں بھاگنے لگا تو انسانی ہیولے نے کہا۔

"خدا حافظ!"

اور وہ غائب ہو گیا۔ مجھے جرائم پیشہ لوگوں کی آوازیں سنائی دینے لگی تھیں۔ وہ میرے قریب پہنچ گئے تھے۔ وہ دھڑا دھڑ گولیاں چلا رہے تھے۔ جو درختوں کی شاخوں کو توڑتی ہوئی میرے سر کے اوپر سے گذر رہی تھیں۔ سمجھ گیا کہ اب بچاؤ کی کوئی صورت نہیں ہے۔ پھر بھی جان بچانے کے واسطے بھاگتا چلا گیا۔ میرا پاؤں ایک پتھر سے ٹکرایا۔ اور

منہ کے بل زمین پر گر پڑا۔ ابھی سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ میری جان کے دشمن، جرائم پیشہ قاتل گولیاں چلاتے میرے سر پر پہنچ گئے۔ انہوں نے اپنی رائفلوں اور برین گنوں کا رخ میری طرف کر دیا۔



یہ چار جرائم پیشہ قاتل تھے۔ ان کی برین گنوں کا رخ میری طرف تھا چہروں پر
دلانہ وحشت تھی۔ ایک پیشہ ور قاتل جھاڑیوں میں چلا آرہا تھا۔ یہ میری خوش قسمتی
کہ انہوں نے مجھے وہیں گولیوں سے چھلنی نہیں کیا۔ ان کے لئے یہ ایک معمولی بات
اور حالات کا تقاضا بھی یہی تھا۔ میں اپنی جان بچ جانے پر خوش ہو رہا تھا اور انہوں نے
وہیں درخت کے ساتھ لٹکا کر پھانسی دینے کا پروگرام بنا لیا تھا۔

پانچواں آدمی ان کا سرغنہ تھا۔ اس نے آتے ہی مجھے زدوکوب کرنا شروع کر دیا۔
وہیں کھڑے کھڑے جرمن یا فرانسیسی زبان میں کچھ کہا۔ فوراً دوسرے آدمیوں نے ا
درخت کی اونچی شاخ پر رسی پھینکی۔ ایک آدمی درخت پر چڑھ گیا۔ دیکھتے دیکھتے پھان
پھندا تیار ہو گیا۔ ظاہر ہے یہ ساری خاطرداریاں میرے لئے ہی ہو رہی تھیں۔ یوں
موت کئی بار میرے قریب سے ہو کر گزر گئی تھی۔ لیکن اس بار بچنے کی کوئی امید نہ
تھی۔ میں نے اپنے آپ کو اللہ کی رضا کے سپرد کر دیا۔ اگر خدا نے میرے موت ا
طرح لکھی ہے تو مجھے قبول کر لینا چاہئے۔ میں دل ہی دل میں کلمہ شریف پڑھنے لگا۔
نہتا تھا۔ وہ پانچ عادی مجرم تھے۔ مجھ سے بڑے تھے۔ ان کے پاس سٹین گنیں تھیں۔
بھاگ بھی نہیں سکتا تھا۔ انہوں نے میرے ہاتھ پاؤں رسی سے باندھے اور دو آدمیوں
اٹھا کر مجھے اوپر درخت کی ٹہنی پر بٹھا دیا۔ میرے گلے میں پھندا ڈالا دیا گیا۔ بس اب
ذرا سا دھکیل کر نیچے گرانے کی دیر تھی کہ ایک زور دار جھٹکا لگتا اور دوسرے لمحے م
لاش جھول رہی ہوتی۔ موت کے خوف سے میرا جسم سرد پڑ گیا۔ آنکھوں میں سب

ہیں گھومنے لگیں۔ کانوں میں شائیں شائیں کی آوازیں آنے لگیں۔ نیچے سے کسی نے
واز دی۔ اس کے ساتھ ہی جو قاتل میرے پاس ٹہنی پر پاؤں لٹکائے بیٹھا تھا اس نے مجھے
ھکا دے دیا۔ میرے حلق سے چیخ نکل گئی۔
میں درخت کی شاخ سے گر پڑا۔ مجھے ایک شدید جھٹکا لگا اور میں جھولنے لگا۔ میں
نے آنکھیں بند کر لی تھیں مجھے اپنے نیچے سخت زمین محسوس ہوئی میں نے جلدی سے
نکھیں کھول دیں میں زمین پر گر پڑا تھا۔ رسی ٹوٹ گئی تھی۔ شاید پھندا ابھی تک میری
گردن میں تھا۔ میرے قاتل چیخ چیخ کر اس آدمی کو برا بھلا کہہ رہے تھے جس نے میرے
گلے میں پھندا ڈال اتھا اور جو ابھی تک درخت کی شاخ پر ہی بیٹھا تھا۔ میں خود حیران تھا
ہ بچ کیسے گیا؟ رسی بڑی پکی تھی اور نائلون کی تھی۔ مگر اللہ کو میری زندگی منظور تھی۔
مجھے ایک بار پھر اٹھا کر درخت پر چڑھانے لگے۔ اچانک شیر کی خوفناک دھاڑ سے جنگل
گونج اٹھا۔ شیر کی غضبناک آواز اتنے قریب سے آئی تھی کہ جن آدمیوں نے مجھے پکڑ
رکھا تھا وہ مجھے چھوڑ کر بھاگے۔ میرے بدن میں پہلے ہی جان نہیں رہی تھی۔ اب شیر کی
دھاڑ نے مزید جان نکال دی۔ پھر بھی میں نے ایک طرف دوڑنے کی کوشش کی مگر میں
اپنی جگہ پر ساکت ہو کر رہ گیا۔

افریقہ کا بہت بڑے سر والا پندرہ فٹ لمبا شیر میرے قریب آگیا تھا۔ جو لوگ زمین پر
تھے وہ شیر پر گولیاں برسانے لگے۔ شیر نے ان کی طرف چھلانگ لگائی اور پھر گہرا سناٹا چھا
گیا۔ صرف شیر کے غصے میں غرانے کی آواز آرہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ شیر اپنے بادامی
رنگ کے گھنے بالوں والا بھاری بھرکم سر اٹھائے بڑی شان سے میری طرف بڑھ رہا ہے۔
میں خوف کے مارے بیٹھ گیا۔ شیر نے سر اٹھا کر اوپر درخت کی ٹہنی کو دیکھا۔ ٹہنی پر ابھی
تک وہ آدمی بیٹھا ہوا تھا جس نے میری گردن میں پھندا ڈالا تھا۔ اس کے پاس صرف ایک
پستول تھا۔ اس نے شیر پر پستول کا فائر کر دیا۔ شیر زور سے اچھلا اور اسے پنجہ مار کر نیچے
گرا لیا۔ اس قاتل کا جبڑا ایک طرف سے اڑ گیا تھا اور وہ زمین پر بے ہوش پڑا تھا۔ شیر
نے اپنی بڑی بڑی زردی مائل سرخ آنکھوں سے گھور کر دیکھا اور پھر اپنے بدن کو لچکاتا

درختوں میں غائب ہو گیا۔ شاید خدا نے اس شیر کو میری جان بچانے کے لئے بھیجا تھا۔ شیر
کے جانے کے کچھ دیر بعد تک میں اسی طرح مبہوت سا ہو کر بیٹھا رہا۔ پھر اپنے حواس
سنبھالا۔ اس طرف گیا جدھر شیر نے چار جرائم پیشہ لوگوں پر چھلانگ لگائی تھی۔ وہ چاروں
کے چاروں قاتل اس حالت میں گھاس پر پڑے تھے کہ ان کے دل کی حرکت بند ہو چکی
تھی۔ ان کا اسلحہ قریب ہی پڑا تھا۔ شاید وہ شیر کی دہشت سے مر گئے تھے۔ میں
نکال سکتا تھا میں نے ایک سٹین گن اٹھالی۔ کچھ میگزین بھی اٹھا لئے۔ پھر گردن میں سے
پھندا نکال کر پرے پھینکا۔ جان بچ جانے پر خدا کا شکر ادا کیا اور وہاں سے نکل کر جتنی تیز
چل سکتا تھا ایک طرف چلنے لگا۔

رات ڈھل چکی تھی۔ صبح کی ہلکی ہلکی روشنی جنگل میں نمودار ہونے لگی تھی۔ ایک
پہاڑی نالہ عبور کر کے دوسرے کنارے پر پہنچا تو درختوں کے پیچھے سے ایک لمبے قد کا
حبشی نکل کر میرے سامنے آگیا۔ اس نے شمالی افریقہ کے مسلمانوں کی طرح نیلے رنگ کا
لبادہ سا پہن رکھا تھا۔ سر پر سفید رنگ کا صافہ بندھا تھا جس کا پلو گردن کے گرد لپٹا ہوا
تھا۔ اس کے حبشیوں ایسے چہرے پر ایک عجیب طرح کی روشنی سی پھیلی تھی اور آنکھوں
میں بڑی چمک تھی اس نے مجھے سلام کیا اور میری زبان یعنی اردو میں مجھ سے مخاطب
ہوا۔

"میرے دوست ! اب میں تمہیں اپنا نام بتا دینا چاہتا ہوں۔ میرا نام سوانا عبدالرحمان
ہے۔ لوگ مجھے سوانا کہا کرتے تھے۔ میں وہی ہوں جس کو تم نے پانی پلایا تھا۔"

میں کچھ چونکا۔ مگر یقین نہ آیا پھر خیال آیا کہ اس کو کیسے پتہ چلا کہ میں نے کنوئیں پر
ایک ماورائی ہستی کو پانی پلایا تھا؟ میں نے سوچا شاید یہ وہیں کسی درخت کے پیچھے چھپا
اس نام نہاد روح کو پانی پلاتے دیکھ رہا ہو گا۔ میں نے اس کی باتوں میں زیادہ دلچسپی نہ لی
وہ میرے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ اس کی آواز ویسی ہی خشک اور گہری گہری تھی۔ کہنے لگا۔

"تمہیں دوست بنایا ہے تو مصیبت میں اکیلا نہیں چھوڑوں گا۔ میں ہی شیر کی شکل
میں خدا کے حکم سے تمہاری مدد کو پہنچا تھا"۔

مجھے یہ سب کچھ من گھڑت باتیں لگ رہی تھیں۔ مگر میں خاموشی سے سنتا رہا اور
ساتھ میں چلتا بھی رہا۔ سوانا کہہ رہا تھا۔

"میں جانتا ہوں تمہیں میری باتوں پر یقین نہیں آ رہا مگر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا
اب میں تمہارے کام آنا اب خدا کی طرف سے مجھ پر فرض ہو گیا ہے"۔

میں نے اس کی سنی ان سنی کرتے ہوئے پوچھا۔

"اگر تم بتا سکتے ہو تو مجھے یہ بتاؤ کہ میں مراکو کی سرحد پر کیسے پہنچ سکتا ہوں"

سوانا نے جواب دیا۔

"مراکو یہاں سے کافی دور ہے تم پیدل وہاں تک کبھی نہیں پہنچ سکو گے۔ لیکن فکر نہ
کرو۔ خدا کے حکم سے تمہارا انتظام ہو جائے گا۔"

ہم تھک کر تھوڑی دیر ستانے کے واسطے ایک چشمے کے پاس بیٹھ گئے۔ سوانا نے
اپنی جیب سے میٹھی روٹی نکال کر مجھے دی۔ ایسی خوشبودار میٹھی روٹی میں نے پہلے کبھی
نہیں کھائی تھی۔ وہ کچھ نہیں کھا رہا تھا۔ میں نے روٹی کھا کر پانی پیا۔ پھر منہ ہاتھ دھو کر
تازہ دم ہو گیا۔ ہم ایک بار پھر چل پڑے۔ دوپہر کے وقت جنگل ختم ہو گیا۔ اور سامنے
ریت کے ٹیلے نظر آنے لگے۔ سوانا نے بتایا کہ

"یہاں سے افریقہ کا سب سے بڑا صحرا' صحرائے اعظم شروع ہوتا ہے۔ لیکن تمہیں
شمالی ساحل کے ساتھ ساتھ سفر کرنا ہو گا۔ اس طرف سرسبز ٹیلے بھی ہیں اور پانی کے چشمے
اور جنگلی پھل بھی مل جاتا ہے"۔

اس کے بعد وہ یہ کہہ کر ایک طرف چل دیا کہ میں تمہارے لئے سواری کا بندوبست
کرتا ہوں۔ تھوڑی دیر بعد واپس آیا تو اس کے ساتھ ایک اونٹ بھی تھا وہ بولا۔

"یہ اونٹ تمہیں مراکو کی سرحد پر پہنچا دے گا۔ اچھا دوست۔ پھر ملیں گے"

یہ کہا اور سوانا درختوں کی طرف چل دیا۔ میں نے سوچا کہ سوانا روح ہے یا آدمی
مجھے کیا کم از کم وہ میرے لئے سواری تو لے آیا ہے۔ میں اونٹ پر بیٹھ گیا۔ اس کی
مہار تھامی تو اونٹ اپنے آپ ایک طرف روانہ ہو گیا۔

===== ☐ ☐ =====

آج میں سوچتا ہوں تو مجھے حیرت ہوتی کہ اس اونٹ نے مجھے اتنی جلدی کیسے مراکو
سرحد کے اندر پہنچا دیا۔ میرے اندازے کے مطابق یہ پندرہ دن کا سفر تھا جو سوا
اونٹ نے پانچ دنوں میں طے کر لیا۔ بہرحال میں نے مراکو پہنچ کر خدا کا شکر ادا کیا
افریقہ کے خطرناک جنگلوں اور جرائم پیشہ لوگوں کے گروہ سے نجات ملی۔

جنگ ختم ہو گئی تھی۔ اتحادیوں کو فتح ہوئی تھی۔ مراکو کی سرحد الجزائر سے ملی ہو
تھی۔ یہ دونوں ملک مسلم اکثریت اور قدیم اسلامی تہذیب و تمدن کے علم بردار تھ
انہوں نے اس لئے دوسری جنگ عظیم میں اتحادیوں کا ساتھ دیا تھا کہ اتحادیوں نے ا
یقین دلایا تھا کہ جنگ ختم ہونے پر انہیں فرانس کی غلامی سے آزاد کر دیا جائے گا۔
اتحادی اپنے وعدے پر قائم نہ رہے اور جنگ کے ختم ہوتے ہی یہ دونوں ملک ایک بار
فرانس کے سپرد کر دیئے گئے۔ اس سے دونوں ملکوں میں آزادی کی ایک زبردست تحر
شروع ہو چکی تھی۔ جس کا مقصد مراکش اور الجزائر کو فرانسیسی تسلط سے آزاد کرانا تھا۔
فرانس نے یہاں اپنی فوجیں اتار دی تھیں اور ایک بار پھر سارے علاقے پر قبض
کے ہزاروں حریت پسندوں کو قید میں ڈال دیا تھا۔ کئی ایک شہید ہو گئے تھے۔ فرانس
اب اتحادیوں کی بھی حمایت حاصل تھی۔ الجزائر میں مسلمان احمد بن بلا کی قیادت
آزادیٔ وطن کی جنگ لڑ رہے تھے۔ یہ جنگ زیر زمین رہ کر لڑی جا رہی تھی۔ مراکو
بھی ایسی ہی صورتحال تھی۔ شہر میں ذرا سی بات پر پکڑ دھکڑ شروع ہو جاتی تھی۔ گو
چلنے لگتی تھیں۔ کرفیو لگ جاتا۔ یہ ملک اسلامی تہذیب و ثقافت کا ایک نادر نمونہ

کی خوبصورت مسجدیں، درسگاہیں اور اسلامی تاریخی مقامات اپنی طرف کھینچتے تھے۔
یہاں دل لگ گیا۔ میں ایک برس رباط میں رہا اس دوران میں نے جزائر کے مقام پر وہ
بھی دیکھی جہاں طارق بن زیادہ نے اندلس پر چڑھائی کرنے سے پہلے اپنے جہازوں کو
لگا دی تھی۔ یہاں ایک چٹان پر کھڑے ہو کر میں نے آبنائے جبرالٹر کے نیلے پانیوں کو
چٹانوں سے ٹکراتے دیکھا تو اقبال کا یہ شعر یاد آگیا۔

یہ غازی یہ تیرے پراسرار بندے
جنہیں تو نے بخشا ہے ذوق خدائی

واقعی وہ مجاہد، وہ غازی اللہ کے پراسرار بندے تھے۔ جنہوں نے اندلس کے ساحلوں
لامی پرچم لہرایا اور ایک ایسی اسلامی سلطنت کی بنیاد رکھی جس نے اپنی سات سو برس
ت میں ساری دنیا کو اور خاص طور پر یورپ کو علم وادب اور سائنس، طبعیات
، نباتات، حیاتیات، جیومیٹری، فلکیات اور دیگر سائنسی علوم کے بیش بہا خزانے عطا
رباط میں رہ کر میں نے اتنی عربی اور فرانسیسی زبان سیکھ لی تھی کہ میں ان زبانوں میں
رے کو اپنا مطلب سمجھا سکتا تھا۔ میں ایک ہارڈ ویئر سٹور میں ملازم ہو گیا تھا اور وہیں
رہنے کو جگہ بھی مل گئی تھی۔ ہمارے سٹور کے ساتھ ہی ایک دکان تھی جہاں اسلحہ
ت ہوتا تھا۔ ایک روز شام کے وقت میں کام سے چھٹی کرنے کے بعد ایک
ستوران میں قہوہ پینے جا رہا تھا کہ اچانک گولیاں چلنے لگیں۔ بازار میں بھگدڑ مچ گئی دو
وان دوڑتے ہوئے میرے قریب سے نکل گئے۔ میں بھی وہاں سے دوڑا۔ ایک نوجوان
پیچھے مڑ کر پستول سے فائر کر دیا۔ ان کے پیچھے مراکشی پولیس لگی تھی۔ گولی لگنے سے
سپاہی گر پڑا۔ اچانک سامنے سے پولیس کی گاڑی نکل آئی میں بھی دوڑتے دوڑتے
دو نوجوانوں کے قریب آگیا تھا۔ پولیس کی نفری زیادہ تھی۔ اچانک حملہ کر کے پولیس
دونوں نوجوانوں کو قابو کر لیا۔ میں پیچھے کو مڑنے لگا تو ایک سپاہی نے مجھے بھی لپک کر
لیا اور فرانسیسی میں کہا۔
"تم بھاگ نہیں سکتے"۔

میں نے کہا۔ "میں نے کوئی قصور نہیں کیا"۔

اس پر دوسرے سپاہی نے چلا کر کہا۔

"یہ بھی دہشت گرد ہے۔ لے چلو اسے"۔

میرے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ ساری صورت حال میری سمجھ میں آگئی تھی۔ دو نوجوان مراکشی یا الجزائری حریت پسند تھے اور ان کے ساتھ مجھے بھی ان کا ساتھی سمجھ کر پکڑ لیا گیا تھا۔ فرنچ حکومت ان حریت پسندوں پر جو تشدد کرتی تھی اس کے تصور سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ میں نے بہت شور مچایا کہ میرا ان لوگوں سے کوئی تعلق نہیں ہے میں ہندوستانی مسلمان ہوں اور سٹور میں نوکری کرتا ہوں مگر وہاں میری کون سنتا تھا۔

ہمیں رباط شہر سے دور ساحل سمندر کی ایک بہت بڑی چٹان پر واقع جیل خانے میں بند کر دیا گیا۔ یہاں میں نے پہلی بار غور سے ان دو نوجوانوں کو دیکھا جن کے ساتھ مجھے گرفتار کر لیا گیا تھا۔ ان کی عمریں بیس بائیس سال سے زیادہ نہیں تھیں۔ رنگ کھلے ہوئے تھے۔ چھوٹی چھوٹی داڑھی تھی اور سیاہ آنکھوں میں غضب کی چمک تھی۔ وہ فرانسیسی اور انگریزی زبانیں بول سکتے تھے۔ ہم تینوں ایک ہی کوٹھڑی میں بند تھے۔ ان کی زبانی معلوم ہوا کہ ان کا تعلق الجیریا کی حریت پسند جماعت سے ہے جو اپنے وطن کو فرانسیسیوں کے تسلط سے آزاد کرانے کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں ان میں سے ایک کا نام کریم اور دوسرے کا سطام تھا۔ وہ میرے پکڑے جانے پر افسوس کا اظہار کرنے لگے۔ یہ جان کر انہیں خوشی ہوئی تھی کہ میں بھی مسلمان ہوں اور میرا تعلق برصغیر ہندوستان سے ہے کریم کہنے لگا۔

"ہندوستان میں بھی مسلمان اپنے عظیم لیڈر قائداعظم محمد علی جناح کی قیادت میں ایک الگ اسلامی ملک پاکستان قائم کرنے کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں۔ ہم الجزائری مسلمانوں کی ہمدردیاں آپ لوگوں کے ساتھ ہیں"۔

میں نے ان سے پوچھا کہ وہ الجیریا سے مراکو میں کیسے آگئے۔ اس کے جواب میں

دوسرے نوجوان سطام نے کہا۔

"ہم دونوں مسلمان ملک ایک ہی کاز کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں۔ یہاں ہم اسلحہ لینے آئے تھے کہ کسی نے ہماری مخبری کر دی اور ہم پکڑے گئے۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہمارے ساتھ تم بھی مشکل میں پھنس گئے۔"

مشکل میں، میں ضرور پھنس گیا تھا مگر اب کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ دو تین دن وہاں کی پولیس ہم پر تشدد کرتی رہی۔ الجزائری حریت پسندوں نے بڑی بہادری سے تشدد برداشت کیا اور کچھ نہ بتایا۔ میں وہی کہتا رہا جو سچ تھا کہ میرا کسی گروپ سے کوئی تعلق نہیں ہے مگر مجھے بھی سخت اذیت دی گئی۔ چوتھے روز ہمیں اطلاع دے دی گئی کہ آج رات تم تینوں کو فائرنگ سکواڈ کے سامنے کھڑا کر کے گولی سے اڑا دیا جائے گا۔ سطام نے اللہ اکبر کا نعرہ لگا کر کہا "ہم وطن کی آزادی کی خاطر ہزار بار شہید ہونے کو تیار ہیں۔"

کریم نے بھی اسی عزم کا اظہار کیا۔ مگر میں ناحق مارا جا رہا تھا۔ دونوں حریت پسند مجھ سے ہمدردی کا اظہار کرنے لگے۔ میں نے بھی کہہ دیا کہ مجھے یہ موت قبول ہے مگر دل میں بے چینی سی لگ گئی۔

ہم جس کوٹھڑی میں بند تھے وہ جیل کے کونے میں تھی اور کھڑکی کی فولادی سلاخوں کے پیچھے سمندر نظر آتا تھا۔ شام کو ہمیں بیڑیاں ڈال دی گئیں۔ یہ ہماری موت کی تیاریاں تھیں۔ ہم خدا کو یاد کر رہے تھے۔ آدھی رات کے وقت چار مسلح گارڈ ہمیں کوٹھڑی سے نکال کر جیل کے احاطے میں لے آئے۔ یہاں ہمیں شوٹ کیا جانا تھا۔

===== ❑ ❑ =====

چار مسلح گارڈ ہمارے ساتھ تھے۔ یہاں ہمارے ہاتھ پیچھے باندھ دیئے گئے۔ ہماری بیڑیاں اتار دی گئیں۔ احاطے کی دس فٹ اونچی دیواریں پتھر جوڑ کر بنائی گئی تھیں۔ اس کا صرف ایک محرابی دروازہ تھا جہاں سے ہمیں احاطے میں لایا گیا تھا۔ ہمیں سامنے دیوار کے ساتھ کھڑا کر دیا گیا۔ پتھریلی دیوار میں ایک فٹ کے فاصلے پر لوہے کے کنڈے لگے تھے۔ ایک اور رسی سے ہمیں ان کنڈوں کے ساتھ باندھا گیا۔ چاروں سپاہی کچھ فاصلے پر کھڑے ہو گئے۔ رات خاموش تھی۔ الجزائری نوجوان بڑے جوش میں تھے۔ سچی بات ہے میں خوف زدہ تھا۔ کیونکہ میں بے وجہ پھنس گیا تھا۔

اتنے میں ایک باوردی فرانسیسی فوجی افسر احاطے میں داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں سفید رومال تھا۔ اس رومال کی جنبش پر ہمارے سینے گولیوں سے چھلنی کئے جانے والے تھے۔ میں جیسے پتھر کا ہو گیا تھا۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنے سامنے کھڑے مسلح سپاہیوں کو تک رہا تھا جن کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں۔ فرانسیسی افسر کے آتے ہی گارڈ نے اسے سلیوٹ کیا۔ اور کوئی پندرہ بیس فٹ کے فاصلے پر ہمارے سامنے ایک قطار میں کھڑے گئے۔ ابھی تک انہوں نے رائفلوں سے ہمارا نشانہ نہیں باندھا تھا۔

فرانسیسی افسر ایک طرف ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ موت ہم سے پندرہ فٹ کے فاصلے تھی۔ پھر اچانک ایک ایسا معجزہ ہوا جس کی مجھے بالکل توقع نہیں تھی۔ جس دیوار کے ساتھ ہمیں کھڑا کیا گیا تھا اس کے اوپر سے برین گن کا ایک بھرپور برسٹ فائر ہوا۔ گولیوں کی بوچھاڑ فائرنگ سکواڈ پر پڑی اور ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے چاروں سپاہی خاک و خون میں

تڑپ رہے تھے۔ دوسرا برسٹ فرانسیسی افسر پر بڑا پڑا جو اپنا پستول نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ بھی وہیں ڈھیر ہو گیا۔ ہم نے حیرت زدہ ہو کر اوپر کو دیکھا۔ دیوار کے اوپر سے کسی نے نیچے صحن میں چھلانگ لگا دی۔ یہ ایک دراز قد نوجوان تھا جس نے افریقہ کے شکاریوں جیسا لباس پہن رکھا تھا۔ احاطے کے نیم اندھیرے میں میں اسے نہ پہچان سکا۔ جب وہ دوڑ کر ہمارے قریب آیا اور ہماری رسیاں کھولنے لگا تو میں نے اسے پہچان لیا۔ یہ سوانا تھا۔ وہی نوجوان جس نے افریقہ کے جنگل سے نکلتے وقت میرے لئے اونٹ کا بندوبست کیا تھا۔ وہ میری طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ الجزائری حریت پسند یہی سمجھے کہ یہ مراکش کی تحریک مزاحمت کا کوئی مجاہد ہے۔ سوانا میری رسیاں کھولنے لگا تو آہستہ سے بولا۔

"تم نے میری برسوں کی پیاس بجھائی تھی یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ مصیبت میں میں تمہیں اکیلا چھوڑ دوں"۔

میں نے خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا کہ اس نے مجھے موت کے منہ سے بچا لیا۔ سوانا نے اپنی شکاری بش شرٹ کی جیب میں سے ایک ایک ریوالور نکال کر ہمیں دیا اور کہا۔

"جلدی سے میرے پیچھے آؤ"۔

وہ احاطے کے محرابی دروازے سے نکل کر ہمیں ایک نیم روشن راہ داری میں لے آیا۔ جو سنسان پڑی تھی۔ ہم اس کے پیچھے تقریباً دوڑ رہے تھے۔ لگتا تھا اسے اس جیل کے سارے خفیہ راستوں کا علم تھا۔ راہ داری ختم ہوئی تو آگے ایک زینہ آ گیا۔ زینہ چڑھ کر ہم ایک گول سوراخ نما دروازے سے جیل کی چاردیواری کے باہر نکل آئے۔ نیچے ڈھلان میں سمندری لہریں چھوٹی چھوٹی چٹانوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ سوانا مجھے لئے ان چٹانوں کے پیچھے آیا۔ یہاں اندھیرے میں ایک چٹان کی اوٹ میں ایک موٹر لانچ کھڑی تھی۔

جونہی ہم موٹر لانچ میں سوار ہوئے سوانا نے اسے سٹارٹ کر کے گھمایا اور لانچ تیز رفتاری سے سمندر کی موجوں کو چیرتی ہوئی آگے بڑھی۔ ہم سروں کو نیچے کئے تختوں کی اوٹ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ لانچ جیسے ہوا میں اڑ رہی تھی۔ سوانا لانچ کو کنٹرول کئے ہوئے

تھا۔ دیکھتے دیکھتے ساحل کی چٹانیں اور جیل خانے کی روشنیاں نظروں سے غائب ہو گئیں۔ اب ہم کھلے سمندر میں تھے اور لانچ اتنی تیز چل رہی تھی کہ ہم جہاں بیٹھے تھے وہیں بیٹھے رہے۔ ایسا لگتا تھا کہ اگر ہم اٹھے تو ہوا کے طوفانی تھپیڑے ہمیں تنکوں کی طرح اپنے ساتھ اڑا کر لے جائیں گے۔

وقت کا احساس بالکل نہیں ہو رہا تھا۔ نہ جانے کب تک میرا پراسرار دوست سوانا لانچ کو سمندر میں چلاتا رہا۔ پھر ہمیں اپنی بائیں جانب دور ساحل کی روشنیاں نظر آئیں۔ لانچ کی رفتار اب ہلکی ہو گئی۔ سطام اور کریم اٹھ کر سوانا کے پاس گئے۔ میں بھی ان کے ساتھ تھا۔ انہوں نے سوانا سے پوچھا کہ یہ کس بندرگاہ کی روشنیاں ہیں۔ سوانا نے مسکرا کر کہا۔

"تم لوگ اپنے وطن کی روشنیوں کو نہیں پہچانتے؟ یہ الجزائر کی بندرگاہ الجیئرز کی روشنیاں ہیں"۔

دونوں حریت پسند ہکا بکا سا ہو کر ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ انہیں یقین نہیں آرہا تھا کہ اتنے تھوڑے وقت میں وہ سینکڑوں میل کی سمندری مسافت طے کر چکے ہیں۔ میں سمجھ گیا کہ یہ سوانا کی ماورائی طاقت کا نتیجہ ہی ہو سکتا ہے۔ تب انہوں نے سوانا سے پوچھا کہ کیا تمہارا تعلق مراکو حریت پسند مزاحمتی گروپ سے ہے؟

"تم یہی سمجھ لو" سوانا نے مسکرا کر جواب دیا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب قسم کی چمک تھی۔ مجاہد کریم نے سوانا کو خبردار کیا کہ الجیئرز کی بندرگاہ پر بھی فرانسیسی پولیس اور فوج ان کی کھوج میں ہو گی۔ سوانا بولا۔ "میں جانتا ہوں فکر نہ کرو۔ میں تمہیں ایسی جگہ ساحل پر لے جاؤں گا جہاں تمہیں کوئی خطرہ نہیں ہو گا۔"

سوانا نے ہمیں الجیئرز کے ساحل سے دور شمال کی طرف ایک محفوظ مقام پر اتار دیا۔ سوانا نے اپنے مخصوص انداز میں مسکراتے ہوئے مجھ سے ہاتھ ملایا اور آہستہ سے بولا۔

"پھر ملیں گے دوست"۔

اس نے سطام اور کریم سے کوئی بات نہ کی اور لانچ کو سٹارٹ کر کے سمندر میں

روانہ ہو گیا۔ اب میں واپس مراکو نہیں جا سکتا تھا۔ کیونکہ وہاں پولیس کے ریکارڈ میں میرا نام بطور حریت پسند کے درج ہو چکا تھا اور میں ان کا مفرور بھی تھا۔ سطام اور کریم کو اس صورتحال کا احساس تھا۔ انہوں نے مجھے حوصلہ دیا اور کہا کہ میں ان کے ساتھ چلوں۔ وہ میری رہائش اور ملازمت کا کہیں انتظام کر دیں گے۔ میرے سامنے دوسرا کوئی راستہ نہیں تھا۔ میں ان کے ساتھ ہو لیا۔ راتوں رات وہ شہر سے کچھ میل دور ایک چھوٹے سے گاؤں میں آ گئے جس کے چھوٹے چھوٹے سفید مکانوں میں کہیں کہیں کھجور کے درخت ستاروں کی دھیمی روشنی میں خواب کی طرح معلوم ہو رہے تھے۔ گاؤں کے باہر ایک جانب کچی چاردیواری کے اندر بہت سے درخت اگے ہوئے تھے۔ احاطے کا دروازہ بند تھا۔ ہم دیوار پھاند کر احاطے کے اندر گئے۔ یہاں اناروں کا ایک چھوٹا سا باغ تھا جس کے کنارے پر دو تین کوٹھڑیاں بنی تھیں۔ باہر برآمدہ تھا۔ جہاں ایک آدمی سو رہا تھا۔ سطام اور کریم نے اسے جگایا اور آپس میں کوئی بات کی۔ اس آدمی نے جلدی سے ایک کوٹھڑی کھول دی۔ اندر فرش پر پرانا قالین بچھا تھا۔ ہم وہیں پڑ گئے۔ آنکھ کھلی تو دن کافی نکل آیا تھا۔ یہاں دونوں الجزائری مجاہد مجھے اس مکان کے مالک اور مسلمان حریت پسندوں کے ہمدرد ابو ناصر کے حوالے کر کے منہ اندھیرے ہی نامعلوم مقام کی طرف نکل گئے تھے۔ ابو ناصر کی عمر پچاس کے قریب تھی۔ چہرہ بارعب اور آواز بھاری تھی۔ بڑا شفیق اور خوش مزاج الجزائری بزرگ تھا۔ وہ میرے ساتھ بڑی شفقت سے پیش آیا۔ سطام اور کریم اسے سب کچھ سمجھا گئے تھے۔

ابو ناصر نے میرے ساتھ ہی دوپہر کا کھانا کھایا اور مجھے تسلی دی کہ یہاں فرانسیسی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔ ابو ناصر بڑا پرجوش مجاہد تھا اس کا ایک بیٹا ناصر جنگ آزادی میں شہید ہو چکا تھا۔ اب اس کی اولاد صرف ایک بیٹی ہی رہ گئی تھی جس کا نام ناصرہ تھا۔ یہ نوجوان الجزائری لڑکی بھی اپنے دل میں اسلام اور الجزائر کی آزادی کا جذبہ رکھتی تھی۔ ناصر کی شہادت کے بعد فرانسیسی پولیس نے ابو ناصر کو بھی پکڑ لیا تھا مگر کوئی ثبوت نہ ملنے پر اسے رہا کر دیا۔ حقیقت یہ تھی کہ ابو ناصر انڈر گراؤنڈ کام کر رہا تھا اور اس قدیم جنگ

آزادی میں اس کی بیٹی بھی اس کے ساتھ تھی۔ میرا ارادہ تھا کہ میں کچھ روز وہاں رہ کر مصر کے ملک کی طرف نکل جاؤں گا مگر ایک ایسا واقعہ ہو گیا کہ میرا سارا پروگرام دھرے کا دھرا رہ گیا۔



ابو ناصر مزاحمتی تحریک کا بڑا سرگرم کارکن تھا مگر اس کی ساری سرگرمیاں زیر زمین تھیں۔ اس جدوجہد میں اس کی بیٹی ناصرہ بھی پورے اسلامی اور قومی جذبے کے ساتھ حصہ لے رہی تھی۔ ابو ناصر کا شہر میں ایک چھوٹا سا سٹور تھا جہاں میں کام کرنے لگا تھا۔ فرانسیسی حکام کو مخبروں نے اطلاع کر دی تھی کہ مجاہد ابو ناصر کے ہاں راتوں کو آکر ٹھہرتے ہیں اور یہاں سے اسلحہ وغیرہ لے کر اپنے مشن کو روانہ ہو جاتے ہیں۔

ایک دن کی بات ہے کہ ابو ناصر کسی کام سے دوسرے شہر گیا ہوا تھا۔ پیچھے گھر میں صرف میں اور ناصرہ ہی تھے۔ میں رات کو سٹور بند کر کے آیا تو ناصرہ کھانا پکا رہی تھی۔ عشاء کی نماز ناصرہ نے اپنے چھوٹے سے کمرے میں پڑھی۔ پھر ہم نے کھانا کھایا۔ ناصرہ مجھ سے میرے وطن اور میرے گھر والوں کے بارے میں باتیں سنتی رہی۔ پھر وہ اپنے کمرے میں سونے کے لئے چلی گئی۔

میں ساتھ والی کوٹھڑی میں قالین پر ہی سو جاتا تھا۔ اس رات مجھے نیند نہیں آرہی تھی۔ چاند نکلا ہوا تھا۔ کھڑکی میں سے باہر صحرائی نخلستان کا منظر بڑا دلکش لگ رہا تھا۔ میں نے دروازہ اندر سے بند کر رکھا تھا۔ میں سونے کی کوشش کرنے لگا۔ ابھی میں غنودگی کے عالم میں ہی تھا کہ کسی نے باہر سے دروازے پر دستک دی۔ میں نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا بتی میں نے بجھا دی تھی۔ کھڑکی میں سے چاندنی اندر آرہی تھی میں نے عربی میں پوچھا کون ہے؟

اس کے ساتھ ہی دھماکے سے دروازہ ٹوٹ گیا اور چھ سات آدمی اندر گھس آئے

میں اٹھنے بھی نہ پایا تھا کہ مجھے وہیں دبوچ لیا گیا اور گھسیٹتے ہوئے باہر لے گئے۔ یہ فرانسیسی پولیس کے آدمی تھے۔ انہوں نے ناصرہ کے کمرے کا دروازہ بھی توڑ دیا اور اندر گھس گئے۔ تھوڑی ہی دیر میں ناصرہ کو بھی یہ لوگ گھسیٹتے ہوئے باہر لا رہے تھے۔ ناصرہ ایک دلیر مجاہدہ تھی۔ اس کے پاس ایک چھوٹا پستول موجود تھا۔ اس نے فائر کر دیا۔ ایک سپاہی گرا اس سے پہلے کہ وہ دوسرا فائر کرتی ایک آدمی نے اس کی گردن پر زور سے مکا مارا اور پستول چھین لیا۔

چاندنی رات میں مجھے ان پولیس والوں کی نیلی وردیاں صاف نظر آرہی تھیں۔ ان میں فرانسیسی بھی تھے اور وہاں کی مقامی پولیس کے مقامی آدمی بھی تھے۔ کچھ فاصلے پر ایک فوجی ٹرک کھڑا تھا۔ ہمیں اس میں دھکیل کر دروازہ بند کر دیا گیا۔ ناصرہ گردن پر ضرب لگنے سے نیم بے ہوشی کے عالم میں تھی۔ یہ لوگ مجھے بھی الجزائری حریت پسند سمجھ کر لئے جا رہے تھے۔ بہرحال اب تو میں بھی ان حریت پسندوں کے ساتھ تھا۔

ٹرک کسی طرف روانہ ہو گیا۔ ٹرک کے اندر ہی ہمارے ہاتھ پیچھے باندھ دیئے گئے تھے۔ چار مسلح سپاہی ہمارے سامنے رائفلیں لئے بیٹھے تھے۔ ٹرک دیر تک چلتا رہا۔ اس دوران اس نے کئی موڑ گھومے۔ اس کی رفتار ہلکی ہو گئی۔ اور ایک چکر کاٹ کر رک گیا ہمیں نیچے اتارا گیا۔ ناصرہ اب اپنے حواس میں تھی۔ چاندنی رات میں ہم نے دیکھا کہ کچھ فاصلے پر بتیاں جل رہی ہیں۔ ہمیں بہت جلد معلوم ہو گیا کہ یہ کوئی فوجی ایئرپورٹ ہے وہاں کئی فوجی گاڑیاں کھڑی تھیں اور سامنے گیٹ پر ایک فوجی گارڈ پہرہ دے رہا تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور خاموش رہے۔ مسلح گارڈ نے ہمیں اپنے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ پھر وہ ہمیں تیز تیز چلاتے ایک رن وے پر لے آئے جہاں ایک بہت بڑا فوجی طیارہ کھڑا تھا۔ اس کا رنگ بھورا تھا۔ چاندنی میں اس پر لکھا ہوا نمبر صاف نظر آرہا تھا۔ ہمیں اس طیارے میں دھکیلنے کے بعد دروازہ بند کر کے سیڑھی ہٹا دی گئی یہ کوئی ٹرانسپورٹ طیارہ تھا اور شاید صرف ہمارا ہی انتظار کر رہا تھا۔ اس کے پروں والے انجن سٹارٹ ہو گئے۔ طیارے کے اندر سامان کے کریٹ لدے ہوئے تھے۔

مجھے فرش پر ہی بٹھا دیا گیا۔ طیارہ رن وے پر دوڑنے لگا۔ پھر وہ ٹیک آف کر گیا۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ لوگ ہمیں کہاں لئے جا رہے ہیں۔ ہمیں ایک دوسرے سے بات کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ کافی لمبی پرواز تھی طیارے کی گول کھڑکیوں میں سے مہتاب کی ہلکی نیلی روشنی زرد چاندنی میں مل رہی تھی کہ طیارہ نیچے اترنے لگا۔ کچھ علم نہیں تھا کہ یہ کونسا ایئرپورٹ ہے۔ ہمیں جہاز سے نکال کر فوجی ٹرک میں بند کر دیا گیا۔ طیارے سے فوجی ٹرک تک جاتے ہوئے روشنیوں سے یہ ضرور اندازہ ہوا کہ یہ بڑا شہر ہے۔ جنگ ختم ہو چکی تھی اس لئے بلیک آؤٹ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ٹرک کافی دیر تک چلنے کے بعد ایک جگہ رکا۔ کسی بڑے گیٹ کے کھلنے کی آواز آئی۔ ٹرک کسی احاطے میں آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ پھر وہ رک گیا۔ باہر نکلے تو ہم نے دیکھا کہ ہم اونچے مخروطی میناروں والے کسی پرانے یورپی قلعے کے احاطے میں ہیں۔ دن کی روشنی چاروں طرف پھیلنے لگی تھی۔ یہاں الجزائر کے مقابلے میں سردی تھی۔ جس سے ظاہر تھا کہ یہ یورپ کا کوئی ملک ہے۔ چونکہ الجزائر پر فرانس کا تسلط تھا اس لئے یہ فرانس ہی ہو سکتا تھا۔ قلعے کی راہ داریاں نیم روشن اور ٹھنڈی تھیں۔ لوہے کے سلاخ دار دروازے کھلتے چلے گئے۔ ایک جگہ ناصرہ کو مجھ سے الگ کر دیا۔ مجھے دوسری راہ داری کے کونے والی کوٹھڑی میں بند کر کے باہر لوہے کے سلاخوں والے دروازے پر تالا لگا کر سپاہی واپس چلے گئے۔ میرے ہاتھ کھول دیئے گئے تھے میں نے کوٹھڑی کا جائزہ لیا۔ کونے میں فرش سے دو فٹ اونچا ایک چبوترہ بنا تھا جس پر دو کمبل تہہ کر کے رکھے ہوئے تھے۔ میں سردی میں ٹھٹھر رہا تھا۔ جلدی سے کمبلوں میں سمٹ کر بیٹھ گیا۔ نیند بالکل غائب تھی۔ سوچ رہا تھا کہاں سے کہاں تقدیر لے آئی ہے۔ آگے کیا ہونے والا تھا؟ کچھ خبر نہیں تھی۔ مجھے ناصرہ کا خیال آرہا تھا کہ نہ جانے اس پر کیا گزر رہی ہو گی۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آرہی تھی کہ یہ لوگ ہمیں فرانس میں کیوں لے آئے ہیں۔ پوچھ گچھ کرنی تھی تو وہ الجزائر میں بھی کر سکتے تھے۔ اگر موت کے گھاٹ اتارنا تھا تو یہ کام وہ ہماری گرفتاری کے وقت ہی کر سکتے تھے۔ بہرحال میرے سامنے سب سے بڑا مسئلہ وہاں

سے فرار ہونا تھا۔ مجھے اپنے ماورائی دوست سوانا کا خیال ضرور آیا مگر یہ حقیقت بھی
سامنے تھی کہ سوانا صرف اسی وقت میری مدد کو آتا رہا ہے جب زندگی اور موت کا
درپیش ہو۔ اس سے پہلے وہ کسی بھی مشکل کے وقت نہیں آیا تھا۔ مجھے اپنی ہمت اور
کی رحمت پر پورا بھروسہ تھا۔ لیکن وہاں سے فرار ہونے سے پہلے میں یہ معلوم کرنا
تھا کہ ناصرہ کو کہاں قید میں رکھا گیا ہے۔ کیونکہ اسے بھی نکالنا میرا فرض تھا۔ مجھے
سے فرار کی کوئی صورت بظاہر نظر نہیں آرہی تھی۔ کوٹھڑی قلعے کا تہہ خانہ تھا جس
کوئی روشندان بھی نہیں تھا۔ راہ داری میں جو بتی جل رہی تھی صرف اسی کی دھیمی
سی روشنی اندر آرہی تھی۔ فضا مرطوب اور سرد تھی۔ دو پرانے کمبلوں میں بھی
سردی لگ رہی تھی ----- ایسی خبریں ہم الجزائر میں ہی اخباروں میں پڑھتے رہتے تھے
خود فرانس میں ایک ایسا طبقہ موجود ہے جو یہ چاہتا ہے کہ فرانس الجزائر پر اپنا ناجائز
ختم کر دے اور وہاں کے مسلمانوں کو حق خود ارادیت دے۔ ان میں فرانس کے دا
بھی شامل تھے۔ جن میں مشہور فلسفی ادیب ژاں پال ساتر ے پیش پیش تھا۔ بہت جلد
اس کا ثبوت بھی مل گیا۔ مجھے اس پرانے فرانسیسی قلعے میں قید ہوئے کئی دن گذر گئے
ایک رات ایک دوسرا آدمی میرے لئے پیاز کا سوپ لے کر آیا۔ اس کی فرنچ کٹ دا
تھی۔ سر پر گرم اونی ٹوپی تھی۔ پرانا سا گرم کوٹ پہن رکھا تھا۔ سوپ کا مگ میرے
رکھ کر وہ دروازے کی سلاخوں کے پاس گیا۔ راہ داری میں ایک نظر ڈالی پھر میرے
آکر دھیمی آواز میں پوچھا۔ "تم فرنچ جانتے ہو"

"تھوڑی تھوڑی" میں نے جواب دیا۔ وہ بولا۔ "سنو کل شام کو تمہیں ڈیول
لینڈ لے جانے کے لئے یہاں سے نکالا جائے گا ----- " پھر اس آدمی نے مجھے ساری
سمجھا دی۔ وہ الجزائر کی آزادی کا پرجوش حامی فرانسیسی تھا۔ جب وہ چلا گیا تو مجھے نا
خیال آگیا۔ اس آدمی نے ناصرہ کے بارے میں لاعلمی کا اظہار کیا تھا۔



الجزائری مسلمانوں کی تحریک آزادی کے حامی اس فرانسیسی نے اپنا نام رولاں بتایا تھا۔ گویا یہ اللہ تعالیٰ نے غیب سے میرے لئے مدد بھیجی تھی ۔ یہ انسان دوست فرانسیسی رولاں محض انسانی ہمدردی اور جمہوریت پسندی کی وجہ سے میری مدد کر رہا تھا۔ میں نے اس سے دو بار اپنی ساتھی اور صحیح معنوں میں الجزائری حریت پسند لڑکی ناصرہ کے بارے میں پوچھا مگر اس نے یہی جواب دیا کہ ناصرہ کو اس قلعے سے باہر کسی دوسری جگہ لے جایا گیا ہے۔ جس کی اسے کچھ خبر نہیں ہے۔ بہرحال وہ مجھے ڈیول آئی لینڈ کے عذاب سے بچانا چاہتا تھا۔ ڈیول آئی لینڈ فرنچ گی آنا میں ایک دلدلی جزیرہ تھا جہاں خطرناک مجرموں کو جلاوطن کر دیا جاتا تھا اور پھر وہ وہیں مر جاتے تھے۔ وہاں کے دہشت ناک واقعات سن کر آدمی پر لرزہ طاری ہو جاتا تھا۔ میں خدا کا شکر ادا کرنے لگا کہ عین موقع پر اس نے ایک غیبی مدد بھیج دی۔ رولاں کے کہنے کے مطابق اگلے روز شام کے وقت مجھے اس پرانے قلعے سے ایک بند گاڑی میں بٹھا کر بندرگاہ کی طرف روانہ کیا گیا۔ میرے فرانسیسی محسن رولاں نے ساری باتیں سمجھا دی تھیں کہ مجھے کیا کیا کرنا ہے۔ بند گاڑی بندرگاہ کے احاطے میں آ کر کھڑی ہو گئی۔ مجھے باہر نکالا گیا۔ اس وقت میرے ہاتھ پیچھے بندھے تھے۔ آسمان ابر آلود تھا۔ شام کا اندھیرا گہرا ہو رہا تھا۔ فضا سرد اور مرطوب تھی۔ میں نے چاروں طرف دیکھا۔ یہ ایک چھوٹی سی بندرگاہ تھی۔ ایک جانب کچھ کیبن تھے جن میں کہیں کہیں روشنی ہو رہی تھی۔ سمندر پر دھند چھائی تھی۔ ایک بڑا بحری جہاز ٹیلے کی طرح سمندر میں کچھ فاصلے پر لنگر انداز تھا۔ اس کی بتیاں دھند میں ٹمٹما رہی تھیں۔ جونہی گارڈ مجھے بازو سے

پکڑ کر جیٹی کی طرف چلا میں نے رولاں کی بتائی ہوئی سکیم کے مطابق اپنے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھاما اور پھر زمین پر گر کر یہ ظاہر کیا کہ میں بے ہوش ہو گیا ہوں۔ گارڈ مجھے جھک کر دیکھنے لگے پھر کسی نے اونچی آواز میں کہا۔ "اسے گھسیٹ کر لے چلو"

دوسری طرف سے آواز آئی۔ "کیا کر رہے ہو یہ یہیں مر گیا تو تمہاری نوکری چلی جائے گی۔ اسے کلینک میں لے چلو۔ ڈاکٹر ابھی کوئی ٹیکہ لگا کر اسے ٹھیک کر دے گا"۔

میں نے آواز پہچان یہ میرے دوست رولاں کی آواز تھی۔ اسی وقت دو آدمیوں نے مجھے اٹھایا اور قریبی کیبن میں لے جا کر سٹریچر پر لٹا دیا۔ میں کسی کسی وقت ذرا سی آنکھ کھول کر دیکھ لیتا تھا۔ یہاں رولاں کا ساتھی ڈاکٹر پہلے سے موجود تھا۔ اس نے مجھے چیک کیا اور گارڈ سے کہا۔ "یہ مر رہا ہے۔ اسے دل کا دورہ پڑا ہے"۔

ڈاکٹر نے پروگرام کے مطابق مجھے گلوکوز کا انجکشن لگایا اور بولا۔ "اسے یہاں کچھ دیر آرام کرنے دو۔ ہمیں باہر چلے جانا چاہئے"۔

اور ڈاکٹر فرنچ گارڈ کو لے کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ گویا اس نے میرے فرار کا راستہ صاف کر دیا تھا۔ رولاں کی سکیم بھی یہی تھی۔ میں اسی سکیم کے مطابق سٹریچر سے اٹھا۔ کھڑکی کے پاس جا کر اس کے پٹ کو ذرا سا دھکیلا۔ وہ پہلے سے کھلی تھی دیوار کی دوسری جانب اندھیرے میں جھاڑیاں اور درخت تھے۔ میں نے چھلانگ لگا دی اور رولاں کی ہدایت کے مطابق جتنی تیز دوڑ سکتا تھا دوڑنے لگا۔ آگے لوہے کا ایک جنگلا آگیا۔ میں نے جنگلا پار کیا۔ سامنے ایک چھوٹا سا پارک تھا جس میں کہیں کہیں بتی روشن تھی۔ میں پارک کی باڑ کے ساتھ ساتھ دوڑتا اس جگہ پہنچ گیا جہاں جھاڑیوں میں ایک سائیکل پہلے سے رکھ دی گئی تھی۔ میں نے سائیکل باہر نکالی اور اس پر سوار ہو کر چھوٹی ڈھلانی سڑک پر تیزی سے سائیکل بھگانے لگا۔ یہ سڑک آگے جا کر شہر سے آتی ہوئی بڑی سڑک کے ساتھ مل گئی تھی۔ وہاں ایک طرف اندھیرے میں چھوٹی سی پگ ڈنڈی کھیتوں میں جاتی تھی۔ میں نے سائیکل وہیں جھاڑی میں چھپا دی اور کھیتوں میں پیدل چل دیا۔ کھیتوں پر دھند چھا رہی تھی۔ اب رات کا اندھیرا چاروں طرف پھیل چکا تھا۔ چار کھیت پار کرنے

کے بعد بائیں ہاتھ کو چھوٹے سے ٹیلے کے دامن میں اونچے درختوں کے درمیان وہ گیراج نظر آیا جہاں چھپنے کی مجھے رولاں نے ہدایت کی تھی۔ گیراج کے باہر پرانے ٹائروں کا ڈھیر سا پڑا تھا۔

ایک بوڑھا آدمی گرم جیکٹ کے اوپر گلے میں مفلر لپیٹے' منہ میں پائپ دبائے پہلے سے میرا انتظار کر رہا تھا۔ مجھے آتا دیکھ کر وہ اندھیرے سے نکل کر میرے سامنے آگیا۔

"میرے پیچھے پیچھے آجاؤ"۔

گیراج میں سے ایک زینہ نیچے تہہ خانے کو چلا گیا تھا۔ اس تہہ خانے میں دھیمی روشنی والا بلب روشن تھا۔ ایک سٹریچر دیوار کے ساتھ لگا تھا جس پر چار پانچ کمبل پڑے تھے۔ اس کا ایک روشندان اوپر جھاڑیوں میں کھلتا تھا۔ اس روشندان سے تہہ خانے میں تازہ ہوا آرہی تھی۔ بوڑھے آدمی نے کہا۔ "تمہیں یہاں ہر شے مل جائے گی۔ باہر نکلنے کی ضرورت نہیں ہے"

میں نے پوچھا۔ "ناصرہ کے بارے میں کچھ بتا سکتے ہو کہ وہ کہاں ہے؟"

بوڑھے نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"میں نہیں جانتا۔ یہ رولاں ہی تمہیں بتا سکے گا اب تم آرام کرو۔ وہ صبح تمہیں کسی وقت آکر ملے گا۔"

وہ چلا گیا۔ وہاں کافی سردی تھی۔ میں چار پانچ کمبل جسم کے گرد لپیٹ کر سٹریچر پر ہی لیٹ گیا۔ سخت تھکا ہوا تھا۔ فوراً ہی نیند آگئی۔

اگلے روز رولاں نے آکر مجھے جگایا تو روشندان میں سے دن کی دھندلی دھندلی روشنی تہہ خانے میں آرہی تھی۔ رولاں اپنے ساتھ کافی سے بھری ہوئی تھرمس اور دوسری کھانے پینے کی چیزیں لایا تھا۔ اس نے بتایا کہ میرے فرار کا سب کو علم ہو گیا ہے۔ پولیس جگہ جگہ مجھے تلاش کر رہی ہے۔ مجھ پر کسی کو شک نہیں ہوا۔ رولاں کی زبانی اس بات کی تصدیق ہو گئی کہ وہ مارسلیز کا پورٹ سٹی تھا میں نے ناصرہ کی بابت پوچھا تو رولاں کپ میں کافی انڈیلتے ہوئے کہنے لگا۔

"پہلے خیال تھا کہ اسے بھی تمہارے ساتھ ہی ڈیول آئی لینڈ میں جلاوطن کیا جائے گا۔ لیکن پھر فرانسیسی حکام نے ارادہ بدل لیا۔ لیکن یہ ابھی تک پتہ نہیں چلا کہ پولیس حکام اسے کہاں لے گئے ہیں۔ ہمارے آدمی برابر کھوج لگانے میں لگے ہیں۔ اگر تم چاہو تو میں تمہیں الجزائر پہنچانے کا انتظام کر سکتا ہوں"۔

مگر اخلاقی طور پر مجھے یہ گوارا نہ ہوا کہ میں اس شخص کی بیٹی کو ظالموں کے پاس چھوڑ کر چلا جاؤں جس نے الجزائر میں مجھے پناہ دی تھی۔ میں نے رولاں کو اپنے فیصلے سے آگاہ کر دیا کہ میں ناصرہ کو ساتھ لے کر ہی واپس جاؤں گا۔ وہ بولا۔

"میں بھی یہی چاہتا ہوں۔ تم یہاں دو تین دن رہو۔ میں ناصرہ کا پتہ چلا لوں گا۔ مگر دن کے وقت ہرگز ہرگز گیراج سے باہر مت نکلنا۔"

تین دن میں اس تہہ خانے میں بند رہا۔ چوتھے دن دوپہر کے وقت رولاں آیا تو وہ کچھ پریشان سا تھا۔ میں نے پوچھا ناصرہ کا کچھ پتہ چلا؟ رولاں لوہے کی کرسی پر بیٹھ گیا اور بوجھل لہجے میں بولا۔

فرنچ گورنمنٹ نے اس الجزائری حریت پسند خاتون سے بڑا گھناؤنا سلوک کیا ہے"۔

میں رولاں کا منہ تکنے لگا۔ "کیا مطلب؟"

===== ⅃ ⅃ =====

انسان دوست اور الجزائری حریت پسندوں کے ہمدرد اور میرے فرانسیسی محسن رولاں مجھے بتایا کہ ابو ناصر کی بیٹی ناصرہ کو فرنچ خفیہ پولیس نے زندہ درگور کر دیا ہے۔ اس مجھے اس کی جو تفصیل بتائی وہ میں آپ کو اپنی زبان میں بتاتا ہوں۔ یہ تو آپ سن چکے کہ فرنچ پولیس مجھے اور حریت پسند خاتون ناصرہ کو گرفتار کر کے فرانس لے گئی تھی مارسلیز کے ایک قلعے میں ہم دونوں کو قید میں ڈال دیا گیا۔ یہاں ناصرہ مجھ سے جدا ہو مجھے رولاں نے قلعے سے فرار کروا دیا۔ مجھے ناصرہ کی تلاش تھی میں اس کے بغیر الجزائر نہیں جانا چاہتا تھا۔ کیونکہ ان لوگوں کے مجھ پر بڑے احسان تھے۔ ایک ان حریت پسند خاتون ہونے کی وجہ سے بھی میری ساری ہمدردیاں اس کے ساتھ رولاں نے مجھے ایک گیراج کے تہہ خانے میں چھپا دیا اور خود ناصرہ کا سراغ لگانے شش کرتا رہا۔ چنانچہ چوتھے روز اس نے مجھے جو کچھ بتایا اس کی تفصیل یہ تھی کہ کی سنٹرل انٹیلی جنس نے ناصرہ کو ایک ایسے فرنچ کاؤنٹ کے ہاتھ فروخت کر دیا جو ری حریت پسندوں کا جانی دشمن تھا۔ مارسلیز کی بندرگاہ کے جنوب مشرق کی طرف ر میں ایک چھوٹا سا جزیرہ ہے جہاں اس کاؤنٹ کا پرانا قلعہ ہے اس چھوٹے سے ے پر کاؤنٹ کی حکمرانی ہے اس نے چیتے پال رکھے ہیں۔ جن کو ساتھ لے کر وہ ے کے جنگل میں شکار کھیلنے جاتا ہے۔ رولاں کی اطلاع کے مطابق ناصرہ اسی جابر ٹ کے قلعے میں قید تھی ----- میں نے کہا۔

"اسے وہاں سے نکالنے کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟"

رولاں بولا۔ "یہ تقریباً ناممکن ہے۔ کاؤنٹ کی وہاں اپنی ایک چھوٹی سی فوج ہے جو پیشہ ور مجرموں اور سزا یافتہ اجرتی قاتلوں پر مشتمل ہے۔ یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ اس آمر کاؤنٹ کے قلعے میں جو غلام یا کنیز ایک بار داخل ہو جاتی ہے پھر اس کی لاش بھی نہیں ملتی"۔

میں نے اسی لمحے فیصلہ کر لیا کہ میں ناصرہ کو جابر کاؤنٹ کی قید سے ضرور نکال لاؤں گا۔ خواہ اس کے لئے مجھے کتنی بڑی قربانی ہی کیوں نہ دینی پڑے۔ رولاں کو پورا یقین کہ اب میں واپس الجزائر چلے جانے کا پروگرام بناؤں گا۔

کہنے لگا

"آج شام میں تمہیں ایک اپنے اعتباری آدمی کے حوالے کر دوں گا۔ وہ تمہ الجزائر کے ساحل تک خود پہنچا کر آئے گا"۔

میں نے کہا۔

"کیا تم مجھے کسی طرح کاؤنٹ کے جزیرے تک پہنچا سکتے ہو؟ آگے میں خود سنبھ لوں گا"۔

رولاں کچھ حیران ہوا۔ اسے مجھ سے اس سوال کی توقع نہیں تھی۔

"کیا تم پاگل ہو گئے ہو؟ جو جان بوجھ کر موت کے منہ میں جانا چاہتے ہو"۔

میں نے کہا۔

"میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ حریت پسند مجاہدہ ناصرہ کو جابر کاؤنٹ کے پنجہ ستم نکالے بغیر یہاں سے واپس نہیں جاؤں گا"۔

رولاں ہمدردانہ انداز میں کہنے لگا۔

"تم نہیں جانتے تم نے کیا فیصلہ کر لیا ہے فرنچ پولیس کے چنگل سے تم جان بچا فرار ہو سکتے ہو مگر ایک بار کاؤنٹ کے خونی جزیرے میں پہنچے تو دوسرے لمحے کا تمہاری لاش اپنے خونخوار درندوں کے آگے ڈال رہا ہو گا"۔

میں نے رولاں کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا اور بھرپور اعتماد کے ساتھ کہا۔

"رولاں! اگر تمہیں الجزائری حریت پسندوں کی کاز سے ذرا بھی ہمدردی ہے تو مجھے کسی طرح کاؤنٹ کے جزیرے تک پہنچا دو۔ اس سے زیادہ میں تم سے کچھ نہیں چاہتا۔"

رولاں سوچ میں پڑ گیا۔ اسے میرے پختہ عزم کا یقین ہو گیا تھا۔ کہنے لگا۔ "میں کل تمہیں کچھ بتا سکوں گا۔ مجھے صورتحال کا اچھی طرح سے جائزہ لینا ہو گا۔ کیونکہ کاؤنٹ کے جزیرے پر کوئی بھی انسان اس کی مرضی اور اس کی اجازت کے بغیر نہیں جا سکتا۔ فرانسیسی انٹیلی جنس نے جب ناصرہ کو اس کے حوالے کیا تھا تو اسے تمہاری فل رپورٹ بھی دے دی تھی کہ تم اس کے ساتھی ہو۔ تمہاری ایک تصویر بھی کاؤنٹ کے پاس پہنچ چکی ہے۔ تمہیں ساحل پر ہی کاؤنٹ کے آدمی شوٹ کر دیں گے۔ کاؤنٹ کا اپنا کوسٹ گارڈز کا نظام ہے کاؤنٹ نے ان سب گارڈز کو تمہاری تصویر کی کاپی دے دی ہو گی"۔

رولاں دوسرے روز آنے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔ میں سارا وقت کاؤنٹ کے خونی جزیرے میں ناصرہ تک پہنچنے اور اسے وہاں سے نکالنے کے منصوبوں پر غور کرتا رہا۔ کیونکہ یہ مجھے یقین تھا کہ میں جزیرے پر ضرور پہنچوں گا۔ خواہ مجھے سمندر میں تیرنا ہی کیوں نہ پڑے۔

دوسرے روز صبح صبح رولاں میرے پاس گیراج میں آیا۔ ہم نے اکٹھے ناشتہ کیا۔ اس دن بھی کافی ٹھنڈ تھی۔ باہر شروع ستمبر کی دھند چھائی ہوئی تھی۔ ہم دونوں سخت گرم کافی پی رہے تھے۔ میں نے رولاں سے اصل موضوع پر گفتگو شروع کی تو وہ بولا۔

میں، شارل اور دوتراں ہم تینوں رات گئے تک غور کرتے رہے۔ آخر اس نتیجے پر پہنچے کہ نارمل طریقے سے تمہارا کاؤنٹ کے جزیرے تک پہنچنا ناممکن ہے۔ تم تصور نہیں کر سکتے کہ کاؤنٹ نے لاکھوں ڈالر خرچ کر کے اپنے جزیرے کے دفاعی نظام کو کس قدر جدید ترین بنا دیا ہوا ہے۔ جزیرے پر کوئی اجنبی کاؤنٹ کی مرضی کے بغیر قدم نہیں رکھ سکتا۔ چونکہ وہ موجودہ فرنچ گورنمنٹ کا طرفدار ہے۔ اس لئے اسے حکومت کی حمایت بھی حاصل ہے اور بظاہر جزیرے پر وہ غیر قانونی سرگرمیوں میں بھی ملوث نہیں ہے۔ لیکن اندرونی طور پر وہ جس کو چاہتا ہے فرانس کے شہر یا گاؤں سے اغوا کر کے لے جاتا

ہے اور پھر اس کا کچھ پتہ نہیں چلتا"۔

میں نے رولاں کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"تم ایسا کرو کہ مجھے کسی ہیلی کاپٹر یا جہاز سے جزیرے پر پیرا شوٹ کی مدد سے گرا دو"۔

رولاں ہنس کر بولا۔ "اس سے پہلے کہ ہم تمہیں وہاں گرائیں کاؤنٹ کے ساحلی میزائل ہمارے ہیلی کاپٹر یا جہاز کے پرخچے اڑا چکے ہوں گے"۔ پھر اس نے مجھے ہمدردانہ انداز میں سمجھاتے ہوئے کہا۔ "تمہارے لئے بہتر یہی ہے کہ واپس الجزائر چلے جاؤ۔ میں تمہیں حفاظت سے وہاں تک پہنچا دوں گا"۔

میں اٹھ کر بے چینی سے ٹہلنے لگا۔

"نہیں ایسا نہیں ہو گا۔ میں بحیرہ روم میں تیر کر چلا جاؤں گا۔ مجھے تیرنا آتا ہے۔ میں الجزائر کی امانت واپس لے کر جاؤں گا۔ یہ میرا فرض ہے۔ ناصرہ کو میں ایک جابر کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ سکتا"۔

رولاں ذہن میں ایک سکیم سوچ کر آیا تھا مگر وہ میرے جذبے کی شدت کو پرکھنا چاہتا تھا۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ میں الجزائری مجاہدہ کو جزیرے سے نکالنے کا پختہ عزم کر چکا ہوں تو اس نے مجھے اپنی سکیم بتا دی۔ ہر پندرہ دن کے بعد کاؤنٹ کے جزیرے کو ضروری سامان لے کر ایک سٹیمر جاتا تھا۔ یہ سامان ایک کنٹریکٹر سپلائی کرتا تھا جو رولاں کا دوست تھا اور جس سے رولاں نے بات پکی کر لی تھی سکیم یہ تھی کہ مجھے سامان لے جانے والے لکڑی کے بڑے کھوکھوں یعنی کریٹوں میں سے ایک کریٹ میں چھپا دیا جائے گا۔ یہ کریٹ جزیرے کے ایک گودام میں جا کر سٹور کر دیئے جاتے تھے۔ اس گودام میں پہنچنے کے بعد مجھے خود ہی کریٹ سے نکل کر کاؤنٹ کے قلعے تک رسائی حاصل کرنا تھی۔ وہاں رولاں میری کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ میں جذبات کے جوش میں آکر سکیم پر عمل کرنے پر تیار ہو گیا۔ جذبات کی میں نے ہمیشہ قدر کی ہے۔ جذبات ہی زندگی کا ثبوت ہیں۔ یہی انسان کو زندہ رکھتے ہیں۔ مارسلیز سے کاؤنٹ کے جزیرے تک سٹیمر نے چار گھنٹوں میں سمندری

سفر طے کرنا تھا۔ اور مجھے دو گھنٹے پہلے لکڑی کے کھوکھے میں بند ہو جانا تھا۔

یہ ایک ایسا تجربہ تھا جو مجھے ساری زندگی یاد رہے گا۔

===== ☐ ☐ =====

مجھے چھ گھنٹے لکڑی کے کھوکھے میں بند رہنا تھا۔ دو گھنٹے سمندر میں سفر کرنے
پہلے اور اس کے بعد چار گھنٹے کا سمندری سفر تھا۔ میرے لئے یہ تجربہ بالکل نیا اور کس
تک خطرناک بھی تھا۔ اگرچہ میرے فرانسیسی دوست رولاں نے مجھے یقین دلایا تھا
کھوکھے کی دیواروں میں جگہ جگہ ایسے سوراخ کر دیئے جائیں گے جہاں سے مجھے تازہ
اندر آتی رہے گی۔ لیکن ایسا بھی ہو سکتا تھا کہ میرا کھوکھا سٹیمر کے گودام میں دوسر
سامان کے بیچ میں دب جائے اور میرا دم گھٹنے لگے۔

جب میں نے اس خدشے کا اظہار کیا تو رولاں کہنے لگا۔

"جس کریٹ میں تم بند کئے جاؤ گے اسے شارل خاص طور پر ایسی جگہ الگ ر
گا۔ جہاں تمہیں تازہ ہوا ملتی رہے گی۔ موسم سرد ہے۔ اندر تمہیں گرمی کا احساس
نہیں ہو گا"۔

بہرحال مجھے اس مرحلے سے گذرنا ہی تھا۔ چنانچہ ایک روز شام کو وقت مقررہ پر
بندرگاہ کے ایک نیم روشن سرد گودام میں پہنچا دیا گیا۔ یہاں بہت سا سامان پڑا تھا۔
پہلے سے موجود تھا۔ اس نے گودام کا دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ کونے میں لکڑی کا
ڈبہ پڑا تھا جو کوئی ڈھائی فٹ اونچا اور چھ فٹ لمبا تھا۔ اس میں تین چار جگہوں
سوراخ رکھے گئے تھے۔ اس ڈبے کے اندر فوم کا پتلا بستر بچھا تھا۔ دیواروں کے ساتھ
چھوٹے چھوٹے فوم کے تکیے لگے تھے تا کہ کھوکھے کو ادھر ادھر لڑھکانے سے
تکلیف نہ ہو۔ پہلو کی دیواروں پر ہکیں بھی لگی تھیں۔ جنہیں بوقت ضرورت میں

زن ٹھیک رکھ سکتا تھا۔ کریٹ کے اندر ہی لوہے کا ایک ڈیڑھ فٹ لمبا سریا بھی تھا۔
کی مدد سے مجھے کریٹ کا ڈھکنا اکھاڑ کر باہر نکلنا تھا۔ شارل کہنے لگا۔

"میں ڈھکن کو بڑے کیلوں کی بجائے چھوٹے کیلوں سے بند کروں گا تا کہ وہاں
اسے کھولنے میں آسانی ہو"۔

رولاں نے مجھے ایک بھرا ہوا ریوالور اور کچھ فالتو گولیاں بھی دیں۔ پستول کے آگے
لینسر لگا تھا۔ کہنے لگا۔ "اسے بغیر ضرورت کے مت چلانا"۔

شارل نے گھڑی دیکھی اور کہنے لگا۔

"وقت ہو گیا ہے وہ لوگ سامان نکالنے آنے ہی والے ہیں۔ اب تم کریٹ کے اندر
جاؤ"۔

مرتا کیا نہ کرتا۔ میں کریٹ کے اندر فوم کے پتلے بستر پر سیدھا لیٹ گیا۔ رولاں نے

"اب آگے سب کچھ تمہیں خود ہی سنبھالنا ہے وہاں ہم تمہاری کوئی مدد نہیں کر
گے کیونکہ ہم میں سے کوئی وہاں نہیں جا سکتا۔ ایک بار پھر سوچ لو"۔

میں ناصرہ کو جابر کاؤنٹ کے رحم و کرم پر چھوڑ کر واپس الجزائر کیسے جا سکتا تھا۔ ان
کے مجھ پر بڑے احسان تھے اور پھر یہ بہادر مسلمان حریت پسند لڑکی اسلام اور اپنے
کی خاطر ساری مصیبتیں جھیل رہی تھی۔ میں نے پرعزم لہجے میں کہا۔

"میں ضرور جاؤں گا۔ جو ہو گا دیکھا جائے گا"۔

شارل نے کریٹ کے اوپر ڈھکنا رکھ دیا۔ یہ پلائی ووڈ کا ڈھکنا تھا۔ باقی کریٹ سخت
کا بنا ہوا تھا۔ ایک دم اندھیرا چھا گیا اور مجھے یوں لگا جیسے میں کسی قبر میں بند ہو گیا
۔ ایک بار تو میرا دل گھبرا گیا اور جسم میں خوف کی سرد لہر دوڑ گئی۔ پھر میں نے اپنے
کو درست کیا۔ اور آنکھیں بند کر لیں۔ کریٹ کے ڈھکن کے کناروں پر چھوٹی
ونکی جا رہی تھیں۔ میں نے محسوس کیا کہ بند کھوکھے میں میرے سرہانے اور
نی کی جانب سے تازہ ہوا اندر آ رہی تھی۔ گودام میں سخت سردی تھی مگر بند
ے کے اندر گرماہٹ تھی۔ اگر گرمیوں کا موسم ہوتا تو میرے لئے شاید بند کھوکھے

میں پانچ منٹ گذارنے بھی مشکل ہو جاتے۔

ڈھکن بند کر دیا گیا۔ رولاں نے اوپر آہستہ سے ہاتھ مار کر کہا۔

"خدا حافظ دوست ! اگر تم کاؤنٹ کے جزیرے سے کامیاب واپس آگئے تو میرے گیراج میں آجانا۔ میں تمہیں اور ناصرہ کو الجزائر پہنچانے کا بندوبست کر دوں گا" میں نے کوئی جواب نہ دیا مجھے ان دونوں کے قدموں کی آواز گودام کے دروازے جاتی سنائی دی۔ اس کے بعد وہاں خاموشی چھا گئی۔ تھوڑی دیر بعد آبی پرندوں کے بولنے کی آواز آجاتی تھی۔ دور سے کسی سمندری جہاز کا وسل بار بار سنائی دے رہا تھا۔

تھوڑی ہی دیر میں میرا جسم اکڑ کر لکڑی کی طرح ہو گیا۔ میں اپنے جسم کو ادھر ادھر ہلانے لگا۔ جس سے کچھ سکون محسوس ہوا۔ کوئی گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے بعد گودام کا دروازہ کھلا اور کچھ مزدور آپس میں فرانسیسی زبان میں باتیں کرتے اندر داخل ہوئے۔ وہ ... گھسیٹ گھسیٹ کر باہر لے جانے لگے۔ وہ ایک ٹھیلہ بھی ساتھ لائے تھے۔ اس ٹھیلے کو میں نے بائیں جانب والی دیوار کے سوراخ میں سے دیکھا۔

پھر وہ میرے کریٹ کی طرف آئے۔ میں نے دیوار میں ٹھکی لوہے کی کھوں کو ... ہاتھوں سے پکڑ لیا۔ انہوں نے کریٹ کو اٹھا کر ٹھیلے پر رکھ دیا۔ پھر کچھ دوسرے میرے اوپر رکھے اور ٹھیلہ چلاتے گودام سے باہر نکل آئے۔ یہاں جیٹی پر روشنی میں نے سوراخ میں سے دیکھا کہ جیٹی کے ساتھ ہی ایک سٹیمر لگا تھا۔ اسی پر سامان ... رہا تھا۔ میرے والا کریٹ بھی سٹیمر پر لے جا کر ایک طرف ڈال دیا گیا۔ سوراخوں میں سمندر کی ٹھنڈی ہوا اندر آ رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد سٹیمر کاؤنٹ کے جزیرے کی چل پڑا۔ دو ملاح میرے کھوکھے کے اوپر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ میں فرانسیسی زبان ... لگا تھا وہ موسم کی کسی پیش گوئی کا ذکر کر رہے تھے جس میں کہا گیا تھا کہ سمندر میں ... آنے والا تھا۔ مگر یہ طوفان رات کو آئے گا۔ چار گھنٹے سٹیمر سمندر میں چلتا رہا۔ ... رفتار زیادہ نہیں تھی۔ میں کھوکھے میں سیدھا لیٹا بالکل پتھر ہو گیا تھا خدا خدا کر کے جزیرے کے ساحل پر جا کر رک گیا۔

جس کریٹ یا لکڑی کے لمبے کھوکھے میں میں بند تھا اسے بھی دوسرے سامان کے ساتھ اٹھا کر جزیرے کے گودام میں کسی جگہ رکھ دیا گیا۔ چھ گھنٹے سے لکڑی کی قبر میں بند تھا۔ میرا برا حال ہو رہا تھا۔ کبھی لگتا کہ ابھی دم نکل جائے گا۔ سارا بدن ... ہو رہا تھا۔ جب کچھ لوگ میرے کھوکھے کو رکھ کر چلے گئے تو میں باہر نکلنے کے واسطے بے تاب ہو گیا۔ مگر یہاں بڑی احتیاط کی ضرورت تھی۔ ذرا سی بے احتیاطی مجھے موت کے منہ میں دھکیل سکتی تھی۔ میں ایک سنگدل ظالم کاؤنٹ کے جزیرے پر پہنچ چکا تھا اور بالکل اکیلا تھا۔ عین ممکن تھا کہ گودام میں محافظ موجود ہوں۔

میں نے کان لگا کر سننے کی کوشش کی۔ گودام میں گہری خاموشی تھی۔ کسی طرف سے کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ اس وقت رات کے دو بجے کا عمل ہو گا۔ لوہے کا سریا میرے پاس ہی رکھا تھا۔ میں نے اللہ کا نام لے کر لیٹے ہی لیٹے سریا اٹھایا اور اس کی مدد سے لکڑی کا اوپر والا حصہ آہستہ آہستہ اکھاڑنے لگا۔ میں بڑی احتیاط سے کام کر رہا تھا باہر ذرا سی بھی آواز پیدا نہ ہو۔ پندرہ بیس منٹ کی کوشش کے بعد میں لکڑی کے کریٹ سے باہر آگیا۔ میں نے دیکھا کہ میرا کریٹ کچھ کھوکھوں کے اوپر پڑا تھا۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ میرے اوپر کوئی کھوکھا نہیں تھا۔ میں نے آہستہ سے نیچے چھلانگ لگا دی۔

یہ ایک اونچی چھت والا کافی کشادہ گودام تھا جو مختلف قسم کے سامان سے بھرا ہوا تھا۔ چھت کے درمیان میں ایک بلب روشن تھا۔ سامنے اونچا دروازہ تھا جو بند تھا۔ وہاں محافظ کوئی نہیں تھا۔ میں دروازے کے پاس گیا۔ دروازہ باہر سے بند تھا۔ اور اتنا مضبوط تھا کہ میں اسے کھول نہیں سکتا تھا۔ ایک طرف کھڑے ہو کر میں نے گودام کا جائزہ لیا۔ ایک

طرف دیوار میں چھت کے پاس ساتھ ساتھ بنے ہوئے تین روشندان تھے۔ میں لکڑی کے کھوکھوں پر چڑھ کر روشندان تک پہنچ گیا۔ روشندان ایسا تھا کہ اس کا شیشے کا چوکھٹا اوپر کو اٹھ جاتا تھا۔ میں نے اوپر اٹھایا تو باہر سے سمندری ہوا کا ٹھنڈا جھونکا میری پیشانی سے چھو کر گزر گیا۔ میں نے سر باہر نکال کر دوسری طرف دیکھا۔ دوسری طرف رات کی تاریکی میں مجھے سیاہ چٹانوں اور سمندر کی تاریک موجوں کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ بہر حال مجھے اس روشندان سے نیچے اترنا تھا۔ گودام میں سے مجھے نائلون کی رسی مل گئی جس کو روشندان کے اوپر والے کنڈے سے میں نے دہرا کر کے نیچے گذار دیا کہ نیچے اترنے کے بعد رسی بھی کھینچ سکوں تاکہ کسی کو یہ پتہ نہ چلے کہ کوئی یہاں سے باہر نکلا ہے۔ تھوڑی دیر بعد میں سمندر کے کنارے چھوٹی چھوٹی چٹانوں کے درمیان اتر گیا۔ رسی کو کھینچ کر اس کا گچھا بنایا اور سمندر میں پھینک دیا۔ میں چٹانوں کے درمیان سے گذرتا ہوا گودام سے کچھ دور چڑھائی چڑھ کر اوپر زمین کی سطح پر آگیا جہاں گھاس اگی تھی۔ اور اندھیرے میں کچھ فاصلے پر درختوں کے جھنڈ نظر آرہے تھے۔ ان کی بائیں جانب ایک اونچی جگہ پر روشنی ہو رہی تھی۔ میں اس روشنی کی طرف چل پڑا۔ سمندری لہریں ساحلی چٹانوں سے ٹکراتیں تو ان کا شور بلند ہوتا جو اب میرے پیچھے رہ گیا تھا۔ میری پوزیشن عجیب و غریب تھی۔ یعنی میں ایک سفاک قاتل کاؤنٹ کے جزیرے پر تھا جہاں اس کی اپنی حکومت تھی اور اس کے محل سے یا اس کے محل کے قید خانے سے الجزائر کی حریت پسند لڑکی ناصرہ کو نکال کر لے جانے والا تھا۔ میرے پاس صرف وہی ایک بھرا ہوا ریوالور اور کچھ فالتو گولیاں تھیں جو میرے فرانسیسی دوست نے میرے ساتھ رکھ دی تھیں۔ مجھے یہ بھی علم نہیں تھا کہ وہ قید خانہ کہاں ہے جہاں ناصرہ قید ہے۔ ابھی تک مجھے کاؤنٹ کا محل بھی دکھائی نہیں دیا تھا۔ جس روشنی کی طرف میں جا رہا تھا وہ ایک ٹیلے پر بنے ہوئے چھوٹے سے لائیٹ ہاؤس سے نکل رہی تھی۔ روشنی کا رخ سمندر کی طرف تھا۔ میں اس طرف جانے کی بجائے دوسری طرف مڑ گیا۔ رات کی تاریکی نے مجھے محافظوں کی نظروں سے چھپا رکھا تھا۔ جزیرے پر ادھر ادھر کافی درخت تھے۔ زمین اونچی نیچی تھی۔ میں ایک جگہ چڑھائی چڑھ گیا۔ اوپر سے تو دیکھا کہ دوسری طرف ایک کھلی جگہ کے وسط میں شاندار عمارت کھڑی ہے۔ جس

ہیں کہیں روشنی ہو رہی ہے۔ ارد گرد اونچی دیوار ہے جس کے درمیان میں لوہے کا ایک ٹ تھا جہاں دو گارڈ پہرہ دیتے ہوئے ٹہل رہے تھے۔ یقیناً یہی کاؤنٹ کا محل تھا۔ اور ور ناصرہ اسی محل میں کسی جگہ قید تھی۔ اب سوال یہ تھا کہ مجھے کیسے پتہ چلے کہ ناصرہ ہاں پر ہے اور میں خود اندر کس طرح جاؤں؟ رات گذرتی جا رہی تھی۔ صبح ہونے میں ادہ دیر نہیں تھی۔ مجھے جو کچھ بھی کرنا تھا صبح ہونے سے پہلے پہلے کرنا تھا۔ دن کی روشنی ے لئے بہت بڑا خطرہ بن سکتی تھی۔ میں ٹیلے سے اتر کر کاؤنٹ کے محل کی اونچی دیوار قریب آکر چھپ گیا۔ میں نے دیکھا کہ ایک پتلی سی سڑک دور درختوں کی طرف سے کے گیٹ کی طرف آتی تھی۔ میں اس سڑک پر آکر پیچھے کی طرف چلنے لگا۔ میں ختوں کے نیچے اندھیرے میں چل رہا تھا۔

اچانک میرے کانوں میں کسی ٹرک کے رینگ رینگ کر چلنے کی آواز آئی۔ میں رک ا۔ دور سڑک پر ایک ٹرک کی ہیڈ لائٹس نمودار ہوئیں ٹرک آہستہ آہستہ محل کے ٹ کی طرف آرہا تھا۔ اس پر اتنا سامان لدا ہوا تھا کہ بہت آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ یا محل کے قریب آجانے کی وجہ سے اس کی رفتار ہلکی کر دی گئی تھی۔ جب ٹرک ے قریب سے گذرا تو میں دوڑ کر اس کے پیچھے چلا گیا۔ ترکیب میں نے اسی وقت ہی تھی۔ پیچھے سے ٹرک کھلا تھا اور اس کی زنجیر نیچے لٹک رہی تھی۔ میں زنجیر کو پکڑ کر کے اوپر چڑھ گیا۔ اور بوریوں اور لکڑی کے چھوٹے بڑے ڈبوں کے درمیان چھپ بیٹھ گیا۔ شاید یہ سامان گودام سے لایا جا رہا تھا۔ ٹرک گیٹ پر رک گیا۔ ڈرائیور نے ڈز کو ہیلو ہیلو کیا۔ میں بوریوں کے نیچے چھپا ہوا تھا۔ گارڈز نے پیچھے آکر ٹرک کے ان کا جائزہ لیا اور ڈرائیور کے لئے گیٹ کھول دیا۔ ٹرک اسی طرح رینگتا ہوا محل کے طے میں داخل ہوا اور ایک چکر کاٹ کر کسی جگہ رک گیا۔ میں نے بوریوں میں سے سر کر دیکھا۔ یہ محل کا عقبی حصہ تھا جہاں اونچے درختوں کے نیچے بائیں جانب ایک لمبی ئی ہوئی تھی۔ میں نے ٹرک میں سے چھلانگ لگائی اور بارک کی طرف دوڑ پڑا۔

=====

میری زندگی کے ایک ہنگامہ خیز سفر کی کہانی جوں جوں آگے بڑھ رہی ہے نئے نئے موڑ سامنے آ رہے ہیں۔ تحیر و تجسس کے پرخطر دروازے کھلتے چلے جا رہے ہیں۔ ہر قدم موت قریب سے ہو کر گذر جاتی ہے۔ صحرا ختم ہوتا ہے تو خونخوار درندوں سے بھرا جنگل شروع ہو جاتا ہے۔ شہر ایسے آتے ہیں کہ جہاں موت گھات لگائے بیٹھی ہوتی ---- آج پر سکون زندگی کی تنہائی میں بیٹھا جب یہ حیرت میں ڈالنے والی داستان حیات بند کر رہا ہوں تو یقین نہیں آتا کہ کبھی ایسے ہولناک واقعات سے بھی واسطہ پڑا تھا۔ کبھی اس آگ اور خون کے دریا سے بھی گذر گیا تھا۔

یہ واقعات دوسری عالمی جنگ کے بعد کے ہیں جب جرمنی کو شکست ہو چکی تھی ہٹلر اپنی چانسلری میں موت کو گلے لگا چکا تھا اور مشرق وسطیٰ اور مشرق بعید کے وہ ممالک جن پر یورپی استعمار نے قبضہ کر رکھا تھا۔ غلامی کی زنجیریں توڑ کر آزاد ہونے کی جدوجہد میں مصروف تھے اور اس آزادی میں اپنی جانوں کے نذرانے پیش کر رہے تھے۔ الجزائر بھی ایسے ہی ممالک میں ایک ملک تھا جو فرانس کے جبرو استبداد کے خلاف جہاد کر رہا تھا اور جہاں کے مسلمان حریت پسندوں کی تحریک آزادی اپنے عروج پر تھی۔

ناصرہ بھی انہی حریت پسندوں کی آگ کی ایک بھڑکتی ہوئی چنگاری تھی جسے فرانس پولیس نے گرفتار کر کے جنوبی فرانس کے اس چھوٹے سے جزیرے کے مطلق العنان ظالم کاؤنٹ کے حوالے کر دیا تھا۔ فرانس کی حکومت نے اس الجزائری دلیر حریت

خاتون کو زندہ درگور کر کے اس سے بڑا بھیانک انتقام لیا تھا۔ اور میں نے اس عظیم خاتون کو ظلم کے چنگل سے نکال کر لے جانے کے لئے جزیرے کے جہنم میں چھلانگ لگا دی تھی۔

رات کا اندھیرا' فرانس کے سرد موسم کی سرد ویران اندھیری رات ----- مارسلیز کے ساحل سے دور بیچ سمندر کا یہ اذیت ناک جزیرہ' جس کی مرطوب فضا میں ہر سانس کے ساتھ موت کی پھنکار سنائی دیتی تھی۔ میں ٹرک سے کود کر ایک بارک کی طرف دوڑا تھا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ اس بارک میں کیا ہے۔ میرے لئے وہاں زندگی کی پناہ ہے یا موت گھات لگائے بیٹھی ہے۔ یہ بارک کاؤنٹ کے محل کے احاطے کے اندر تھی۔ یہ یورپ کے دیہاتی طرز کا ایک فارم ہاؤس سا تھا جو خالی پڑا تھا۔ ایک طرف خشک گھاس کے گٹھے پڑے تھے۔ بارک کے دوسرے دروازے کی طرف ایک پتھر کا زینہ اوپر محل کی گیلری کو جاتا تھا۔ میں زینہ چڑھ گیا۔ یہاں کسی جگہ کوئی پہرے دار نہیں تھا۔ شاید اس لئے کہ وہاں کسی غیر آدمی کے آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ گیلری بھی خالی تھی۔ کونے کی جانب کوئی کمرہ تھا جس کا دروازہ ہلکی سی آواز کے ساتھ کھلا۔ میں جلدی سے اندھیرے میں ہو گیا۔ یہاں سردی تھی۔ سرد مرطوب ٹھنڈے آسمان پر ستارے چمک رہے تھے۔ کمرے میں سے ایک انسانی سایہ باہر نکلا اور گیلری کے نیچے جھانکنے کے بعد واپس کمرے میں چلا گیا۔ دروازہ دوبارہ بند ہو گیا۔ میں دبے پاؤں دروازے کی طرف بڑھا۔ باہر کی جانب دروازے کے اوپر کوئی روشندان نہیں تھا۔ کمرے کے اندر سے ایک عورت اور ایک مرد کے باتیں کرنے کی ہلکی ہلکی آواز آ رہی تھی میں نے بند دروازے کے ساتھ کان لگا دیئے۔ عورت فرانسیسی زبان میں کہہ رہی تھی۔ "میں بھی عورت ہوں مجھ سے اس عورت کی یہ حالت نہیں دیکھی جاتی۔"

مرد نے اسے جھڑک کر کہا۔ "تم خاموش رہو۔ اگر کاؤنٹ نے یہ بات سن لی تو وہ تمہارے ساتھ میری بھی گردن اڑا دے گا۔"

عورت بولی۔ "اس الجزائری لڑکی نے کوئی جرم نہیں کیا۔ وہ اپنے ملک کی آزادی کی

خاطر لڑ رہی ہے اور یہ کوئی جرم نہیں۔ تم اتنے بے حس کیوں ہو گئے ہو"۔

مرد نے اس بار عورت کو بری طرح سے جھڑک دیا اور کہا۔ "آج تو تم اس کے لئے سوپ لے کر چلی جاؤ۔ کل سے میں جایا کروں گا۔ اور خبردار اگر کسی کے سامنے ایسی بات کی۔ جاؤ اب۔"

میں جلدی سے دروازے سے ہٹ گیا اور دبے پاؤں دوڑتا ہوا گیلری کے زینے پر آ گیا۔ کمرے کے دروازے میں سے ایک عورت کا سایہ نمودار ہوا جس نے ہاتھ میں ایک ڈول سا اٹھا رکھا تھا۔ یقیناً یہ ناصرہ کے لئے سوپ لے جا رہی تھی۔ اس عورت کو ناصرہ سے ہمدردی تھی۔ اس عورت سے بڑا کام لیا جا سکتا تھا۔ عورت نے برانڈی کی طرز کا لمبا گرم کوٹ پہنا ہوا تھا۔ سر اونی ٹوپی میں چھپا تھا۔ وہ گیلری کی دائیں جانب گھوم گئی۔ میں بھی دبے پاؤں اس کے پیچھے لگ گیا۔ گیلری کی دائیں جانب ایک اور زینہ نیچے محل کے باغ میں اترتا تھا۔ عورت اس باغ میں سے گذرتی' جہاں باغ ختم ہوتا تھا وہاں پہنچ کر رکی۔ پیچھے مڑ کر دیکھا اندھیرا تھا۔ میں ایک درخت کی اوٹ میں کھڑا تھا شاید اسے شبہ ہو گیا تھا کہ کوئی اس کا تعاقب کر رہا ہے۔ جب اسے اطمینان ہو گیا تو سامنے والے درختوں کے سیاہ جھنڈ میں جا کر میری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ میں تیز تیز قدم اٹھاتا اس کے پیچھے چلا۔ یہ دس بارہ بڑے پرانے درختوں کا ایک جھنڈ تھا جس کے درمیان میں ایک چھوٹا سا ٹیلا تھا۔ ٹیلے کے سامنے کی طرف لوہے کا چھوٹا سا دروازہ تھا جس کے باہر دو آدمی پہرا دے رہے تھے۔ ان کے پاس تھری ناٹ تھری کی رائفلیں تھیں۔ ان میں سے ایک سٹول پر بیٹھا تھا اور دوسرا ٹہل کر پہرہ دے رہا تھا۔ عورت کو دیکھ کر وہ بھی رک گیا اور فرانسیسی زبان میں بولا۔ "ماریا ! آج تم نے کچھ دیر نہیں کر دی؟"

اس عورت کا نام ماریا تھا وہ کہنے لگی۔ "ہاں آج کچھ دیر ہو گئی"۔

دوسرے سپاہی نے دروازہ کھول دیا۔ ماریا سوپ لے کر زینہ اتر گئی جو کسی تہہ خانے کو جاتا تھا۔ ناصرہ یقیناً اسی تہہ خانے میں قید تھی۔ میں وہیں چھپا رہا۔ تھوڑی دیر بعد ماریا باہر نکلی تو میں باغ میں سے گذر کر گیلری کی دیوار کے پاس آ کر چھپ گیا۔ ماریا درختوں

کے جھنڈ سے گذرتی باغ میں آ گئی تھی۔ اب اس کے ہاتھ میں سوپ کا ڈول نہیں تھا۔ جب وہ میرے قریب سے گذرنے لگی تو میں بہت بڑا خطرہ مول لیتے ہوئے اچانک اس کے سامنے آ گیا اور فرانسیسی زبان میں اسے کہا۔

"ماریا بہن ! میں اس الجزائری لڑکی کا بھائی ہوں جس کو تم ابھی سوپ دے کر آئی ہو"۔

ماریا کے حلق سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔



اگر میں ماریا کے منہ پر ہاتھ نہ رکھتا تو واقعی دہشت کے مارے اس کی چیخ نکل جاتی اور کچھ فاصلے پر موجود قید خانے کے گارڈز ہوشیار ہو جاتے۔ مجھے معلوم تھا کہ اس فرانسیسی خاتون کو الجزائری حریت پسند مسلمانوں سے ہمدردی ہے اور وہ ناصرہ پر تہہ خانے میں ظلم ہوتا نہیں دیکھ سکتی۔ میں اسے بازو سے پکڑ کر ایک طرف اندھیرے میں لے گیا۔ ماریا نے مجھے گھور کر دیکھا اور بولی۔

"تم ناصرہ کے بھائی نہیں ہو سکتے۔ اس لئے کہ تم خراب فرانسیسی بولتے ہو سچ بتاؤ تم کون ہو۔ ورنہ میں ابھی شور مچا کر تمہیں گارڈز کے حوالے کر دوں گی"۔

میں نے جلدی جلدی ٹوٹی پھوٹی فرانسیسی میں ساری کہانی بیان کر دی۔ ماریا میری باتوں سے بڑی متاثر ہوئی۔ کہنے لگی۔ "تم نے اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر ثابت کر دیا ہے کہ تم حریت پسندوں کے سچے دوست ہو۔ میں تمہاری ضرور مدد کروں گی۔ مجھے بھی ان بہادر مسلمان حریت پسندوں سے بڑی عقیدت ہے جو فرانس ایسی طاقت کے جبر کے خلاف بے سروسامانی کی حالت میں جنگ کر رہے ہیں۔ ابھی میں تم سے زیادہ گفتگو نہیں کر سکتی۔ اس چار دیواری کے جنوب میں ایک غیر آباد بارک ہے۔ تم وہاں جا کر چھپ جاؤ۔ میں خود تم سے وہاں ملوں گی۔ مگر یاد رہے وہاں سے باہر ہرگز مت نکلنا"۔ یہ کہہ کر ماریا گیلری میں اپنے کمرے کی طرف دوڑ گئی۔

غیر آباد ویران بارک کا مجھے پتہ تھا۔ میں وہاں آ کر ایک جگہ دیوار کی اوٹ میں ہو کر بیٹھ گیا۔ مجھے ماریا کے تعاون پر پورا بھروسہ تھا۔ نیند انسان کی ایسی دوست ہے کہ آپ

ے نہ بھی بلائیں، وہ جب بھی آپ کے اعصاب کو سکون پہنچانے آ موجود ہو گی۔ چنانچہ ے بھی نیند آ گئی۔ آنکھ کھلی تو دن کی روشنی بارک کے باہر کاؤنٹ کے قلعے کے سرسبز و اب احاطے کے درختوں اور اندلسی طرز کی بنی ہوئی سفید بارہ دریوں میں پھیلی ہوئی تی۔

میں نے اپنے حواس کو پوری طرح بیدار کیا۔ گرم جیکٹ مجھے بہت حد تک سردی ے بچا رہی تھی۔ میں بارک کے اندر ٹوٹی ہوئی کھڑکی کے پاس فرش پر بیٹھا کاؤنٹ کے ل کو جاتی روش کو تک رہا تھا۔ بائیں جانب گیلری تھی جس کے ستونوں پر کوئی پھول دار ل چڑھی ہوئی تھی۔ دھوپ نکل آئی تھی۔ میں نے ایک درمیانے قد کی عورت کو ہاتھ ں ٹوکری تھامے بارک کی طرف آتے دیکھا۔ یہ ماریا ہی ہو سکتی تھی۔ رات کے دھیرے میں میں اس کی شکل اچھی طرح سے نہ دیکھ سکا تھا۔ لیکن صرف وہی جانتی تھی ہ میں ویران بارک میں چھپا ہوا ہوں۔ وہ دوسری طرف سے بارک میں داخل ہوئی ی۔ غیر ارادی طور پر پستول پر میرے ہاتھ کی گرفت مضبوط ہو گئی کیونکہ یہ کوئی دشمن رت بھی ہو سکتی تھی۔ مگر وہ ماریا ہی تھی۔ جب اس نے مجھے آہستہ سے آواز دی تو میں نے اس کی آواز پہچان لی۔ وہ میرے لئے کچھ کھانے پینے کو لائی تھی۔ وہ دیوار کی اوٹ ں ہو کر میرے قریب بیٹھ گئی اور کہنے لگی۔

"تم ناصرہ کو یہاں سے اپنے ساتھ نہیں لے جا سکو گے۔ مجھے اس کا افسوس ہے۔"

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ "مگر میں تو اسے اپنے ساتھ لے جانے کا عہد رکے آیا ہوں ماریا بہن!"

ماریا بولی۔ "تم ایسا اس لئے نہیں کر سکو گے کہ کل شام ناصرہ کو کاؤنٹ کے حکم سے ت کی سزا دے دی جائے گی۔"

میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ "یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟"

ماریا نے افسوس بھرے لہجے سے کہا۔

"رات تم سے یہ بات کرنے کا موقع نہیں تھا۔ کاؤنٹ نے کل ہی یہ حکم جاری کر دیا

تھا۔ کل شام سورج غروب ہونے کے ساتھ ہی اسی قید خانے میں جلاد اس کی گردن قلم کر دے گا۔"

میں نے ماریا کا ہاتھ تھام لیا اور کہا۔ "ماریا بہن! تمہیں تو حریت پسندوں کے ساتھ پوری ہمدردی ہے۔ تم تو جانتی ہو کہ یہ لوگ غیر ملکی سامراج سے اپنے وطن کو آزاد کرانا چاہتے ہیں اور یہ کوئی جرم نہیں ہے۔ پھر تم ناصرہ کی موت کو کیسے گوارا کر لو گی؟"

ماریا نے ناامیدی کے لہجے میں کہا۔ "مگر میں کیا کر سکتی ہوں؟"

میں نے کہا۔ "تم اگر تھوڑی سی کوشش کرو تو اس معصوم لڑکی کی جان بچا سکتی ہو۔"

ماریا جیسے سوچ میں ڈوب گئی۔ پھر اس نے اپنی نیلی نیلی چمکدار آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور کہنے لگی۔ "ہمارے پاس ناصرہ کی جان بچانے کے لئے صرف آج کا دن اور رات ہے۔ میں صرف اتنا کر سکتی ہوں کہ تمہیں تہہ خانے میں جانے کا ایک خفیہ راستہ بتا دوں۔ آگے سب کچھ تمہیں خود ہی کرنا ہو گا۔"

میں نے کہا۔ "فرض کر لیا میں ناصرہ کو تہہ خانے سے نکال لایا تو مجھے یہاں کچھ دیر اسے چھپائے رکھنے کے لئے کسی جگہ کی ضرورت ہو گی"۔

ماریا بولی۔ "اگر تم نے ایسا کر لیا تو پھر ناصرہ کو لے کر اسی پارک میں آ جانا میں تمہیں یہاں سے ایک محفوظ جگہ پر لے جاؤں گی"۔

میں نے کہا۔

"میرے پاس ایک ریوالور ضرور ہے لیکن اس کے فائر سے دھماکہ پیدا ہو گا اور دوسرے پہرے دار ہوشیار ہو جائیں گے۔ کیا تم مجھے کہیں سے کوئی خنجر لا کر دے سکتی ہو؟"

ماریا نے کچھ سوچ کر جواب دیا۔ خنجر تمہیں دھوکا دے سکتا ہے۔ میں تمہیں ایسا پستول لا کر دے سکتی ہوں جس کی نالی کے آگے سائی لینسر لگا ہوا ہے۔ اس کا فائر کرو تو دھماکہ نہیں ہوتا"۔

میں بڑا خوش ہوا۔ ایسے حالات میں یہ پستول بے حد کام دے سکتا تھا۔ ماریا چلی گئی۔ میں وہیں پارک میں چھپا رہا۔ دوپہر کے بعد وہ دوبارہ آئی تو ایک رومال میں میرے لئے سینڈوچز اور پانی کی بوتل لائی تھی۔ میں نے پستول کا پوچھا تو اس نے اپنے لمبے گرم کوٹ کی جیب میں سے ایک پستول نکال کر مجھے دیا جس کے آگے سائی لینسر لگا ہوا تھا۔ کہنے لگی۔

"یہ بھرا ہوا ہے۔ چلانے سے پہلے صرف اس کا سیفٹی کیچ ہٹانا پڑے گا۔ اس میں چھ گولیاں ہیں۔"

میں نے پستول کے میگزین کو چیک کیا۔ فرانس کا بنا ہوا پستول تھا۔ میں نے اسے جیب میں چھپا کر رکھ لیا اور ماریا سے تہہ خانے کے خفیہ راستے کے بارے میں پوچھا۔ وہ کہنے لگی۔

"جب رات گہری ہو جائے گی تو میں آؤں گی۔ پھر تمہیں اپنے ساتھ اس جگہ لے چلوں گی جہاں سے ایک چھوٹی سی سرنگ تہہ خانے کے اندر جاتی ہے۔" اس دوران میں آج شام تہہ خانے میں ناصرہ کو کسی نہ کسی بہانے وہاں جا کر سارے حالات سے باخبر کر دوں گی تاکہ وہ ہوشیار رہے۔ اب میں چلتی ہوں۔ میرا خاوند بڑا ظالم ہے۔ اس کو ذرا سی بھنک بھی پڑ گئی تو مجھے جان سے مار دے گا۔"

ماریا چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد میں دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور پستول کا جائزہ لینے لگا۔



رات ہوئی تو آسمان پر بادل چھا گئے اور بوندا باندی شروع ہو گئی۔ اس کی وجہ سے سردی بھی بڑھ گئی۔ ماریا مجھے اپنی گرم اونی ٹوپی اور گلوبند دے گئی تھی۔ جس نے مجھے سردی سے بچائے رکھا۔ کاؤنٹ کے محل میں روشنی ہو رہی تھی اور کبھی کبھی کوئی گاڑی محل میں داخل ہوتی یا باہر کی طرف نکل جاتی تھی۔ یہ اس قدر پر اسرار محل تھا کہ بہت کم کوئی آواز سنائی دیتی تھی۔ میرے مشن کے لئے یہ بات بڑی مفید تھی۔ میں دل میں دعا مانگنے لگا کہ بارش زیادہ زور سے نہ ہو۔ شدید بارش میں ہمارا مشن ناکام ہو سکتا تھا۔ اور ہمارے مشن کی ناکامی کا مطلب ناصرہ کی موت تھی مگر خدا کا شکر رہا کہ بارش بوندا باندی سے آگے نہ بڑھی۔ میں بے چینی سے ماریا کا انتظار کر رہا تھا۔ کئی بار اپنی کلائی پر لگی ہوئی گھڑی کو دیکھا۔ جب گھڑی نے رات کے سوا بارہ بجائے تو مجھے تاریکی میں ایک انسانی سایہ بارک کی طرف آتا دکھائی دیا۔ یہ ماریا ہی تھی۔ وہ میرے لئے ڈبل روٹی کے دو ٹکڑے اور چھوٹی سی تھرمس میں گرم کافی لائی تھی۔ مجھے سردی بھی لگ رہی تھی اور بھوک بھی ----- ڈبل روٹی اور گرم کافی نے مجھے تازہ دم کر دیا۔ ماریا نے ہڈ والی برساتی پہن رکھی تھی۔ کہنے لگی۔ "اب میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ۔ میرے اور اپنے درمیان کم از کم پانچ قدموں کا فاصلہ رکھنا۔"

میں نے ایسا ہی کیا ہم بارک سے نکلے تو ماریا بائیں ہاتھ کو نیچے ایک ڈھلان اتر گئی۔ آگے درخت ہی درخت تھے۔ یہاں گہری تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ مجھے ماریا کا ایک سایہ سا ہی آگے جاتا نظر آ رہا تھا۔ خدا جانے کہاں کہاں سے گذر کر وہ ایک جگہ اونچے ٹیلے کے

ب میں جھاڑیوں کے پاس جا کر رک گئی میں اس کے قریب آیا تو وہ بیٹھ گئی اور ہاتھ ے اشارے سے مجھے بھی بیٹھ جانے کو کہا۔ میں اس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ وہ جھاڑیوں کو ھر ادھر ہٹانے لگی۔ جھاڑیوں کے پیچھے ایک سرنگ کا منہ نکل آیا جس کے اندر گہرا ھیرا چھایا ہوا تھا۔ ماریا نے بہت دھیمی آواز میں کہا۔

"یہ سرنگ ناصرہ کے تہہ خانے میں جاتی ہے۔ میں نے ناصرہ کو خبردار کر دیا ہے اگر ے اپنے ساتھ لانے میں کامیاب ہو گئے تو سیدھا بارک میں آجانا۔ وہاں سے میں یں ایک محفوظ پناہ گاہ میں لے چلوں گی۔ مگر زیادہ دیر نہ کرنا۔ اگرچہ میں نے اپنے ظالم ند کو نیند کی گولیاں کھلا دی تھیں مگر اس کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ گھبرانا نہیں۔ سرنگ ادہ لمبی نہیں ہے۔ دروازے پر تین بار ٹھک ٹھک کرنا۔ ناصرہ سمجھ جائے گی۔"

ماریا فوراً وہاں سے اٹھی اور اندھیرے میں جدھر سے آئی تھی ادھر کو غائب ہو گئی۔ ے کے جانے کے بعد میں اللہ کا نام لے کر سرنگ میں داخل ہو گیا۔ لگتا تھا کہ ایک مدت ے اس سرنگ میں انسان تو کیا کوئی جانور بھی داخل نہیں ہوا تھا۔ چھت میرے سر سے نکل دو چار انچ بلند تھی اور جگہ جگہ جالے لٹک رہے تھے۔ میں دونوں ہاتھوں سے ان کو ہٹاتا قدم قدم آگے بڑھ رہا تھا۔ سرنگ کی فضا حبس کی وجہ سے بوجھل تھی۔ یرے میں کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں اندازے سے قدم اٹھاتا چلا جا رہا تھا۔ ایک جگہ رنگ میں ڈھلان آ گئی۔ تھوڑی دور تک نشیب میں اترنے کے بعد سرنگ بائیں جانب ھا گئی۔ یہاں موڑ مڑتے ہی میں ایک دیوار سے ٹکرا گیا۔ ٹٹول کر دیکھا تو یہ دیوار نہیں ایک دروازہ تھا جس کو لوہے کے راڈ سے بند کر دیا گیا تھا۔ میں نے بے حد احتیاط کے تھ کافی زور لگا کر راڈ کو اٹھا دیا اور دروازے پر تین بار دستک دی اور پھر دروازہ کھول دروازہ کھلتے ہی قید خانے میں جلتی لالٹین کی روشنی مجھ پر پڑی۔ میرے سامنے ناصرہ ڑی تھی۔ وہ خستہ حال جرسی اور پتلون میں ملبوس تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے اپنے ٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے بولنے سے منع کیا۔ ایک نظر قید خانے کے بند دروازے اور ی سلاخ دار چھوٹی سی کھڑکی پر ڈالی اور جلدی سے سرنگ میں اتر آئی۔ اس کے ساتھ

ہی میں نے دروازہ بند کر کے لوہے کا راڈ دوبارہ لگا دیا۔ میں نے ناصرہ کا ہاتھ پکڑ لیا اور اندھیرے میں تیز تیز قدموں سے چلنے لگا۔ سرنگ سے باہر نکلے تو رات سرد اور تاریک تھی۔ بوندا باندی اسی طرح ہو رہی تھی۔ میں نے اپنا گلوبند ناصرہ کو اوڑھا دیا اور کہا "سب ٹھیک ہے ناصرہ۔ خدا ہماری مدد کر رہا ہے"

اور میں تاریکی میں اس بارک کی طرف بڑھا جہاں ماریا ہمارا بے چینی سے انتظار کر رہی تھی۔ ماریا ہمیں دیکھ کر بڑی خوش ہوئی۔ کہنے لگی۔ "یہ بڑی اچھی بات ہوئی ہے کہ تم ناصرہ کو موت کے منہ سے نکال لائے ہو۔ پستول چلانے کی ضرورت تو نہیں پڑی؟"

میں نے اسے بتایا کہ میرے ہاتھ سے کسی کا خون نہیں ہوا۔ ماریا بولی۔ "یہ بھی بڑی اچھی بات ہوئی ہے۔ اب میرے ساتھ آؤ۔"

ناصرہ نے پوچھا۔ "ہم کہاں جائیں گے ماریا؟ کیا ہم سمندر پار کر سکیں گے؟"

ماریا نے ناصرہ کو خاموش رہنے کی ہدایت کی اور ہمیں لے کر ایک ایسے گنجان درختوں والے جھنڈ کی طرف چل پڑی۔ جہاں گہری تاریکی چھائی رہتی تھی۔ ہم اس جھنڈ سے نکلے تو سامنے سمندر آگیا۔ یہاں ایک طرف سمندر کے کنارے ایک چھوٹا سٹیمر دھندلا دھندلا سا نظر آیا جو آدھا ریت پر چڑھ آیا ہوا تھا۔ ماریا نے ہمیں بتایا کہ یہ ٹوٹا پھوٹا پرانا سٹیمر ہے۔ جو ایک سمندری طوفان میں ساحل پر چڑھ آیا تھا اور اسے اس جگہ چھوڑ دیا گیا تھا۔ سٹیمر کے اندر ایک چھوٹا سا کیبن تھا۔ ماریا نے جیب سے موم بتی نکال کر روشن کی میں نے دیکھا کہ کیبن کی لکڑی کی دیواریں اور فرش جگہ جگہ سے ٹوٹ چکا تھا۔ کونے میں پٹ سن کی خالی بوریوں کا ڈھیر پڑا تھا۔ ماریا نے کہا۔

"اس طرف کبھی کوئی نہیں آتا۔ کسی کو شک بھی نہیں پڑے گا کہ تم لوگ یہاں چھپے ہوئے ہو۔"

ناصرہ نے پوچھا "لیکن ہمیں یہاں کب تک رہنا ہو گا ماریا بہن؟"

ماریا کہنے لگی۔ "اس سوال کا جواب میں تمہیں کل صبح آکر دوں گی۔ اس بارے میں مجھے بھی بہت کچھ سوچنا ہو گا۔ آگے وسیع و عریض سمندر ہے۔ یہاں سے نکلنا کوئی آسان

نہیں ہے۔ بہرحال تم لوگ دن کے وقت بھی کیبن کے اندر ہی رہنا۔" ماریا کے نے کے بعد میں نے ناصرہ سے کہا کہ وہ خالی بوریوں میں گھس کر سو جائے۔ میں پہرہ ں گا۔ ناصرہ نے ایسا ہی کیا۔ میں نے سائی لینسر والا پستول ہاتھ میں لیا اور کیبن سے کر ڈیک پر آکر دیکھنے لگا۔ ایک طرف جزیرے کا گھنا تاریک جنگل تھا اور دوسری طرف نظر تک کالا سیاہ سمندر بوندا باندی میں پھیلتا چلا گیا تھا۔

===== ❑ ❑ =====

میں اس تباہ شدہ سٹیمر کے ڈیک پر بیٹھا ساری رات پہرہ دیتا رہا۔ اس دوران نا[صرہ] سوئی رہی۔ اس دلیر الجزائری لڑکی نے بڑے دکھ اٹھائے تھے میں اسے زیادہ سے زیا[دہ] آرام پہنچانا چاہتا تھا۔ فرانس کے اس دور افتادہ جزیرے کی رات بڑی سرد تھی۔ بوند[ا] باندی رات بھر ہوتی رہی۔ دن نکلا تو جزیرے کے درختوں پر اور دور تک پھیلے ہو[ئے] سمندر پر دھندلی دھندلی روشنی پھیل گئی۔ میری آنکھیں درختوں کے نیچے جمی تھیں جہا[ں] سے ایک پگ ڈنڈی کاؤنٹ کے محل کی طرف جاتی تھی۔ مجھے ماریا کا انتظار تھا۔ اسی [نے] ناصرہ کو کاؤنٹ کی قید سے نکلوانے میں میری مدد کی تھی اور اب بھی اسی کی مدد سے ہمیں اس خونی جزیرے سے نجات حاصل کرنی تھی۔ میں اس خطرناک حقیقت سے بھی آگاہ [تھا] کہ آج کا دن کاؤنٹ نے ناصرہ کی موت کا دن مقرر کر رکھا تھا۔ یعنی آج کی رات ا[سے] پھانسی دی جانے والی تھی۔ ظاہر ہے صبح ہونے تک جیل کے محافظوں کو ناصرہ کے فرار [کا] علم ہو گیا ہو گا اور اب وہ سارے جزیرے میں اس کی تلاش کے واسطے نکل کھڑے ہو[ں] گے۔ وہ لوگ جزیرے کی ناکہ بندی بھی کر لیں گے۔ مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا [کہ] وہاں سے ہم کیسے نکل پائیں گے۔

ماریا ابھی تک نہیں آئی تھی۔ کاؤنٹ کے سپاہی اگر اس طرف آگئے تو وہ اس سٹ[یمر] کی ضرور تلاشی لیں گے۔ جہاں میں اور ناصرہ چھپے ہوئے تھے۔ مجھے کیبن میں آہٹ سنا[ئی] دی۔ میں تیزی سے نیچے آگیا۔ ناصرہ جاگ پڑی تھی اور سٹیمر کے ایک چھوٹے [سے] دروازے کو زور لگا کر کھولنے کی کوشش کر رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ کہنے لگی۔ "[میں]

[د]یکھنا چاہتی تھی اس کے اندر کیا ہے؟"

میں نے اسے بتایا کہ سٹیمر ایک مدت سے خالی پڑا ہے۔ وہ کیبن کی ٹوٹی پھوٹی برتھ پر بیٹھ گئی اور ماریا کا پوچھنے لگی۔ میں نے اسے بتایا کہ وہ ابھی تک نہیں آئی۔ ناصرہ نے بھی اس اندیشے کا اظہار کیا کہ تہہ خانے کے محافظوں کو میرے فرار ہونے کا علم ہو گیا ہو گا اور ہو سکتا ہے کہ وہ اسے تلاش کرتے ہوئے اس سٹیمر پر بھی آجائیں۔ "ہمیں یہاں سے نکل کر کسی دوسری جگہ چھپ جانا چاہئے" میں خود اس بارے میں یہی سوچ رہا تھا ہم نے آپس میں صلاح مشورے کے بعد فوری طور پر فیصلہ کیا کہ ہم سٹیمر سے نکل کر وہاں چلے جاتے ہیں جہاں درختوں کے بے شمار جھنڈ اور ٹیلے ہیں۔ وہاں ہمیں کوئی نہ کوئی چھپنے کی جگہ مل جائے گی۔ ابھی ہم نے اپنے اس فیصلے پر عمل نہیں کیا تھا کہ اوپر سٹیم کے تختے پر کسی نے جیسے دستک دی۔ میں نے پستول تھام لیا اور دبے پاؤں ٹوٹے ہوئے زینے پر سے ہو کر اوپر گیا تو سامنے ماریا کھڑی تھی۔

"جلدی سے میرے پیچھے آؤ"۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔

میں نے ناصرہ کو آواز دی۔ وہ بھی اوپر آگئی اور ہم دونوں ماریا کے پیچھے پیچھے چل دیئے۔ ماریا سمندر کے ساحل کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ ہمارے اور سمندر کے درمیان ریت کا وسیع و عریض کنارہ تھا جس کے درمیان تک سمندر کی لہریں آکر واپس چلی جاتی تھیں۔ ان لہروں کا ہلکا ہلکا شور اٹھ رہا تھا۔ ہوا ٹھنڈی تھی۔ چلتے چلتے ہم جزیرے کا ایک موڑ گھومے تو آگے چھوٹی بڑی بھوری چٹانوں کا ایک سلسلہ پھیلتا ہوا دکھائی دیا۔ ماریا ہمیں لے کر ان بھوری چٹانوں میں آگئی۔ ان چٹانوں پر کہیں کہیں سبز کائی جمی ہوئی تھی۔ چٹانوں کے درمیان بھی کہیں کہیں سمندر کا پانی چھوٹے چھوٹے گڑھوں میں جمع ہو گیا ہوا تھا۔

ہم دو چٹانوں کے درمیان سے ہو کر نکلے تو بائیں جانب سمندری گھاس کا ایک ڈھیر پڑا تھا۔ اس کے پیچھے چٹان کے اندر بنے ہوئے ایک قدرتی غار کا دروازہ تھا۔ دروازہ کیا تھا کوئی چار فٹ اونچا سوراخ تھا۔ جہاں سے ہمیں جھک کر داخل ہونا پڑا۔ اس غار میں

ہلکی ہلکی گرماہٹ تھی جو اس شدید سرد مرطوب موسم میں ہمیں بہت ہی اچھی لگی۔ مجھے تو یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے آہستہ سے میرے کاندھوں پر کمبل ڈال دیا ہو۔

قصہ مختصر یوں کہ ماریا نے ہمیں ایک بار پھر اس غار میں چھپا دیا اور کہا۔

"ناصرہ کے فرار کا سب کو پتہ چل گیا ہے۔ کاؤنٹ غصے سے پاگل ہو رہا ہے۔ اس نے اپنے سپاہیوں کو حکم دے دیا ہے کہ مفرور عورت کو جہاں بھی ہو تلاش کرو اور اسے زندہ یا مردہ پیش کرو"۔

ناصرہ نے کہا۔ "میں سمندر میں تیر کر بھی یہاں سے فرار ہو سکتی ہوں۔ مجھے سمندر میں تیرنا آتا ہے۔ میں اب ان سامراجیوں کے ہتھے نہیں چڑھوں گی۔"

ماریا نے بتایا کہ اس سمندر میں بڑی خونخوار شارکیں ہر وقت گھومتی رہتی ہیں۔ ویسے بھی سمندر بہت وسیع ہے میں نے ماریا سے پوچھا کہ اس نے کیا منصوبہ بنایا ہے ماریا نے بڑی معنی خیز نگاہوں سے ہماری طرف دیکھا اور بولی۔

"تمہارے ساتھ میں بھی اس شیطانی جزیرے سے نکلنا چاہتی ہوں۔ مجھ سے اب اپنے ظالم اور جابر خاوند کا مزید ظلم برداشت نہیں ہوتا۔ میں مارسلیز میں جا کر اپنی نئی زندگی شروع کرنا چاہتی ہوں۔ میں نے یہ منصوبہ بنایا ہے کہ ہم یہاں سے ایک ہیلی کاپٹر اغوا کر کے بھاگیں گے"

میں اور ناصرہ ماریا کے اپنی زندگی کے بارے میں نئے انکشاف پر حیران بھی ہوئے اور خوش بھی۔ کیونکہ ماریا نے ہیلی کاپٹر کے ذریعے فرار کی خوش خبری سنائی تھی۔ ناصرہ نے کہا۔ "مگر ہیلی کاپٹر کون چلائے گا؟"

ماریا کہنے لگی۔ "میں چلاؤں گی۔ مجھے ہیلی کاپٹر چلانا آتا ہے۔ تم اس کی فکر نہ کرو۔ مگر یہ ہیلی کاپٹر ایئرپورٹ کے جنوبی ہینگر میں رکھا ہوا ہوتا ہے جہاں چاروں طرف ہر وقت پہرہ رہتا ہے۔ تم لوگوں کو اس سلسلے میں میری مدد کرنی ہوگی"

میں نے کہا۔ "ہم تو یہاں سے فرار کے لئے اپنی جان تک لڑا دینے کو تیار ہیں"۔

"تو پھر ٹھیک ہے۔ آج رات کو میں تمہیں یہاں سے آکر لے جاؤں گی"۔

پھر اس نے وہ تھیلا ہمارے حوالے کر دیا جس میں وہ ہمارے لئے کچھ کھانے پینے کی برتن لائی تھی۔ ایک بار پھر اس نے ہمیں غار سے باہر نہ نکلنے کی تاکید کی اور رات کے بجے آنے کا وعدہ کر کے چلی گئی۔



رات کافی گہری ہو گئی تھی جب ماریا غار میں نمودار ہوئی۔ میں اور ناصرہ جاگ رہے تھے اس نے گرم جیکٹ اونی ٹوپی اور پتلون پہن رکھی تھی۔ ہاتھ میں چمڑے کا تھیلا بھی تھا۔ گویا وہ اپنی طرف سے جزیرے سے فرار کی پوری تیاری کر کے آئی تھی۔ ہم تو پہلے ہی وہاں تیار بیٹھے تھے۔ ہم غار سے نکلے اور ماریا کی راہ نمائی میں جزیرے کے واحد ایئرپورٹ کی طرف روانہ ہو گئے۔ یہ ایک چھوٹا سا ایئرپورٹ تھا جہاں کہیں کہیں روشنی ہو رہی تھی۔ چونکہ کسی فلائیٹ کا وقت نہیں تھا اس لئے کنٹرول ٹاور میں صرف ایک بتی جل رہی تھی۔ ماریا ہمیں اندھیرے میں سے گذارتے ہوئے ایک اونچی چھت والے بہت بڑے ہینگر کے دروازے کے پاس لے آئی۔ یہاں کوئی پہرہ نہیں تھا۔ مگر ہینگر کے بہت بڑے دروازے پر تالا لگا ہوا تھا۔ ماریا نے اپنے تھیلے میں سے چابیوں کا ایک گچھا نکالا اور ہم نے تالا کھولنے کی جدوجہد شروع کر دی ایک چابی لگ گئی اور تالا کھل گیا۔ ہینگر میں داخل ہوتے ہی ہم نے بڑے دروازے کو بند کر دیا۔ ہینگر کی چھت درمیان میں بہت بڑے دائرے کی شکل میں کھلی ہوئی تھی۔ اس کے عین نیچے کالے رنگ کا ایک ہیلی کاپٹر کھڑا تھا۔ ماریا نے سرگوشی میں کہا۔ "یہاں سے فرار کا یہ ایک آخری ذریعہ ہے"۔

میں نے کہا۔ "اس کی آواز سے گارڈز ہوشیار ہو جائیں گے۔ وہ دوسرے ہیلی کاپٹر یا کسی چھوٹے طیارے پر ہمارا پیچھا کر سکتے ہیں۔"

ماریا نے کونے کی طرف اشارہ کیا۔ "اس وقت یہاں صرف ایک ہی چھوٹا طیارہ ہے جسے ہم بیکار کر دیں گے۔ یہاں دوسرا کوئی ہیلی کاپٹر بھی نہیں ہے۔ اس لئے ایک بار ہم

بلند ہو گئے تو پھر ہمارا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ میرے ساتھ آؤ"

میں ناصرہ اور ماریا چھوٹے طیارے کے پاس آ گئے۔ ماریا دروازہ کھول کر اس کے پٹ میں بیٹھ گئی اور سامنے لگے پرزوں کو الٹ پلٹ کرنے لگی۔ اس نے پلاس کی کئی پرزوں کو توڑ ڈالا۔ طیارے کی سٹک کو بھی ایک طرف کو موڑ دیا۔ پھر طیارے باہر آ کر بولی۔

"اب یہ طیارہ اڑ نہیں سکتا۔ اس کی مرمت پر بھی دس بارہ گھنٹوں سے کم وقت لگے گا۔ اب ہمارا راستہ صاف ہے۔"

ہم دروازہ کھول کر ہیلی کاپٹر میں بیٹھ گئے۔ ماریا ایک ماہر ہواباز خاتون کی طرح سامنے ائل کے بٹن دبانے لگی۔ ڈائل روشن ہو گیا۔ اس نے ایک بٹن دبایا تو انجن سٹارٹ ا اور ہیلی کاپٹر کے پر گردش کرنے لگے۔ انجن کی آواز پیدا ہوئی۔ میری نگاہیں ہینگر دروازے پر لگی تھیں۔ ہو سکتا تھا کہ کسی طرف سے گارڈز بیدار ہو کر وہاں دوڑتے ے آ جائیں اور ہم پر گولیاں برسانی شروع کر دیں۔ مگر ایسا نہ ہوا اور ہیلی کاپٹر آہستہ ہ اوپر اٹھنے لگا۔ ہمارے دل دھڑک رہے تھے۔ ہیلی کاپٹر ہینگر کی چھت کے دائرے ے نکل کر کھلی فضا میں آ گیا تو ماریا نے ایک طرف سٹک کو جھکا دیا۔ ہیلی کاپٹر نے ہلکا کولا کھایا اور پھر تیزی سے اوپر ہی اوپر بلند ہوتا چلا گیا۔ میں اور ناصرہ نیچے دیکھ رہے نیچے کنٹرول ٹاور کی بتیاں روشن ہو گئیں۔ اور ریڈیو سیٹ پر کسی نے چیخ کر پوچھا ن ہو تم؟ اپنی شناخت بتاؤ" ماریا نے جواب دینے کی بجائے وائرلیس سیٹ بند کر دیا اور کاپٹر کو سمندر کے اوپر لے آئی۔ اب ہم کافی نیچی اڑان کرتے ہوئے سمندر کے اوپر ے تھے۔ اچانک ہمیں فائرنگ کی آوازیں سنائی دیں۔ ماریا نے کہا۔

"فکر نہ کرو وہ زمین سے فائر کر رہے ہیں۔ ہم ان کے فائر کی زد سے آگے نکل چکے ب وہ ہمارے پیچھے نہیں آ سکتے"

اور ایسا ہی ہوا کیونکہ ہم ان کا اکلوتا طیارہ ہینگر کے اندر ہی تباہ کر آئے تھے۔ بہت ائرنگ کی آواز پیچھے رہ گئی اور ہم تیزی سے کنارے کی طرف بڑھتے چلے گئے۔ ماریا

ہیلی کاپٹر کو کافی بلندی پر لے آئی تھی۔ نیچے اندھیرے میں سمندر کالا سیاہ نظر آ رہا تھا۔
کے سوا کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ ناصرہ نے پوچھا

"کیا ہم مارسیلز کی طرف جا رہے ہیں ماریا؟"

ماریا نے جواب دیا۔

"پہلے میرا بھی یہی خیال تھا مگر اب میں ادھر نہیں جا رہی۔ کیونکہ مارسیلز میں کا
کے آدمی ہمیں پکڑ سکتے ہیں"۔

"تو پھر ہم کس طرف جا رہے ہیں؟" میں نے سوال کیا۔ ماریا نے ہیلی کاپٹر کے
کی بتی بجھا رکھی تھی۔ میں اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ مجھے اس کی آواز
دی۔ وہ اونچی آواز میں کہہ رہی تھی۔ "میں تمہیں الجزائر کے ساحل تک پہنچا کر وا
جاؤں گی۔"

یہ میرے اور ناصرہ کے لئے ایک بہت بڑی خوش خبری تھی۔ ماریا نے ہماری خا
کتنا بڑا خطرہ مول لیا تھا۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ اس نے اپنی زندگی داؤ پر لگا دی تھی۔
صرف یہ تھی کہ وہ ایک پڑھی لکھی خاتون تھی اور اس حقیقت سے باخبر تھی کہ فرا
نے الجزائر پر غیر قانونی طور پر قبضہ جما رکھا ہے اور الجزائر کے مسلمان عوام بجا طور پر ا
حق خود ارادیت کے لئے جہاد کر رہے ہیں۔ وہ الجزائری مسلمانوں کی جدوجہد آزادی
حق میں تھی جس طرح کہ اس زمانے میں فرانس کا سب سے بڑا افسانہ نگار اور فلسفی
پال سارتر بھی الجزائری مسلمانوں کی حمایت میں مضامین لکھتا رہا تھا۔

ہمارا ہیلی کاپٹر کوئی ایک گھنٹے تک رات کے اندھیرے میں سمندر کے اوپر پرواز
رہا۔ پھر دور سے ساحل پر کہیں کہیں جھلملاتی روشنیاں نظر آنے لگیں۔ ماریا نے اطمینا
کا سانس لیتے ہوئے کہا۔

"مبارک ہو۔ الجزائر کا ساحل سامنے نظر آنے لگا ہے۔"

ماریا اس علاقے سے کافی واقفیت رکھتی تھی۔ وہ اپنے خاوند کے ساتھ اکثر یہاں آ
رہی تھی۔ ہمارا ہیلی کاپٹر سمندر پار کر کے چھوٹے چھوٹے صحرائی ٹیلوں کے اوپر سے گ

ستاروں کی روشنی میں یہ ٹیلے دھندلے دھندلے نظر آ رہے تھے۔ ناصرہ نے کہا کہ
کے شہر کی طرف جانے کی کوشش کرے۔ جس پر ماریا کہنے لگی۔ "وہ یہاں سے کافی
ہے۔ میں تمہیں تلمسان کے شہر کے باہر پہنچا دوں گی۔ وہاں سے تم اپنے شہر جا سکتی

رات کے پچھلے پہر ہیلی کاپٹر تلمسان شہر کے باہر ایک ٹیلے کے پیچھے اتر گیا۔ الجزائر کی
ن پر قدم رکھتے ہی میں نے اور ناصرہ نے خدا کا شکر ادا کیا۔ ماریا نے ہم سے باری
اتھ ملایا۔ ہمیں ہمارے خرچ کے لئے کچھ نقدی دی اور کہا۔
"میں تمہارے پاس زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتی مجھے بھی اپنے گھر پہنچنا ہے"۔
یہ کہہ کر اس نے ہاتھ ہلا کر خدا حافظ کہا اور ہیلی کاپٹر کو فضا میں بلند کر کے سمندر کی
نکل گئی۔ ناصرہ نے گہرا سانس بھرتے ہوئے کہا۔
"اپنے وطن کی فضا کتنی خوشگوار لگتی ہے۔ اگرچہ ابھی ہمارا وطن آزاد نہیں ہے۔
ہم بہت جلد اس کی زنجیریں کاٹ دیں گے۔"
میں نے ناصرہ سے مشورہ لیا کہ ہمارا تلمسان جانا مناسب رہے گا یا اس جگہ کہیں باقی
ت بسر کر لی جائے اور دن کی روشنی میں وہاں سے کسی دوسری طرف نکل جائیں۔
نے کہا۔
ان ہمارا شہر ہے۔ الجزائری مسلمانوں کا شہر ہے۔ ہمیں وہاں کوئی خطرہ نہیں ہے۔
یری ایک سہیلی کا گھر بھی ہے۔ ہم آج کا دن اسی شہر میں گذاریں گے"۔
اور ہم ڈھلتی صحرائی رات کے دھندلکے میں ٹیلے سے نکل کر شہر کی طرف چل
۔



تلمسان الجزائر کا ایک بڑا شہر ہے۔ اور مراکش کی سرحد کے قریب واقع ہے۔
وقت ہم شہر کے مغربی دروازے سے داخل ہوئے تو پرانے اندلسی طرز کے
دروازوں والے بازاروں میں کہیں کہیں عربی لباس پہنے لوگ ابھی تک چلتے پھرتے د
دے رہے تھے۔ ناصرہ نے کہا۔ "یہ اس شہر کی روایت ہے یہاں کے بازاروں میں ر
بھر رونق رہتی ہے اور قہوہ خانوں میں اندلسی موسیقی گونجتی رہتی ہے"۔

چنانچہ جب ہم ایک قہوہ خانے کے سامنے سے گذرے تو ہمیں ہسپانوی میوزک
تیز دھن سنائی دی۔ ناصرہ ایک ایسے بازار میں آگئی جس کا آدھا حصہ چھت سے ڈھکا
تھا۔ دکانیں بند تھیں۔ ایک تنگ سی گلی میں وہ ایک مکان کے پرانے محرابی درواز
آکر رک گئی۔ اس نے دروازے پر لگا ہوا بٹن دبایا۔ تھوڑی دیر بعد کسی مرد کی نیند
آواز آئی۔

"کون ہے؟"

ناصرہ نے اپنی سہیلی کا نام لے کر کہا کہ میں لیلیٰ کی سہیلی ہوں ناصرہ ----- اسی
دروازہ کھول دیا گیا۔ ایک بزرگ صورت آدمی لمبا فرغل پہنے سامنے تھا۔ اس نے نا
پہچان لیا تھا۔ وہ عربی زبان میں اس کی خیریت پوچھتا ہمیں ایک صحن سے گذار کر
کمرے میں لے گیا۔ تھوڑی دیر بعد ناصرہ کی سہیلی لیلیٰ بھی آگئی۔ دونوں سہیلیاں
دوسری سے مل کر بہت خوش ہوئیں۔ ناصرہ نے مختصراً میرا تعارف کروایا۔ لیلیٰ کہنے
"تم لوگ تھکے ہوئے ہو اس وقت تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔"

لیلیٰ اپنی سہیلی کے ساتھ چلی گئی اور میرے لئے اس کمرے میں قالین پر بستر لگا دیا

تلمسان الجزائر کا ایک تاریخی شہر ہے۔ سلطنت روما کے زمانے میں اس کا نام بوماریا
بعد میں مولائی ادریس نے رومی کھنڈروں پر یہاں اجادیر کے نام سے ایک نئے اسلامی
ی بنیاد رکھی۔ تلمسان بربری زبان کا لفظ ہے جس کے معنی چشمے کے ہیں۔ یہ شہر قدیم
نے ہی سے مختلف قافلوں کی گذرگاہ رہا ہے۔ چودھویں اور پندرھویں صدی عیسوی
جب ہسپانیہ مسلمانوں کے ہاتھ سے نکلا تو اس وقت مسلمان مہاجرین کی بہت بڑی
اد اندلس سے نقل وطن کر کے اس شہر میں آکر آباد ہو گئی۔ مشہور ترک مسلمان امیر
ر خیرالدین بار بروسا کا بحری بیڑہ ان مسلمان مہاجرین کو ہسپانیہ سے الجزائر منتقل کرتا رہا۔
ں لوگوں کی وجہ سے یہاں اندلس کی عربی تہذیب آج بھی جیتی جاگتی نظر آتی ہے۔
روں میں مخملیں قالین فرش پر بچھے ہوئے، کھڑکیوں پر خوبصورت ریشمی پردے، گرم
دار اور قہوے کی نازک پیالیاں، فضا میں بلند ہوتی اندلسی موسیقی، خوشبودار پھول اور
ہ گلاب ----- یہ شہر اندلسی مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت کی ہوبہو تصویر ہے -----
سان کی خواتین پردے کی پابند ہیں۔ وہ اپنا چہرہ چادر سے چھپائے رکھتی ہیں جس سے
رف آنکھیں ہی دکھائی دیتی ہیں۔ تاہم دوسرے مشرقی ملکوں کی طرح یہاں بھی مغربی
ذیب کے اثرات نمایاں طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ تلمسان کے آس پاس بہت سے آثار
یمہ ہیں۔ اس شہر کی پہاڑیاں صنوبر کے جنگلوں سے ڈھکی ہوئی ہیں اور ان پہاڑیوں کے
رتی غار بڑے مشہور ہیں۔ تلمسان میں اسلامی عہد کے آثار قدیمہ اتنی کثرت سے ہیں
کہ مورخین اسے افریقہ کا غرناطہ کہتے ہیں۔ ان میں مشوار کا قلعہ بہت مشہور ہے جس کی
بار پانچ سو پچاس ہجری میں رکھی گئی تھی۔ اس شہر میں ساڑھے چھ سو سال پرانا ایک
الاب بھی ہے جسے اسلامی تاریخ کے عظیم فاتح یوسف بن تاشفین نے بنوایا تھا۔ اس زمانے
ں اس تالاب کے پانی سے شہر کے باغات کو سیراب کیا جاتا تھا۔ مگر وقت کے ساتھ ساتھ
ہ تالاب خشک ہوتا چلا گیا اور آج کل یہاں فٹ بال کھیلنے کا میدان ہے۔ شہر کی ایک

جانب چالیس پرانے مقبرے ہیں۔ مسجد کبیر یہاں کی سب سے بڑی مسجد ہے جس کے اندر جو فانوس لگا ہے اس کے قمقموں کی تعداد تین سو پینسٹھ ہے سال کے دنوں کے برابر۔ یہ عالی شان مسجد پانچویں صدی ہجری میں تعمیر ہوئی تھی۔ ایک دوسری اہم مسجد جامع سیدی بومدین ہے۔ یہ مسجد جامع قرطبہ کی طرز پر بنائی گئی ہے۔ اس کی گل کاری اور نقش و نگار دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ تلمسان کی خواتین گھریلو کام کاج بڑے شوق سے کرتی ہیں۔ جب کوئی بچی پندرہ سال کی ہو جاتی ہے تو وہ اپنے جہیز کے کپڑے خود تیار کرنا شروع کر دیتی ہے۔ تلمسان میں جب کوئی بچی پہلی بار رمضان کا روزہ رکھتی ہے تو پورا خاندان خوشی مناتا ہے اور بچی کو خوبصورت لباس پہنا کر رشتے داروں کے گھروں میں لے جایا جاتا ہے جہاں اس کا بڑے احترام کے ساتھ خیر مقدم کیا جاتا ہے۔

تلمسان شہر کے بارے میں یہ ساری معلومات میں نے لیلیٰ کے گھر کی لائبریری میں رکھی ہوئی انگریزی کی ایک کتاب میں سے حاصل کی تھیں جو میں نے آپ کے واسطے یہاں بیان کر دی ہیں۔ اب تو یہ شہر فرانسیسی استعمار سے آزاد ہو چکا ہے اور ایک ترقی یافتہ اسلامی شہر ہے مگر جن دنوں میں ناصرہ کے ساتھ وہاں پہنچا تھا اس وقت یہ شہر فرانس کے قبضے میں تھا اور وہاں کے مسلمان اپنی آزادی کی جدوجہد میں مصروف تھے۔ ہر مسلمان آزادی کے جذبے سے سرشار تھا اور حریت پسندوں کے مجاہد تو اپنی اپنی جانوں کی قربانی دے رہے تھے۔

شہر میں فرانس کے جاسوس جگہ جگہ تعینات تھے جو حریت پسندوں کی موجودگی کی فوراً خبر کر دیتے تھے۔ پھر پولیس کے چھاپے پڑتے۔ گولیاں چلتیں' حریت پسند یا تو فرار ہو جاتے اور یا شہید ہو جاتے۔ بہت کم گرفتار ہوتے تھے۔ ناصرہ کو یہ بھی خطرہ تھا کہ اس کے شہر میں پہنچنے کی خبر فرانس کے جاسوسوں کو نہ ہو گئی ہو۔ لیلیٰ اسے تسلی دیتی کہ فکر نہ کرو۔ ہمارے علاقے میں پولیس کا کوئی جاسوس داخل نہیں ہو سکتا۔ لیکن ہم وہاں سے نکل کر ناصرہ کے آبائی شہر کی طرف جانا چاہتے تھے۔ ہم نہیں چاہتے تھے کہ ہماری وجہ سے لیلیٰ اور اس کے گھر والے کسی مصیبت میں پھنس جائیں۔ چنانچہ ناصرہ کی ہدایت کے مطابق میں

نے تلمسان میں حریت پسندوں سے رابطہ پیدا کیا ان کا ایک آدمی مجھے شہر کے ایک اندلسی قہوہ خانے میں ملا۔ وہ ایک بلند قامت نیلی آنکھوں والا الجزائری مسلمان تھا جس نے مجھے اپنا نام ہاشم بتایا۔ ظاہر ہے یہ اس کا فرضی نام تھا۔ اس نے مجھے کہا کہ میں ناصرہ کو ساتھ لے کر شہر کے مغربی قبرستان میں ابو اسحاق کے پرانے مقبرے میں پہنچ جاؤں۔ وہاں سے وہ ہمیں اونٹوں کے ایک خاص قافلے کے ساتھ ناصرہ کے گاؤں تک پہنچانا چاہتا تھا۔ میں ناصرہ کو دشمن کی قید سے نکال کر لے آیا تھا۔ ایک طرح سے میرا مشن یہاں ختم ہو گیا تھا۔ میں نے ناصرہ سے کہا کہ میں یہاں سے طرابلس کے شہر کی طرف نکل جانا چاہتا ہوں۔ تاکہ لیبیا کی سیاحت کے بعد مصر کی سیاحت کو چلا جاؤں۔ میں ان سارے قدیم اسلامی تہذیب کے علم بردار ممالک کی سیر و سیاحت کرنا چاہتا تھا۔ ویسے بھی جنگ ختم ہو چکی تھی میرے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ ناصرہ نے مجھے خوشی سے اجازت دے دی۔ چنانچہ اسی رات میں نے ناصرہ کو حریت پسندوں کے محفوظ ہاتھوں میں دیا اور خود اس سے اجازت لے کر واپس لیلیٰ کے گھر میں آ گیا جہاں سے مجھے تیونس سے ہوتے ہوئے لیبیا کی بندرگاہ طرابلس پہنچنا تھا۔ میں نے تلمسان کے شہر میں کچھ روز رہ کر اس قدیم اسلامی ملک کی سیر کی اور پھر ایک دن صبح کے وقت انابہ کی بندرگاہ سے ایک جہاز میں سوار ہو کر تیونس اور وہاں سے ایک دوسرے بحری جہاز میں بیٹھ کر بحیرہ روم کے نیلے پانیوں میں سفر کرتا طرابلس کی بندرگاہ پر جا اترا۔ اس شہر سے مجھے اس لئے بھی عقیدت تھی کہ ۱۹۱۲ء میں یہاں ایک مسلمان عرب لڑکی فاطمہ بنت عبداللہ طرابلس کی جنگ میں غازیوں کو پانی پلاتی شہید ہو گئی تھی جس کے بارے میں علامہ اقبالؒ نے ایک بڑی پردرد نظم لکھی تھی۔

فاطمہ! تو آبروئے امت مرحوم ہے
ذرہ ذرہ تیری مشت خاک کا معصوم ہے
یہ سعادت حور صحرائی تیری قسمت میں تھی
غازیان دیں کی سقائی تیری قسمت میں تھی
یہ کلی بھی اس گلستان خزاں منظر میں تھی

ایسی چنگاری بھی یا رب اپنی خاکستر میں تھی
ہے کوئی ہنگامہ تیری تربت خاموش میں
پل رہی ہے ایک قوم تازہ اس آغوش میں



طرابلس سے ایک سٹیمر میں سوار ہو کر میں لیبیا کے ساحل کے ساتھ ساتھ سفر کرتا بن غازی پہنچ گیا۔ بن غازی میں بھی دوسری عالمی جنگ کی تباہی کے اثرات ہر طرف بکھرے ہوئے تھے۔ میرا ارادہ اسکندریہ سے ہوتے ہوئے بیروت اور وہاں سے ترکیہ کی سیرو سیاحت کا تھا۔ یہ خیال بھی تھا کہ اسکندریہ اتر کر مصر کے قدیم اہرام بھی دیکھوں گا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ مصر میں ایسے رونگٹے کھڑے کر دینے والے حادثات و واقعات میرا انتظار کر رہے ہیں کہ جن کی یاد بھی مجھے حیرت زدہ کر دیا کرے گی۔ لیکن آنے والے واقعات کی تو کسی کو بھی خبر نہیں ہوتی۔ دنیا کا نظام تو ایسے ہی چل رہا ہے۔ غیب کا علم تو صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہی کو ہے۔

بہرحال میں اپنے پروگرام کے مطابق کچھ روز بن غازی میں قیام کے بعد اسکندریہ جانے والے بحری جہاز میں بیٹھ گیا۔ آپ ضرور حیران ہو رہے ہو گے کہ میں سفر کے اخراجات کیسے پورے کرتا تھا۔ میں آپ کو بتاتا ہوں۔ ان دنوں میں نوجوان تھا اور ایڈونچر کرنے کے واسطے ہر گھڑی تیار رہتا تھا۔ میں ایسا کرتا کہ جس بحری جہاز پر سفر کرتا اس کے کپتان کے سامنے بے دھڑک پیش ہو جاتا اور ٹوٹی پھوٹی انگریزی یا ایسی ہی عربی یا فرانسیسی زبان میں اسے کہتا کہ میں ماڈرن مارکو پولو ہوں اور دنیا کے ملکوں کی سیرو سیاحت کو نکلا ہوں۔ میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔ مجھے جہاز پر اپنے ساتھ لے چلیں میں جہاز کے فرش صاف کر دیا کروں گا۔ میرے اعتماد بھرے لہجے اور بے باکی سے لوگ متاثر ہوتے اور یوں میں جہاز پر سفر کرتے ہوئے ساتھ ساتھ جہاز کے فرش بھی صاف کرتا اور کچھ پیسے

جمع بھی کرلیتا تھا۔

جہاز اسکندریہ کی بندرگاہ سے لگا تو دن کا وقت تھا۔ مصر کا آسمان روشن اور چمکیلا تھا۔ سفید مرغابیاں فضا میں تیر رہی تھیں۔ یہ سب کچھ مجھے بڑا اچھا لگا۔ مصر ہزاروں سال پرانا شہر تھا اور اسکندریہ کے بارے میں میں نے پڑھا تھا کہ اسے سکندر اعظم نے آباد کیا تھا اور یہاں ایک بہت بڑی لائبریری تھی جس میں اس زمانے میں لاکھوں کتابیں ہوا کرتی تھیں۔ مگر تاریخ کے مطابق وہ قدیم اسکندریہ آج کے اسکندریہ شہر سے جنوب کی طرف کئی میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ جہاں اب سوائے ریت کی ڈھیریوں کے اور کچھ باقی نہیں ہے۔

لیکن جدید اسکندریہ بھی بہت بڑا شہر تھا۔ اس شہر میں مشرقی اور مغربی تہذیب آپس میں گھل مل گئی تھی۔ یہاں میں نے جہاز چھوڑ دیا تھا۔ میں نے جہاز پر کام کرتے ہوئے کچھ مصری پونڈ جمع بھی کر لئے تھے۔ جو مصر میں ہفتے بھر کے قیام وطعام کے لئے کافی تھے۔ اسکندریہ سے میں قاہرہ آگیا جو مصر کا دارالحکومت ہے۔ اس شہر پر مشرقی پراسراریت چھائی ہوئی تھی۔ اس کی اپنی تاریخ بڑی پر اسرار اور ہزاروں برس پرانی تھی۔ فرعون اسی سرزمین میں پیدا ہوئے اور اسی سرزمین پر بنے ہوئے اہراموں میں دفن ہو گئے۔ یہاں کا جامع الازہر سب سے بڑی دینی یونیورسٹی تھی اور شہر کے وسط میں بہت بڑی جامع مسجد بھی تھی۔ دریائے نیل شہر کے درمیان سے گذرتا تھا۔ کبھی اس دریا پر مصر کے شاہی خاندان کی شہزادیاں اور بیگمات شاہی بجروں میں شام کے وقت دریا کی سیر کیا کرتی تھیں مگر آج اس میں ڈیزل والے سٹیمر چلتے تھے جن کی آواز دور سے سنائی دیتی تھی۔ قاہرہ کا شہر تو بڑا ماڈرن تھا مگر دیہات میں لوگ ابھی تک قدیم زمانے ایسی زندگی بسر کر رہے تھے۔ ان دیہات کو دیکھ کر ایسا لگتا تھا کہ ابھی کسی نہ کسی ٹیلے کے پیچھے سے فرعون کی سواری نکل آئے گی۔

جنگ کے بعد قاہرہ میں بھی بڑی مہنگائی ہو گئی تھی۔ میں نے شہر کے ایک پرانے بازار میں ایک ایسا سرائے نما ہوٹل تلاش کر لیا جہاں میں تھوڑے سے پیسے خرچ کر کے

بڑے آرام سے رہ سکتا تھا۔ یہاں مجھے کوئی کمرہ تو نہیں ملا تھا۔ دالان میں پرانا قالین بچھا تھا بس وہیں میں رات کو پڑ کر سو جاتا تھا۔ سارا دن شہر کی گشت لگاتا رہتا۔ ایک دن میں اہرام مصر کی سیر کو چل پڑا۔ یہ اہرام قاہرہ سے چند میل دور وادی غزہ کے ریتلے میدان میں اونچے تکونی ٹیلوں کی شکل میں واقع ہیں۔ پہلے ابو الہول کا مجسمہ آتا ہے جس کے پاؤں کے درمیان سیاحوں کے واسطے ایک ماڈرن ریستوران بنا ہوا ہے جہاں سیاح مصر کی شدید گرمی میں تھوڑی دیر سکون سے بیٹھ کر ٹھنڈے مشروبات سے دل بہلاتے ہیں۔

وادی غزہ میں سب سے بڑا اہرام مصر کے فرعون اخناطون کا ہے۔ یہ فرعون دوسروں فرعونوں کی طرح بت پرست نہیں تھا بلکہ ایک خدا کو مانتا تھا۔ اس نے معبدوں کے سارے بت تڑوا دیئے تھے۔ مگر وہ درباری سازشوں کا شکار ہو کر جوانی میں ہی مارا گیا۔ نفریتی اس کی ملکہ تھی جو بڑی رحم دل خاتون تھی۔ ان دونوں کے حنوط شدہ جسم لندن کے عجائب گھر میں محفوظ پڑے ہیں۔ اب تو اہراموں کے اندر سیاحوں کے واسطے باقاعدہ محفوظ راستے بنا دیئے گئے ہیں' اور روشنی کا بھی معقول انتظام ہے مگر جب یہ اہرام دریافت ہوئے تو اندر اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ یہ ہزاروں سال پرانا اندھیرا تھا۔ جگہ جگہ خفیہ طور پر گہرے کنوئیں کھدے ہوئے تھے جس میں گر کر کوئی زندہ نہیں بچ سکتا تھا۔ جب پہلا اہرام ۱۹۲۳ء میں کھولا گیا تو اہرام کے اندر فرعون کے تابوت کے آس پاس دالان کی ریت پر کئی انسانی ڈھانچے بھی ملے جن کے بارے میں بعد میں تحقیق کے پتہ چلا کہ یہ ان مصری غلاموں اور کنیزوں کے ڈھانچے تھے جنہیں فرعون کی لاش کے ساتھ اس خیال سے زندہ دفن کر دیا گیا تھا کہ وہ موت کے بعد اگلی دنیا میں فرعون کی خدمت کریں گی۔ ریت پر ان غلاموں اور کنیزوں کے پاؤں کے نشان بھی ہزاروں برس سے ویسے ہی محفوظ تھے۔

جن دنوں میں اہرام کی سیر و سیاحت کو گیا ان دنوں وہاں ایک فرانسیسی ٹیم ایک نئے دریافت شدہ اہرام کی کھدائی کر رہی تھی۔ یہی وہ اہرام تھا جو میری زندگی کے سب سے حیرت انگیز اور ہولناک تجربے کا باعث بنا۔

===== ❑ ❑ =====

آج بھی جب میں ان واقعات کو یاد کرتا ہوں تو یقین نہیں آتا کہ یہ سب کچھ میرے ساتھ گذرا تھا۔ فرانسیسی ماہرین آثار قدیمہ کی جو ٹیم نئے اہرام کی کھدائی کر رہی تھی اس نے اہرام کے قریب ہی اپنے رہائشی خیمے لگا رکھے تھے۔ ان کی گاڑیاں بھی وہیں کھڑی رہتیں۔ یہ ٹیم پندرہ بیس آدمیوں پر مشتمل تھی جس میں ایک نوجوان خاتون بھی تھی۔ جو ٹیم کے سربراہ مسٹر شارل کی بیوی تھی۔ دونوں نوجوان تھے اور اہرام مصر کے راز معلوم کرنے کا شوق انہیں پیرس سے مصر لے آیا تھا۔ ٹیم کے دوسرے اراکین کا تعلق بھی فرانس ہی سے تھا۔ اس کے علاوہ مقامی مصری لوگ تھے۔ جو کھدائی اور چیزیں اٹھانے لے جانے میں ان کی مدد کرتے تھے۔

میں چونکہ عربی کے ساتھ ساتھ فرانسیسی زبان بھی اچھی طرح سے اب بولنے اور سمجھنے لگا تھا اس وجہ سے مجھے مسٹر شارل نے اپنی ٹیم میں شامل کر لیا۔ انہیں ایک ایسے نوجوان کی ضرورت تھی جو مزدوروں کو عربی زبان میں بات سمجھا سکے۔ میری ضرورت یہ تھی کہ مجھے مصر میں رہنے کے لئے پیسوں کی ضرورت تھی میں قاہرہ سے روزانہ صبح بس میں سوار ہو کر سائیٹ پر یعنی اس جگہ پہنچ جاتا جہاں اہرام کی کھدائی ہو رہی تھی۔ میرا کام مصری مزدوروں کی نگرانی کرنا' ان کے اوور ٹائم کا حساب کتاب رکھنا اور مسٹر شارل سے فرانسیسی میں احکامات سن کر انہیں عربی میں سمجھانا تھا۔ یہ کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ چنانچہ میں بڑا خوش تھا اور اپنے شوق کی خاطر اور قدیم فرعونوں کی ہزاروں برس پرانی ممیاں اور ان کی پرانی چیزیں دیکھنے کے لئے وہاں ڈیوٹی ختم ہونے کے بعد بھی اکثر موجود رہتا اور مسٹر

ثارل اور اس کی فرانسیسی بیوی جولیانہ سے مصری دیومالا اور کاہنوں کے طلسم کے بارے ہا گفتگو کیا کرتا۔

مسٹر شارل نے مجھے بتایا کہ فرعونوں کے یہ اہرام چار پانچ ہزار برس سے یہاں موجود ں اور تب سے لے کر اب تک ان اہراموں کو لٹیروں اور ڈاکوؤں نے کئی بار لوٹا ہے۔ رف دو یا تین اہرام ایسے تھے کہ جن کے اندر ڈاکوؤں کو داخل ہونے کا راستہ نہ مل سکا اور ان اہراموں کے نوادرات اور سونے چاندی کے برتن' ہیرے جواہرات محفوظ رہ ئے جو اب قاہرہ پیرس اور لندن کے عجائب گھروں کی زینت ہیں۔

یں نے اس سے پوچھا۔

"تم جس اہرام کی کھدائی کر رہے ہو کیا یہ اہرام بھی لٹیروں سے محفوظ رہا ہے؟"

اس کے جواب میں مسٹر شارل نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

"یہ تو اہرام کے اندر جا کر ہی معلوم ہو گا۔ ابھی تو ہم اس کے پہلے دالان تک بھی یں پہنچے"۔

مجھے معلوم تھا کہ مصر کے توہم پرست لوگوں میں یہ بات بڑی مشہور ہے کہ جو کوئی رعون کے تابوت کو کھولتا ہے اسے فرعون کی بددعا ضرور لگتی ہے اور وہ بڑی اذیت کی ت مرتا ہے۔ جب میں نے مسٹر شارل سے فرعون کی بددعا کا تذکرہ کیا تو وہ نفی میں سر تے ہوئے بولا۔

"میں ان باتوں کو نہیں مانتا۔ فرعونوں کو مرے ہزاروں برس ہو چکے ہیں۔ وہ کسی کو انہیں دے سکتے۔ پھر یہ سائنس کا زمانہ ہے سائنس ان باتوں پر یقین نہیں رکھتی۔"

وہاں کے جو مقامی لوگ وہاں کام کر رہے تھے ان میں ایک مصری مزدوروں کا میٹ جس کا نام بصری تھا۔ بصری کی عمر ساٹھ سال کے قریب تھی مگر جسم بڑا تنومند تھا۔ میرا ں کے ذریعے دوسرے مصری مزدوروں سے رابطہ تھا۔ باتوں ہی باتوں میں بصری ایک ز کہنے لگا۔

"اس اہرام کو کھول کر یہ لوگ اچھا نہیں کر رہے تم دیکھ لینا یہ فرانسیسی لوگ یہاں

سے زندہ واپس نہیں جا سکیں گے۔ یہ سب فرعون کی بدعا کا شکار ہوں گے۔ آج سے ...س برس پہلے ایک انگریز یہاں آیا تھا۔ اس نے مغربی اہرام کو کھولا تھا اور فرعون کا سونے کا تاج ولایت لے گیا تھا۔ جانتے ہو اس کا کیا انجام ہوا؟ اس کے دماغ میں ایک مچھر گھس گیا تھا اور بڑی اذیت کی موت مرا"۔

میں نے بصری کی باتوں کا ذکر شارل سے نہ کیا۔ کیونکہ وہ ان باتوں پر یقین نہیں رکھتا تھا۔ مگر میں اس سے پہلے فرعونوں کی بدعا کے بارے میں بہت سی باتیں کتابوں میں پڑھ چکا تھا اور مصر کے قدامت پسند گھرانوں میں یہ وہم یقین کی حد تک پایا جاتا تھا کہ جس کسی نے بھی فرعون کا مقبرہ کھولا ہے اس کا انجام بڑا عبرتناک ہوا۔ اس سلسلے میں ایک دو مثالیں بھی سامنے آچکی تھیں۔ لیکن یہ جدید سائنس کا زمانہ تھا۔ یورپ کے لوگ ان باتوں پر زیادہ یقین نہیں رکھتے تھے۔

اہرام کی کھدائی کا کام بڑے زور وشور سے ہو رہا تھا۔ میں اپنے سرائے نما ہوٹل سے صبح سائٹ پر آجاتا۔ سارا دن مزدوروں سے کام کرواتا اور شام ہوتے ہی واپس آجاتا۔ مجھے وہاں صرف اسی شوق نے روکے رکھا تھا کہ اہرام کو کھلتا اور اگر اندر کسی فرعون کی ممی ہو تو اسے دیکھوں۔ اس دوران میں نے مصری مزدوروں سے فرعونوں کی لاشوں اور ان کی بدعا کے بارے میں مختلف قسم کے رونگٹے کھڑے کر دینے والی کہانیاں سنیں۔ میرا چونکہ دعا اور بدعا پر اعتقاد تھا اس لئے بڑا محتاط ہو گیا تھا۔ اہرام کی کھدائی جاری تھی۔ ایک رات ایسا ہوا کہ اچانک شارل کی بیوی جولیانہ چیخ مار کر خیمے سے باہر نکل آئی اور زمین پر گر کر بے ہوش ہو گئی۔ ہوش میں آنے کے بعد اس نے اپنے خاوند شارل کو بتایا کہ ایک سرخ آنکھوں والا کاہن اس کے خیمے میں آیا تھا۔ اس نے جولیانہ کا گلا دبا کر اسے ہلاک کرنے کی کوشش کی تھی۔ مگر شارل نے اسے محض وہم قرار دیا اور اپنی بیوی جولیانہ کو قاہرہ والے فلیٹ میں بھجوا دیا۔ اس روز مصری میٹ Mate بصری نے اپنی پراسرار آواز میں مجھے کہا۔

"بہت جلد کچھ ہونے والا ہے"۔

اس کے اگلے روز وہ دیوار بھی گرا دی گئی جو اہرام کے آخری دالان اور فرعون کے مقبرے کے درمیان بنی ہوئی تھی۔ اس وقت میں بھی شارل کے ساتھ تھا۔ مقبرے کے درمیان ایک تابوت پڑا تھا جس پر پیتل کا سانپ کنڈلی مارے بیٹھا تھا۔ شارل ٹارچ روشن کر کے اندر داخل ہو گیا۔



فرعون کا تابوت ایک چبوترے پر رکھا تھا۔ تابوت کے اوپر سانپ کا مجسمہ بنا ہوا تھا۔ شارل نے اس پر ٹارچ کی روشنی ڈالی۔ سانپ کی آنکھوں کے سرخ نگینے شعائیں دینے لگے۔ شارل نے تابوت کا ڈھکنا اٹھا دیا۔ اندر ٹارچ کی روشنی میں فرعون کی لاش دکھائی دی جس کے سارے بدن پر پٹیاں لپٹی ہوئی تھیں۔ صرف چہرہ کھلا تھا۔ چہرے پر لاش کو حنوط کرتے وقت جو رنگ روغن ملا گیا تھا وہ پھیکا پڑ چکا تھا۔ لاش کے سر پر سونے کا تاج تھا جس میں بڑے قیمتی ہیرے موتی جڑے ہوئے تھے۔ ٹارچ کی روشنی میں ان جواہرات میں سے رنگ برنگی کرنیں پھوٹنے لگی تھیں۔ فرانسیسی ماہر آثار قدیمہ مسٹر شارل بڑا خوش تھا۔ مجھے کہنے لگا۔

"ہم نے بہت بڑی کامیابی حاصل کی ہے۔ اس مشہور فرعون کی لاش ہمیں ٹھیک حالت میں مل گئی"۔ اس نے فرعون کا تاج نکال کر تابوت بند کر دیا اور بولا۔

"اس فرعون کا خزانہ بھی یہیں کہیں ہو گا۔ یہ لوگ بادشاہوں کو دفن کرتے وقت ان کا خزانہ بھی ساتھ دفن کر دیا کرتے تھے"۔

تھوڑی سی تلاش کے بعد ستونوں کے پیچھے ایک صندوق بھی مل گیا۔ صندوق میں سونے کے برتن بھرے ہوئے تھے۔ یہ ساری چیزیں اہرام سے نکال کر باہر کیمپ میں لائی گئیں۔ شارل اور اس کے ساتھیوں نے ان کا بغور معائنہ کیا۔ ان کی فہرست بنائی۔ مصری حکومت کا ایک افسر بھی وہاں پر موجود تھا مصری حکومت سے کئے گئے معاہدے کے مطابق شارل نے تاج اپنے پاس رکھا اور باقی سارا خزانہ حکومت کے حوالے کر دیا۔ یہ تاج

پیرس کے میوزم میں لے جا کر رکھنا چاہتا تھا۔

بصری نے مجھے کہا۔

"یاد رکھنا۔ اس فرانسیسی کی بدقسمتی کے دن شروع ہو گئے ہیں۔ اس نے فرعون کا خزانہ چرایا ہے۔ یہ فرعون کی بدعا سے نہیں بچ سکے گا"۔

میں نے بصری کو کوئی جواب نہ دیا اور مزدوروں کے کام کی نگرانی کرتا رہا۔ شارل کی بیوی جولیانہ ابھی تک قاہرہ کے ہسپتال میں تھی۔ اسے ایک روز پہلے خواب میں کوئی مصری کاہن دکھائی دیا تھا جس سے ڈر کر وہ بے ہوش ہو گئی تھی اور اسے ہسپتال پہنچانا پڑا تھا۔ شارل نے فرعون کا قیمتی تاج قاہرہ کے ایک بینک کے لاکر میں رکھ دیا۔ اس کی بیوی کی بیماری نے تشویش ناک صورت اختیار کر لی۔ ڈاکٹر اس کے مرض کی کوئی تشخیص نہ کر سکے تھے۔ جب جولیانہ کی حالت زیادہ نازک ہو گئی تو شارل اسے لے کر پیرس جانے کے واسطے ایئرپورٹ کی طرف اپنی چھوٹی سی گاڑی میں جا رہا تھا کہ اس کی گاڑی پل کے جنگلے سے ٹکرا کر دریائے نیل میں گر پڑی۔ گاڑی کے دروازے جام ہو گئے تھے جس کے نتیجے میں وہ دونوں گاڑی کے اندر ہی ڈوب کر بے بسی کے عالم میں ہلاک ہو گئے۔ جب ان کی موت کی خبر کیمپ میں پہنچی تو بصری دوڑا دوڑا میرے پاس آیا۔ کہنے لگا۔

"فرعون کی بدعا کا اثر شروع ہو گیا ہے۔ تم دیکھ لینا فرعون کی روح اس کے سارے خاندان سے اپنی بے حرمتی کا بدلہ لے گی"۔

مگر میں نے اس کی بات کا یقین نہ کیا۔ کیونکہ یہ ایک حادثہ تھا۔ پل پر سامنے سے ایک ٹرک آ رہا تھا جس سے بچنے کے لئے شارل نے اپنی گاڑی ایک طرف کی تو اتفاق سے اس کی گاڑی پل کے جنگلے سے ٹکرا کر دریا میں گر پڑی۔ اس سے زیادہ میں نے اس حادثے کو کوئی اہمیت نہ دی۔

شارل کی جگہ پیرس سے ایک دوسرا آدمی آ گیا جس نے اپنا کام شروع کر دیا۔ فرعون کا مقبرہ کھل چکا تھا۔ اس میں رکھے ہوئے چار ہزار سال پرانے نوادرات نکالے جا رہے

تھے اور انہیں مصری اور فرانسیسی حکومتوں کے مابین تقسیم کیا جا رہا تھا۔ فرعون کا تاج ابھی تک قاہرہ کے سرکاری بینک کے لاکر میں ہی تھا۔ شارل کی جگہ جو آفیسر پیرس سے آیا تھا اس کا نام کرسٹوفر تھا۔ یہ درمیانی عمر کا بڑا اکھڑ مزاج بے دین شخص تھا۔ جو مزدوروں کے ساتھ بھی بڑی سختی سے پیش آتا۔ لاکر کی چابی کرسٹوفر کے پاس ہی تھی۔ میرے ساتھ وہ اس لئے نرمی سے بات کرتا کہ میں اس کے اور مزدوروں کے درمیان ایک رابطے کی حیثیت رکھتا تھا اور کرسٹوفر کو جو بات سمجھانی ہوتی تھی وہ میرے ذریعے ہی مزدوروں اور دوسرے اہلکاروں کو سمجھاتا تھا۔

ایک روز اس نے کہا کہ میں بینک جا رہا ہوں۔ آج فرعون کا قیمتی تاج پیرس بھجوانا ہے۔ وہ چلا گیا وہ ایک بند گاڑی میں گیا تھا۔ مسلح گارڈ اس کے ساتھ تھے۔ بصری اس روز بڑا پریشان تھا۔ مجھے ایک طرف لے جا کر کہنے لگا۔

"یہ مصر کی دولت ہے جو پیرس جا رہی ہے۔ ہماری حکومت کو ان لوگوں کے ساتھ ایسا معاہدہ نہیں کرنا چاہئے تھا۔ ٹھیک ہے یہ لوگ کھدائی کے اخراجات برداشت کرتے ہیں۔ لیکن آخر یہ ساری دولت اور نوادرات ہمارے ہیں"۔

میں نے کہا۔ "یہ تو حکومتوں کے فیصلے ہیں ہم اس میں [illegible]

بصری غصے میں آگیا۔ بولا۔

"تم دیکھ لینا کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے۔ فرعون کا تاج یہاں سے کوئی نہیں لے جا سکے گا۔"

میں نے حسب عادت بصری کی باتوں پر زیادہ توجہ نہ دی۔ اس بات کو بمشکل پندرہ بیس منٹ گذرے ہوں گے کہ ایک دم سے مصری پولیس کی تین گاڑیاں وہاں آکر رکیں۔ پولیس کے آدمیوں نے سارے اہرام اور کیمپ کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔

بصری میری طرف دیکھنے لگا۔

"کچھ ہو گیا ہے"

مصری پولیس کانسٹیبل تھوڑے تھوڑے فاصلے پر صرف پہرے پر کھڑے ہو گئے

۔ ان کے انسپکٹر نے مزدوروں اور دوسرے کام کرنے والوں کو صرف اتنا ہی کہا تھا کہ ئی یہاں سے باہر نہ جائے۔ اتنے میں کرسٹوفر کی گاڑی بھی آگئی۔ وہ سخت پریشان نظر رہا تھا۔ پتہ چلا کہ بینک کے لاکر سے فرعون کا قیمتی تاج غائب ہو گیا ہے۔ یہ کوئی معمولی ت نہیں تھی۔ شہر کی ساری پولیس کو چوکس کر دیا گیا۔ کرسٹوفر کے آنے پر سارے پ کی تلاشی لی گئی۔ جس بینک کے لاکر سے یہ قیمتی تاج غائب ہوا تھا اس کے منیجر کو رفتار کر لیا گیا۔ ابھی اس کی تفتیش جاری تھی کہ اسی اہرام کا ایک دوسرا دالان کھولا یا۔ اسوقت بھی میں کرسٹوفر کے ساتھ تھا۔ اس دالان میں بارہ ستون تھے۔ دیوار کے تھ ایک ممی کا تابوت لگا ہوا تھا۔ کرسٹوفر نے اس تابوت کو کھولا تو اندر ایک عورت کی ط شدہ لاش تھی جو شکل و شبہات سے قدیم مصر کے شاہی خاندان کی شہزادی لگتی تھی۔ ا کے گلے میں سونے کا ایک لاکٹ تھا جس پر بڑا ہی قیمتی زمرد جڑا ہوا تھا۔ شہزادی کی ں کی آنکھیں ذرا ذرا کھلی تھیں۔ لگتا تھا وہ ہمیں دیکھ رہی ہے۔

کرسٹوفر نے مجھے کہا کہ تم دوسرے ستونوں کے پاس جا کر دیکھو وہاں کوئی نوادرات کا ں وغیرہ تو نہیں رکھا ہوا۔ مجھے کرسٹوفر پر کچھ شبہ سا ہوا۔ دالان میں اندھیرا تھا صرف نا ہی روشنی ہو رہی تھی جتنی کرسٹوفر کی ٹارچ سے پیدا ہو سکتی تھی۔ میں نے ایک نون کے پیچھے آتے ہی مڑ کر دیکھا اس وقت کرسٹوفر شہزادی کی لاش کے گلے سے لاکٹ ار کر اپنی جیب میں رکھ رہا تھا۔ میں نے یہی سوچا کہ وہ اسے بھی نوادرات کی سرکاری رست میں شامل کرے گا۔ مگر کیمپ میں آکر جب اس نے فہرست تیار کی تو اس میں زمرد لے لاکٹ کا کہیں ذکر نہیں تھا۔ میں سمجھ گیا کہ کرسٹوفر نے بددیانتی کی ہے اور یہ قیمتی لٹ اپنے پاس ہی رکھ لیا ہے۔ یہ بات مجھے اچھی نہ لگی۔ مگر پھر سوچا کہ مجھے ان حالات میں دخل دینے کی کیا ضرورت ہے۔ میں تو محض قدیم اہرام اور ان کے نوادرات ودیکھنے کے شوق کی خاطر اس ٹیم میں شامل ہوا تھا۔ ان کے اخلاق سدھارنے وہاں نہیں یا تھا۔

لیکن اس رات ایک عجیب واقعہ ہوا۔ اس رات مجھے کیمپ میں ہی دیر ہو گئی اور

میں کھانا کھا کر وہیں کیمپ کے باہر ستاروں کی روشنی میں کمبل اوڑھ کر سو گیا۔ آدھی رات کے وقت اچانک میری آنکھ کھل گئی مجھے ایسے لگا جیسے کسی نے میرے کندھے کو آہستہ سے ہلا کر مجھے جگایا ہے۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ ستاروں کی ہلکی ہلکی روشنی میں مجھے ایک لاش اپنے سامنے کھڑی دکھائی دی جس کے سارے جسم پر پٹیاں لپٹی ہوئی تھیں۔ صرف چہرہ خالی تھا۔ میں نے اسے پہچان لیا۔ یہ اسی شہزادی کی لاش تھی جس کے گلے سے کرسٹوفر نے قیمتی زمرد والا لاکٹ اتارا تھا۔ میرے کانوں میں اس کی دھیمی سی آواز آئی۔ وہ مجھ سے میری زبان میں کہہ رہی تھی۔ "میرے ساتھ آؤ"

===== ❑ ❑ =====

مجھ پر جیسے ایک سحر سا طاری ہو گیا تھا۔

میں اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ اگرچہ وہ ایک حنوط کی ہوئی لاش تھی۔ اس کے
ارے بدن پر پٹیاں تھیں۔ مگر مجھے اس سے کسی قسم کا خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا۔
اید اس لئے کہ وہ تین ہزار سال پرانے مصر کے ایک شاہی خاندان کی شہزادی کی لاش
ی۔ اور مصر کی قدیم تاریخ کے لئے میرے دل میں شروع ہی سے گہری وابستگی کے
بات تھے۔ اور یہی شوق مجھے الجزائر سے قاہرہ کی طرف کھینچ کر لے آیا تھا۔

وہ مجھے اہرام کے اس دالان میں لے آئی جہاں اس کا خالی تابوت پڑا تھا۔ تابوت کے
ب ایک پرانے زمانے کا شمع دان روشن تھا۔ یہ شمع دان پہلے وہاں نہیں تھا۔ اس کی
م اور دھندلی روشنی میں مجھ سے چار قدم کے فاصلے پر کھڑی شہزادی کی لاش کا سایہ
بات پر پڑ رہا تھا۔ یہاں پہلی بار مجھے خوف سا محسوس ہوا کہ یہ مجھے اس جگہ کیوں لے
ئی ہے۔

میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ مجھے ایک بار پھر شہزادی کی دھیمی آواز سنائی دی۔ یہاں میں
ضرور بتاتا چلوں کہ جب مجھے اس کی آواز آتی تھی تو اس کے ہونٹ بند ہوتے تھے۔ وہ
ہ رہی تھی۔

"ڈرو نہیں میں تمہیں وہاں لے جا رہی ہوں جہاں آج تک کوئی زندہ انسان نہیں جا
یا"

میں نے آہستہ سے کہا۔

"مگر میں ابھی مرنا نہیں چاہتا"۔

اس کی آواز آئی۔

"تم مرو گے نہیں تم وہ پہلے خوش قسمت آدمی ہو گے جو آج سے ساڑھے تین ہزار سال پہلے کے زمانے کو اپنی آنکھوں سے دیکھو گے۔ اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دو۔"

میں اس قسم کے خطرناک تجربے سے گذرنا نہیں چاہتا تھا۔ مگر خدا جانے مجھ پر اس عورت کے طلسم کا اثر تھا یا میرے دل میں اس زمانے کو دیکھنے' اس کے ماحول میں سانس لینے کی کوئی دبی ہوئی خواہش تھی کہ جس کے زیر اثر میرے ہاتھ اپنے آپ اپنی آنکھوں کی طرف اٹھ گئے۔ جونہی میں نے آنکھوں پر اپنے دونوں ہاتھ رکھے۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے اس لاش کا ہاتھ میرے کاندھے کو چھو رہا ہے ۔ اتنے عرصے کے بعد اپنی زندگی کے ایک انوکھے ناقابل یقین اور حیرت انگیز واقعے کو بیان کرتے ہوئے مجھ پر اس وقت بھی وہی کیفیت طاری ہو رہی ہے۔ بس مجھے ایک چکر سا آگیا تھا اور پھر جیسے میرے پاؤں کے نیچے سے کسی نے زمین ایک تختے کی طرح کھینچ لی اور میں نیچے گرا۔ اس کے بعد مجھے کوئی ہوش نہ رہا۔

میں اس ماورائی واقعے کو بیان تو کر رہا ہوں۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ آپ اس واقعے کی سچائی پر ضرور شک کریں گے۔ شبہ اس وقت بھی مجھے تھا اور آج بھی ہے۔ کیونکہ ہو سکتا ہے کہ وہ سب کچھ میرے ساتھ خواب کے عالم میں گذرا ہو۔ لیکن خواب میں آدمی اتنا بیدار نہیں ہوتا جتنا میں بیدار تھا اور سب کچھ پوری شدت سے محسوس کر رہا تھا۔ بہرحال وہ جو کچھ بھی تھا میں اس کی پوری تفصیل آپ کے سامنے بیان کرنا ایک ادیب کی حیثیت سے اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ آپ کو یقین نہ آئے تو بے شک یقین مت کیجئے گا۔ یقین مجھے بھی نہیں آ رہا مگر اتنا ضرور ذہن میں رکھیں کہ اس حقیقت کی اور سائنس کی دنیا میں بھی کبھی کبھی کہیں نہ کہیں کوئی ایسا مافوق الفطرت واقعہ ضرور رونما ہو جاتا ہے کہ جس کے آگے سائنس بے بس اور دم بخود ہو کر رہ جاتی ہے۔ میں یہاں روح اور مادے کی بحث نہیں چھیڑنا چاہتا لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ مشرق کے فلاسفروں کے علاوہ قدیم و جدید یورپ کے جس فلسفی اور ہیئت دان نے بھی مادے کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کی وہ آخر

اسی نتیجے پر پہنچا کہ مادے کا چھوٹے سے چھوٹا ذرہ بھی روح رکھتا ہے اور جن فلسفیوں نے کائنات کے نظام اور اس کے مزاج کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی وہ بے اختیار پکار اٹھے کہ اس دنیا کے بعد بھی ایک دنیا ہے جو روحانی دنیا ہے اور جہاں انسان کے اعمال کا محاکمہ ہوتا ہے اور اسے جزا اور سزا کے مراحل سے گذرنا پڑتا ہے۔

میں چونکہ روح کے وجود اور جزا و سزا پر ایمان رکھتا ہوں اس لئے اپنے جس تجربے سے گذرا اسے ایک روحانی تجربہ ہی کہوں گا جو مجھے عالم خواب میں پیش آیا۔ مگر یہ عالم خواب ---- عین عالم بیداری ایسا تھا۔ اب میں آپ کو اصل واقعہ سناتا ہوں۔

جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں۔ مصری شہزادی کی لاش نے جونہی میرے کاندھے سے اپنا ہاتھ لگایا مجھ پر ایک غنودگی سی طاری ہو گئی اور میں جیسے بے ہوش ہو گیا۔ جب ہوش آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ سنگ مرمر کے اونچے اونچے ستونوں والا ایک کمرہ ہے جس کی دیواروں پر سرخ اور نیلے مخمل کے پردے لٹک رہے ہیں۔ محرابی کھڑکی میں سے نیلے آسمان پر چمکتا چاند صاف دکھائی دے رہا ہے ۔ کمرے میں شمع دان روشن ہیں۔ فرش دبیز ریشمی قالینوں میں چھپا ہوا ہے۔ سنگ مرمر کی نیچی میز پر چاندی کے گلدان میں کنول کے سفید پھول سج رہے ہیں۔ سامنے آبنوسی دیوان پر وہی شہزادی' جس کی لاش مجھے اپنے ساتھ اہرام میں لائی تھی' گاؤ تکئے کا سہارا لئے بڑے سکون سے بیٹھی ہے۔ اس کا لباس بڑا شاہانہ ہے مگر سر پر تاج نہیں ہے۔ ایک سیاہ فام کنیز ذرا پیچھے ادب سے کھڑی آہستہ آہستہ مور چھل ہلا رہی ہے۔ اس پر اسرار فضا میں عجیب سی خوشبو پھیلی ہوئی ہے۔ مصری شہزادی نے پلکیں اٹھا کر میری طرف دیکھا اور ہاتھ سے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

میرے قریب ہی ایک پرانی طرز کی سیاہ کرسی پڑی تھی۔ میں اس پر بیٹھ گیا۔ ایک کنیز میرے واسطے زمرد کے گلاس میں شربت لے آئی۔ ایسا میٹھا اور پاکیزہ شربت میں نے پہلے کبھی نہیں پیا تھا۔ اس میں سے کنول کے پھولوں کی بڑی ہی لطیف خوشبو آ رہی تھی۔ تب شہزادی نے زبان کھولی اور کہا۔

"سنو! میں تمہیں یہاں اس لئے لے آئی ہوں کہ تم ہماری قدیم تاریخ سے محبت

رکھتے ہو۔ اس وقت تم تین ہزار برس قدیم مصر کے خدا پرست بادشاہ اخناتون کی سب سے چھوٹی بیٹی کے محل میں ہو۔ میرا باپ ایک خدا کو مانتا تھا تم نے اپنے زمانے میں لکھی ہوئی کتابوں میں بھی میرے بادشاہ باپ اخناتون کے بارے میں ضرور پڑھا ہو گا کہ یہ واحد فرعون تھا جو صرف ایک خدا اور ایک قادر مطلق کی ہستی پر ایمان رکھتا تھا اور جس نے تمام بت کدوں کو گرا دیا تھا۔ تمام بتوں کو تڑوا دیا تھا اور بتوں کی پوجا کو ممنوع قرار دے دیا تھا۔ میرے باپ کا انجام کیا ہوا؟ تم ان باتوں کو رہنے دو۔ بہرحال میں اپنے خاندان کی سب سے چھوٹی اور واحد شہزادی ہوں جو زندہ ہوں۔

میرے باپ کی نشانی ایک تاج تھا جو اس کے تابوت میں رکھا تھا۔ لیکن تمہارے زمانے میں یورپ کے لوگوں کو قدیم تہذیبوں کی کھدائیوں کا بڑا شوق ہے۔ زیادہ قدیم خزانے حاصل کرنے کی وجہ سے اور بہت کم ہمارے زمانے کی تہذیب و ثقافت سے روشناس ہونے کے لئے اب میری وہ بات غور سے سنو جو میں تمہیں سنانے لگی ہوں اور جس کے واسطے میں تمہیں یہاں لائی ہوں"۔

میں ہمہ تن گوش ہو گیا۔ محرابی کھڑکی میں سے چاند صاف نظر آ رہا تھا۔ اور ایک ای ہوا آ رہی تھی جس میں تین ہزار برس پرانی ٹھنڈی ستاروں بھری صحرائی رات کی خنکی او مہک تھی۔



مصری شہزادی کی آواز میں ایک پراسرار ماورائیت تھی۔

وہ سارے کا سارا ماحول ہی ماورائی تھا۔ ایک عجیب بات یہ تھی کہ اس وقت مجھے یک لمحے کے لئے بھی یہ محسوس نہیں ہوا کہ میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔ صرف یہی یک احساس تھا کہ میں کسی ان جانے حادثے یا ذریعے سے ہزاروں برس پرانی مصری ذیب کے زمانے میں پہنچ گیا ہوں اور مصر کی شہزادی سے جو اپنے آپکو ایک خدا پرست شاہ مصر اخناتون کی چھوٹی بیٹی ظاہر کرتی ہے ہمکلام ہوں۔

جب اس شہزادی نے یہ کہا کہ میں تمہیں ایک اہم بات بتانے والی ہوں تو میں ہمہ گوش ہو گیا۔ وہ تکیے سے ٹیک لگائے ہوئے ذرا آگے کو جھک گئی اور بولی۔

"جس طرح ہماری دنیا میں تمہارے لوگوں کا کوئی عمل دخل نہیں رہتا۔ اسی طرح ہم تمہاری دنیا میں دخل نہیں دے سکتے۔ میں نے تمہیں اس واسطے یہاں بلایا ہے بلکہ یں اپنے ساتھ لائی ہوں کہ تم پر اپنے بیان کی سچائی ثابت کر سکوں اور تم یہ نہ سمجھو میں غلط بیانی سے کام لے رہی ہوں۔ تم نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے کہ میرا ہ گیا ہے میرے باپ کا ایک تاج تھا' جو چوری ہو گیا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ یہ نشانی میری امانت مجھے واپس دلانے میں تم میری مدد کرو۔"

وہ ایک لمحے کے لئے خاموش ہو گئی۔ میں نے موقع غنیمت جانتے ہوئے کہا۔

"ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی اگر تم مجھے تین ہزار سال آگے کے زمانے سے زمانے میں لا سکتی ہو تو پھر اپنا تاج کیوں نہیں لا سکتیں؟"

شہزادی کے چہرے پر بڑا نورانی سا تبسم نمودار ہوا۔ اس نے شفقت بھرے لہجے میں کہا۔

"میں جس باپ کی بیٹی ہوں وہ ایک رحم دل اور سب سے محبت کرنے والا فرعون تھا۔ وہ طلسم اور جادو کے بھی خلاف تھا۔ میں بھی اسی کے نقش قدم پر چل رہی ہوں۔ تم نے دیکھ لیا ہے کہ میری خواب گاہ میں کسی جانور یا دیوتا کا بت نہیں ہے۔ اس لئے کہ میں بھی اپنے باپ کی طرح ایک قادر مطلق کو مانتی ہوں اور کسی بت کی پوجا نہیں کرتی۔ اسی طرح میں جادو ٹونے پر بھی ایمان نہیں رکھتی اور تمہاری دنیا کے ضابطوں کا احترام کرتی ہوں۔"

میں نے سوال کیا کہ تم مجھ سے کیا چاہتی ہو؟ وہ بولی۔

"میں چاہتی ہوں کہ تم میرا شاہی تاج واپس دلانے میں میری مدد کرو۔"

میں نے کہا۔

"مگر مجھے تو کچھ بھی معلوم نہیں کہ تمہارا شاہی تاج کس کے پاس ہے۔ وہ تو قاہرہ کے بینک کے لاکر سے غائب ہو چکا ہے اور پولیس اس کا کھوج لگانے کی کوشش کر رہی ہے"۔

شہزادی مسکرائی کہنے لگی۔

"اگر میں تمہیں بتادوں کہ شاہی تاج کس کے پاس ہے تو کیا تم وہاں سے لے آؤ گے؟"

میں نے کہا۔ "مجھے وہاں سے تاج لانے میں کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟"

شہزادی بولی۔

"تو سنو! شاہی تاج فرانسیسی پروفیسر کرسٹوفر نے قاہرہ کے ایک یہودی شارون کے پاس فروخت کر دیا ہے جو قاہرہ کے سب سے مہنگے اور جدید ترین ہوٹل سیمی رامس میں مقیم ہے"۔

"کیا شاہی تاج بھی اس کے پاس ہی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں" شہزادی نے کہا۔ "وہ یہ قیمتی تاج اپنے ملک میں سمگل کرنے کی کوشش میں ہے۔ اس نے ایک یہودی جاسوس ثبت کی خدمات حاصل کر رکھی ہیں۔ یہ تاج اسی یہودی جاسوس کے پاس ہے جو اس وقت اسکندریہ میں ایک گھڑی ساز کی حیثیت سے معمولی سی دکان لگائے بیٹھا ہے۔ تمہیں یہ تاج اس سے واپس لانا ہو گا۔ کیا تم یہ کام کر لو گے؟ اس کے لئے بڑی ہوشیاری اور جرات مندی کی ضرورت ہو گی"۔

میں نے یہ چیلنج قبول کر لیا اور شہزادی سے کہا کہ میں تمہاری امانت تم تک پہنچانے کے لئے پوری کوشش کروں گا۔ لیکن میں اس یہودی جاسوس ثبت کو کیسے پہچانوں گا؟ اس شہزادی نے مجھے سنگ مرمر کی میز کی طرف دیکھنے کا اشارہ کیا۔ جونہی میں نے میز کی سطح پر نگاہ ڈالی تو وہاں ایک بازار کا منظر ابھر آیا۔ یہ ایک تنگ سا چھتا ہوا بازار تھا جس کی ایک دکان پر ایک درمیانی عمر کا گھڑی ساز بیٹھا گھڑی مرمت کر رہا تھا۔ شہزادی نے کہا۔

"یہی وہ یہودی جاسوس ثبت ہے۔ میرا قیمتی تاج اسی کے پاس ہے۔ اس بات کا سراغ تمہیں ہی لگانا ہو گا کہ اس نے تاج کہاں چھپا رکھا ہے۔ یہ شخص بڑا تجربہ کار یہودی جاسوس ہے اور کئی زبانیں بول لیتا ہے۔ عربی زبان یہ مصری اور شامی لہجے میں بڑی روانی سے بولتا ہے۔ یہاں اس نے اپنا نام ساعد شامی مشہور کر رکھا ہے۔ یہ اپنے ملک کے لئے عربوں کے خلاف جاسوسی بھی کرتا ہے۔ اس عرب دشمن جاسوس کو کیفر کردار تک پہنچانا ایک مسلمان کی حیثیت سے تمہارا فرض بھی ہے۔"

اس کے بعد شہزادی نے مجھے سیاہ دھات کی بنی ہوئی ایک انگوٹھی دے کر کہا۔

"میں ایک خدا پرست بادشاہ کی بیٹی ہونے کے ناطے تمہیں کہتی ہوں کہ اصل طاقت کا سرچشمہ قادر مطلق کی ذات ہی ہے۔ مگر اس کی مرضی سے اس کی کچھ تخلیقات میں کوئی خاص صفت پیدا ہو جاتی ہیں جو قادر مطلق کے کرم کا مظہر ہوتی ہیں۔ اسی طرح اس انگوٹھی میں بھی یہ صفت پیدا ہو گئی ہے کہ جب تم اسے پہنو گے تو تمہارے ارد گرد نظر نہ آنے والی ایک ایسی دیوار بن جائے گی جو تمہیں دنیا کے کسی بھی مہلک ہتھیار سے بچا لے گی۔ لو اسے پہن لو"۔

میں نے انگوٹھی پہن لی۔ شہزادی اپنے دیوان سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ میرے قریب آئی۔ اس نے آہستہ سے میرے کاندھے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور کہا۔

"اگر تم ہمارا خاندانی تاج واپس لے آئے تو میرے دل سے تمہارے لئے ہمیشہ دعا نکلے گی اور میں تمہارا یہ احسان کبھی فراموش نہ کر سکوں گی۔ اب جاؤ۔ اسکندریہ کا بازار اور اس کی ایک دکان میں بیٹھا خطرناک یہودی جاسوس تمہارا منتظر ہے۔ اور ہاں جب تک یہ انگوٹھی تمہارے پاس ہے تمہیں روپے پیسے کی کمی محسوس نہیں ہو گی۔ تمہاری جیب میں اس ملک کی کرنسی موجود رہے گی جس ملک میں تم رہ رہے ہو گے۔ اور تم ہر ملک کی زبان بھی بول سکو گے۔ خدا تمہاری حفاظت کرے"۔

اس کے ساتھ ہی مجھ پر غنودگی سی طاری ہونے لگی اور میری آنکھیں اپنے آپ بند ہو گئیں۔ مجھے کچھ معلوم نہیں کہ کتنا وقت گذرا۔ لیکن جب میں نے آنکھیں کھولیں تو میں ماڈرن اسکندریہ کے چھتے ہوئے بازار میں ایک طرف موجود تھا۔ اور سامنے وہی دکان تھی جس کے اڈے پر یہودی جاسوس ثبت بیٹھا ایک آنکھ پر گول شیشہ چڑھائے گھڑی مرمت کر رہا تھا۔ میں دکان کی طرف بڑھا۔



میں نے یہودی جاسوس ثبت کو پہچان لیا تھا۔ یہی وہ خطرناک جاسوس تھا جس کی مدد ے شارون، مصری شہزادی کے والد اخناتون کا قیمتی تاریخی تاج کو مصر سے باہر سمگل رنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں ثبت کی دکان میں داخل ہوا تو عین اسی وقت وہاں ایک وسرا گاہک بھی آگیا۔ اس نے عربی زبان میں اپنی مرمت شدہ گھڑی کے بارے میں ریافت کیا۔ ثبت جاسوس نے الماری میں سے ایک سنہری زنجیر والی گھڑی نکال کر اسے ے دی اور اس سے باتیں کرنے لگا۔ میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

اسکندریہ کا یہ بازار بڑا مصروف کاروباری بازار تھا۔ وہاں ہر قسم کی دکانیں تھیں۔ ازار میں سے ایسی خواتین بھی گذر رہی تھیں جنہوں نے سیاہ نقاب اوڑھ رکھے تھے۔ یہ سکندریہ کا قدیم علاقہ تھا۔ جدید اسکندریہ کے علاقے میں اونچی اونچی عالی شان عمارتیں، ٹاپنگ پلازا اور بڑے بڑے ہوٹل تھے۔ کشادہ سڑکوں پر ہروقت ٹریفک رواں رہتا تھا۔ ں شہر کو جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں سکندر اعظم نے آباد کیا تھا۔ لیکن یہ بھی ایک اریخی حقیقت ہے کہ جس مقام پر سکندر نے یہ شہر آباد کیا تھا وہ یہ مقام نہیں ہے۔ بلکہ رانا اسکندریہ وہاں سے چند کوس کے فاصلے پر آباد ہوا کرتا تھا۔ مگر وقت نے اس شہر کے مام آثار مٹا دیئے ہیں اور اب وہاں سوائے ریت کی اونچی نیچی ڈھیریوں کے اور کچھ نہیں ہے۔

گاہک چلا گیا تو یہودی جاسوس میری طرف متوجہ ہوا۔ اس نے عربی میں بڑے اخلاق ے ساتھ مجھ سے پوچھا کہ مجھے کیا چاہیے؟ مصری شہزادی کی دی ہوئی انگوٹھی میری انگلی

میں تھی۔ میں نے دکان میں داخل ہونے سے پہلے اپنی جیکٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر دیکھ لیا تھا کہ دونوں جیبوں میں مصری پاؤنڈ کے کافی نوٹ پڑے ہوئے تھے۔ مصری شہزادی کی پیشین گوئی پوری ہو گئی تھی۔ میں نے اپنے ذہن میں سوچ لیا تھا کہ اس یہودی جاسوس کے ساتھ کیا بات کرنی ہے۔ چنانچہ اس کے پوچھنے پر کہ میں کس لئے وہاں آیا ہوں۔ میں نے بڑے اعتماد اور بڑی رازداری سے اس کی طرف جھک کر اسرائیلی زبان میں کہا۔

"مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے"۔

مصری شہزادی نے مجھے یہ بھی کہا تھا کہ جب تک انگوٹھی میرے ہاتھ میں رہے گی میں دنیا کی جس زبان میں چاہے روانی سے بات کر سکوں گا۔ یہودی جاسوس نے مجھے اپنی زبان میں بات کرتے سن کر میری طرف غور سے دیکھا اس کی آنکھوں میں بڑی تیز چمک تھی۔ مگر آدمی بڑا ہوشیار تھا۔ اس نے میری طرف کوئی خاص توجہ نہ دی اور صرف اتنا کہا۔

"کیا چاہتے ہو؟"

اور پھر گھڑی کی مرمت میں مصروف ہو گیا۔ میں نے اسے کہا کہ میں تم سے تنہائی میں کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ اس میں ہماری قوم اور ہم دونوں کا بھی فائدہ ہے۔ وہ میری طرف دیکھے بغیر کہنے لگا۔ "ابھی تو تم کہہ رہے تھے کہ تمہیں میری مدد کی ضرورت ہے"۔ میں نے کہا۔ "اس لئے کہ جو کام میں کرنا چاہتا ہوں وہ تمہاری مدد کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

وہ مسکرایا ابھی تک وہ اپنے کام میں ہی لگا تھا اور میری طرف بالکل نہیں دیکھ رہا تھا۔ کہنے لگا۔ "بھائی میں تو ایک معمولی گھڑی ساز ہوں سارا دن دکان پر گھڑیوں کی مرمت کرتا ہوں۔ تب جا کر کہیں چار پیسے ملتے ہیں۔ میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ تم کسی دوسری دکان پر جاؤ۔"

میں نے آہستہ سے کہا۔

"تم ہماری قوم کے واسطے یہاں ایک خفیہ مشن پر ہو"۔

یہ یہودی جاسوس اتنا تجربہ کار اور چالاک تھا کہ میرے اس جملے پر بھی اس نے کسی قسم کی حیرانی کا اظہار نہ کیا اور بدستور کام میں لگا رہا۔ صرف مسکرایا اور بولا۔

"بھائی! اگر تم مصر کی خفیہ پولیس کے آدمی ہو تو بڑے اناڑی ہو اور غلط آدمی کے پاس آ گئے ہو۔ میں چھ برس سے یہاں دکان کر رہا ہوں۔ میں یہودی ضرور ہوں مگر مصر کا باشندہ ہوں اور اسی ملک کی بھلائی اور بہتری میرا پہلا فرض رہا ہے۔ تم مجھے کوئی پاگل لگتے ہو۔ اپنا راستہ لو۔ میرا وقت ضائع نہ کرو"۔

میں نے اس کے انتہائی خفیہ کوڈ کا نمبر بول دیا جو مجھے مصری شہزادی نے بتا دیا تھا یہودی جاسوس ثبت کا چھوٹا سا پیچ کس گھڑی کے کسی پیچ پر چلتے چلتے رک گیا۔ اس نے آنکھ پر لگا ہوا گول شیشہ اتار دیا۔ ایک نظر بازار پر ڈالی۔ اور میری طرف دیکھے بغیر آہستہ سے بولا۔

"اندر کمرے میں چلے چلو۔ میں آتا ہوں"۔

دکان کے اندر ایک تنگ و تاریک چھوٹا سا کمرہ تھا جس میں صرف روشندان میں سے ہلکی روشنی آ رہی تھی۔ کمرے میں ایک پلنگ' دو پرانی کرسیاں اور دوسرا سامان بکھرا پڑا تھا۔ میں ابھی بیٹھا ہی تھا کہ یہودی جاسوس ثبت بھی آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا۔ اس نے اپنے پیچھے کمرہ بند کر دیا اور وہیں کھڑے کھڑے پستول کا رخ میری طرف کئے بولا۔

"تمہیں کس نے بھیجا ہے؟"

مجھے پستول کا کوئی خطرہ تو تھا نہیں میرے ہاتھ کی انگوٹھی میری حفاظت کر رہی تھی۔ میں نے وضاحت کرنے کی کوشش کی تو اس نے فائر کر دیا۔ گولی میری گردن کے قریب سے نکل گئی۔ قدرتی طور پر میں جان بچانے کی کوشش کرتے ہوئے اس پر جھپٹا۔ پستول اس کے ہاتھ سے گر گیا۔ مگر وہ ٹرینڈ جاسوس تھا اور اسے کمانڈو کی ٹریننگ بھی ملی ہوئی تھی۔ اس نے میری گردن پر ایسا ہاتھ مارا کہ میں پیچھے کو گرا۔ اس نے فوراً مجھے دبوچ لیا اور میری گردن میں نائلون کی رسی ڈالی اور پوری طاقت سے مجھے چھ سات جھٹکے دیئے اور

پھر اتنی زور سے رسی کو بل دیئے کہ اگر اخناتون کی بیٹی نے مجھے اپنی کرامات والی انگوٹھی نہ دے رکھی ہوتی تو میرا زندہ رہنا ناممکن تھا۔

عام حالات میں میرے سانس کو رک جانا چاہئے تھا مگر ایسا بالکل نہیں ہوا تھا۔ میرا سانس بڑی آسانی سے چل رہا تھا۔ میری گردن کی رگیں جیسے ایک دوسری سے مل گئی تھیں مگر مجھے سانس لینے میں ذرا سی بھی دشواری نہ ہو رہی تھی۔ میں نے موقع غنیمت جان کر اپنے آپ کو یوں ظاہر کیا جیسے میں مرگیا ہوں۔

میں نے حلق میں سے غرغراہٹ کی مصنوعی آواز پیدا کی اور آنکھیں بند کر کے ہاتھ پاؤں یوں ڈھیلے چھوڑ دیئے جیسے میری روح پرواز کر گئی ہے۔ میری یہ حالت دیکھ کر یہودی جاسوس نے اپنی گرفت ڈھیلی کر دی۔ میں نے گردن کو ایک طرف لٹکا دیا تھا۔ یہودی جاسوس نے میرے دل پر ہاتھ رکھ کر دیکھا۔ میں کنکھیوں سے اسے تک رہا تھا۔ شاید اسے میرے دل کی دھڑکن بند محسوس ہوئی تھی۔ کیونکہ اس نے اطمینان سے سر کو آہستہ سے ہلایا اور پھر میری لاش کو پلنگ پر سے گھسیٹ کر کمرے کے کونے میں ڈالا اور اوپر ایک کمبل ڈال دیا۔ مجھے اس کے کمرے سے باہر جانے کی آواز سنائی دی۔ میں نے آہستہ سے کمبل ایک طرف ہٹا کر دیکھا۔ دروازہ تھوڑا سا کھلا تھا۔ چند سیکنڈ بعد وہ اندر آگیا۔ میں نے کمبل چہرے کے اوپر کر لیا۔ اس نے پلنگ کے نیچے سے کوئی بکس گھسیٹ کر باہر نکالا اور پھر وائرلیس پر کسی سے کوڈ الفاظ میں باتیں کرنے لگا۔ کرامات والی انگوٹھی کی وجہ سے وہ کوڈ میری سمجھ میں آرہا تھا۔

وہ کہہ رہا تھا۔ "یہاں کی خفیہ ایجنسی کو ہمارے خصوصی کوڈ کا علم ہو گیا ہے۔ ہاں ان کا ایک ایجنٹ مجھ سے ہلاک ہو گیا ہے۔ تم جتنی جلدی ہو سکے یہاں آجاؤ پھر تم سے پوری بات ہو گی۔"

وہ بکس بند کر کے باہر چلا گیا مجھے باہر سے کمرے پر تالا ڈالنے کی آواز سنائی دی۔ میں لاش کی شکل میں کمرے کے کونے میں پڑا تھا۔ اب میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ اس یہودی کا دوست کون ہے؟

میں آپ کو اپنی آپ بیتی سنا رہا ہوں اور آپ اپنے دل میں ضرور سوچتے ہوں گے کہ واقعات من گھڑت ہیں۔ ان کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے آپ ایسا سوچنے میں ل حق بجانب ہیں جب یہ واقعات میرے ساتھ گذر رہے تھے تو مجھے بھی یقین نہیں ہا تھا کہ یہ سب کچھ حقیقت میں ہو رہا ہے۔ مجھے لگتا تھا کہ میں کوئی خواب دیکھ رہا ں۔ کیونکہ یہ کیسے ہو سکتا کہ ایک آدمی میری گردن میں رسی ڈال کر اسے پوری طاقت ساتھ دبائے رکھے اور کم از کم ایک منٹ تک میری گردن کو اس پھندے میں جکڑے ھے اور مجھ پر اس کا کوئی اثر نہ ہو۔ میرا سانس چلتا رہے۔ مجھے سانس لینے میں ذرا سی دقت نہ ہو۔ ٹھیک ہے مجھے اخناتون کی بیٹی مصری شہزادی نے اپنی انگوٹھی ضرور دے ی تھی مگر یہ انگوٹھی مجھے رسی کے پھندے سے کیسے بچا سکتی تھی۔ لیکن ایسا ہو گیا تھا دی جاسوس نے میرے دل پر بھی ہاتھ رکھ کر دیکھا تھا۔ یقیناً اس وقت میرے دل کی ڑکن بھی اسے ساکت محسوس ہوئی تھی۔ تب ہی اس نے مجھے مردہ سمجھ کر میری لاش طرف ڈال دی تھی اور اسکندریہ میں اپنے ساتھی اسرائیلی ایجنٹ کو وائرلیس پر خفیہ یں میری موت کی خبر دی تھی اور اسے فوراً بلایا تھا۔ آج میں ان واقعات کو یاد کرتا ا تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے یہ سارے واقعات میرے ساتھ خواب میں گذرے ں۔ لیکن تب ایسا ایک لمحے کے لئے بھی مجھے محسوس نہیں ہوا تھا۔ ساری باتیں جیتی حالت میں ہو رہی تھیں۔ ہاں کبھی کبھی ایسا ضرور محسوس ہوتا تھا جیسے کسی نے مجھ پر عمل پڑھ رکھا ہے کیونکہ مجھے اپنا جسم پہلے کے مقابلے میں ہلکا محسوس ہونے لگا تھا۔

بہرحال میں آپ سے اتنا ضرور کہوں گا کہ میری کہانی سنتے ہوئے اس کے ہر واقعے کو عقل کی کسوٹی پر پرکھنے کی کوشش نہ کریں کیونکہ ہماری ترقی یافتہ سائنس کی دنیا میں آج بھی کبھی کبھی ایسے واقعات رونما ہو جاتے ہیں۔ جنہیں دیکھ کر عقل بھی حیران و پریشان رہ جاتی ہے اور جن کا عقل کے پاس کوئی جواز نہیں ہوتا۔

اب میں اپنی آپ بیتی آگے شروع کرتا ہوں۔

یہودی ایجنٹ جو اسکندریہ میں مصری باشندے کی حیثیت سے گھڑیوں کی مرمت کی دکان کرتا تھا۔ اپنی طرف سے مجھے ہلاک کر چکا تھا دکان کی پچھلی کوٹھڑی میں میری لاش پڑی تھی جس پر اس نے کمبل سا ڈال دیا تھا۔ دروازے پر باہر تالا لگا دیا گیا تھا۔ یہودی ایجنٹ ثبت کامل کو اپنے ساتھی جاسوس یا ایجنٹ کا انتظار تھا۔ تھوڑی دیر میں وہ بھی آگیا۔ دونوں میرے اوپر جھک گئے۔ وہ میری لاش کا معائنہ کر رہے تھے۔ میں نے اپنی آنکھیں تھوڑی تھوڑی کھول رکھی تھیں۔ جس طرح بعض لاشوں کی کھلی ہوتی ہیں۔ عجیب بات ہے کہ مجھے بھی اپنا جسم سخت سخت سا لگنے لگا تھا۔ دوسرے ایجنٹ کی چھوٹی چھوٹی سنہری مونچھیں تھیں اور اس نے آنکھوں پر گولڈن فریم والی عینک چڑھا رکھی تھی۔ وہ آپس میں عبرانی زبان میں باتیں کرنے لگے۔

گھڑی ساز یہودی نے کہا۔

"مصری خفیہ ایجنسی کو ہمارے کوڈ کا علم کیسے ہو گیا؟ ہمیں فوراً ہیڈ کوارٹر کو اطلاع کرنی ہو گی"۔

دوسرا یہودی ایجنٹ بولا۔

"میں نے اطلاع کر دی ہے کوڈ بدل دیا گیا ہے۔ لیکن تشویش کی بات یہ ہے کہ اگر یہاں کی خفیہ ایجنسی کو ہمارے کوڈ کا علم ہو گیا ہے تو یقیناً اسے ہمارے خفیہ ٹھکانوں اور ا ایجنٹوں کا بھی علم ہو گیا ہو گا جو اسرائیل کے لئے یہاں کام کر رہے ہیں۔ ان تک ابھی ہمارا تبدیل شدہ کوڈ نہیں پہنچا۔ اور موجود خفیہ کوڈ میں ہم انہیں خبردار نہیں کر سکتے خاص طور پر ہمارا جو ایجنٹ رابی شام میں دمشق کی بلند پہاڑی پر واقع بڑی توپوں

ک مورچوں کو تباہ کرنے کے اہم مشن پر کام کر رہا ہے اس کو نئے کوڈ کی اطلاع دینے ں خود جانا ہو گا"۔

کام ثبت کامل گھڑی ساز فوراً جانے کے لئے تیار ہو گیا۔ دوسرا ایجنٹ کہنے لگا۔

"کل صبح کی فلائٹ سے ہی تم دمشق روانہ ہو جاؤ اور اب تمہیں یہ اڈہ بھی بند کرنا ا۔ یہاں کسی بھی وقت چھاپہ پڑ سکتا ہے اور تم پکڑے جا سکتے ہو"۔

"میں ابھی یہ جگہ چھوڑ دوں گا" گھڑی ساز یہودی نے کہا۔

"ٹھیک ہے یہ بتاؤ کہ شارون کے مصری کراؤن کا کیا بنے گا وہ ابھی تک اسرائیل عجائب گھر میں نہیں پہنچا"۔

گھڑی ساز کہنے لگا۔ "وہ تو میں نے اپنے ماسٹر سپائی کے ہاتھوں دمشق میں رابی کے ہی پہنچا دیا تھا"۔

دوسرے ایجنٹ نے کہا۔

"ٹھیک ہے رابی خود اسے تل ابیب پہنچانے کا انتظام کرے گا۔ اب تم نئے خفیہ کوڈ نمبر کاغذ پر لکھ کر اپنے پاس رکھ لو۔ یہ تمہیں دمشق میں رابی کو پہنچانے ہوں گے۔"

کامل گھڑی ساز بولا۔ "مگر میں نے رابی کو ابھی تک دیکھا نہیں ہے"

ایجنٹ نے اسے رابی کا حلیہ بتاتے ہوئے کہا۔

"وہ نارمل سا آدمی ہے۔ درمیانہ قد ہے گول چہرہ ہے۔ رنگ گندمی سر کے درمیان بال نہیں ہیں۔ عمر پچاس کے قریب ہے۔ وہ تمہیں دمشق کے کریسنٹ کلب کے کافی نج میں بیرے کی وردی میں ملے گا۔ اس کی سب سے بڑی نشانی یہ ہے کہ اس کے ں کان میں سوراخ ہے جس میں وہ چاندی کا تنکا ڈالے رکھتا ہے۔ اسے اپنا نمبر بتانا پھر نیا ڈاس کے حوالے کر دینا۔ علاقے کے دوسرے ایجنٹوں کو وہ خود ہی خبر کر دے گا۔"

"اس لاش کو کہاں لے جائیں؟" گھڑی ساز ایجنٹ نے میری طرف اشارہ کرتے ئے پوچھا۔

"یہ ہمارے کسی کام کی نہیں۔ اسے یہیں پڑی رہنے دو۔ میں پہلے جاتا ہوں۔ میرے د تم بھی یہاں سے نکل جانا۔ کل صبح کی فلائٹ پر تمہیں دمشق چلے جانا ہو گا۔ میں تمہیں

وہاں نہیں ملوں گا۔ رابی کو میں خبر کر دوں گا کہ تم پہنچ رہے ہو"۔

یہ کہہ کر وہ کوٹھڑی میں سے تیزی سے نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد گھڑی ساز یہودی ایجنٹ باہر دکان پر گیا۔ وہ جلدی جلدی چیزیں ادھر ادھر سمیٹ رہا تھا۔ مجھے الماریوں کے دروازے اور دراز کھلنے بند ہونے کی آوازیں آرہی تھیں۔ پھر اندر آکر اس نے پلنگ کے نیچے سے چھوٹے وائرلیس سیٹ کو بکس سے نکال کر کپڑے میں لپیٹا اور چلا گیا۔ باہر سے مجھے دکان کا دروازہ بند کرنے کی آواز آئی تو میں کمبل ہٹا کر اٹھ بیٹھا۔ تیزی سے کوٹھڑی سے نکلا۔ دکان میں باہر سے تالا لگا ہوا تھا۔ میں دکان میں بند ہو گیا تھا۔ مصری شہزادی کے والا یعنی اخناتون کے تاج کا سراغ تو مجھے مل گیا تھا لیکن اب مجھے دمشق کی مضافاتی پہاڑی کے ان گن پوسٹوں یعنی توپوں کے مورچوں کی فکر تھی جو ایک اسلامی ملک کی سلامتی کی ضامن تھیں اور جنہیں اسرائیلی ایجنٹ تباہ کرنے کا ناپاک منصوبہ بنا چکے تھے۔ میں نے اس ناپاک منصوبے کو ناکام بنانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ایک مسلمان اور برادر اسلامی ملک کا خیر خواہ ہونے کی حیثیت سے یہ میرا فرض بھی تھا میں نے دل میں ایک پروگرام طے کر لیا تھا۔ پروگرام یہ تھا کہ میں گھڑی ساز یہودی ایجنٹ سے پہلے دمشق کی کریسنٹ کلب میں جا کر خطرناک یہودی جاسوس رابی سے ملوں۔ اس کے آگے اپنے آپ کو گھڑی ساز ایجنٹ ظاہر کروں۔ اسے نیا خفیہ کوڈ بتادوں جو مجھے ازبر ہو گیا تھا اور اس سے قدیم مصری تاج حاصل کروں اور اس کے بعد یہ پتہ چلانے کی کوشش کروں کہ اسلام دشمن یہودی ایجنٹوں نے اسلامی ملک کے سب سے اہم توپ خانے کے مورچوں کو نقصان پہنچانے کی کیا سکیم تیار کر رکھی ہے۔ مگر سب سے پہلے مجھے اس دکان سے باہر نکلنا تھا۔ جہاں میں بند ہو گیا تھا۔ بازار میں لوگ آجا رہے تھے۔ میں کسی کو خبر ہوئے بغیر وہاں سے نکلنا چاہتا تھا۔ دکان کا دروازہ لوہے کا تھا۔ میں واپس کوٹھڑی میں آگیا۔ پلنگ کے اوپر کرسی رکھ کر روشندان تک پہنچا۔ جھانک کر دیکھا دوسری طرف ایک چھوٹا سا احاطہ تھا جہاں کھجور کے ایک درخت کے نیچے دو اونٹ بیٹھے تھے۔ میں نے اسی روشندان سے نیچے اترنے کا فیصلہ کیا اور نیچے اتر کر کوئی رسی تلاش کرنے لگا۔

===== ❑ ❑ =====

تھوڑی سی کوشش کے بعد میں روشندان میں سے دوسری طرف احاطے میں اترنے میں کامیاب ہو گیا۔ مجھے وہاں اترتے صرف ان دو اونٹوں نے ہی دیکھا جو کھجور کے نیچے بیٹھے بڑے اطمینان سے جگالی کر رہے تھے۔ اخناتون کی بیٹی کی دی ہوئی حیرت کے کمالات دکھانے والی انگوٹھی میری انگلی میں پڑی تھی۔ اس کا ایک کمال تو یہ تھا کہ میری جیکٹ کی جیب میں مصری پاؤنڈ کافی تعداد میں محفوظ تھے۔ میں نے ٹیکسی پکڑی اور سیدھا ایئرپورٹ پہنچ گیا۔ ایئرپورٹ کی عمارت کے سامنے والے بلاک میں ٹریول ایجنسیوں کے دفتر تھے۔ وہاں سے مجھے دو گھنٹے بعد قاہرہ سے دمشق روانہ ہونے والی فلائٹ میں جگہ مل گئی۔ یہ وقت میں نے ایئرپورٹ کے کیفے میں گذارا۔ وقت مقررہ پر فلائٹ پکڑی اور دمشق کی جانب روانہ ہو گیا۔

یہ شہر دیکھنے کا مجھے پہلے کبھی اتفاق نہیں ہوا تھا۔ بغداد کے بعد دمشق کا شمار بھی الف لیلوی شہروں میں ہوتا ہے۔ اس شہر کی تاریخ بھی ہزاروں برس پرانی ہے۔ اس شہر نے قوموں اور تہذیبوں کے کتنے ہی عروج و زوال دیکھے ہیں۔ اب تو یہ بڑا ماڈرن شہر بن چکا تھا۔ پھر بھی اسلامی ثقافت کا رنگ غالب تھا۔ ایئرپورٹ کی عمارت اسلامی طرز تعمیر کا دیدہ زیب نمونہ تھی۔ میرے پاس سامان تو تھا نہیں انگوٹھی کے اثر سے میں وہاں کی عربی زبان شامی لہجے میں بڑی خوبی سے بولتا تھا۔ چنانچہ مجھے وہاں کسی قسم کی اجنبیت یا پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑا۔ ایئرپورٹ کے سامنے ایک فائیو سٹار ہوٹل میں ایک کمرہ میں نے فرضی نام سے لے لیا۔ ایک گھنٹے بعد اپنے کمرے سے تازہ دم ہو کر نکلا اور ٹیکسی ڈرائیور کو کریسنٹ

کلب چلنے کو کہا۔ یہ کوئی مشہور کلب تھا۔ کیونکہ ٹیکسی ڈرائیور نے آگے سے کوئی سوال نہ کیا اور ٹیکسی وہاں سے نکال کر ایک کشادہ سڑک پر ڈال دی جس کے دونوں جانب بلند عمارتیں اور درمیان میں کہیں کہیں سبزہ زار اور درخت تھے۔

گھڑی ساز یہودی ایجنٹ کے بارے میں مجھے یقین تھا کہ وہ کل کسی وقت وہاں پہنچے گا۔ اس کے آنے سے پہلے پہلے میں اپنا کام پورا کر لینا چاہتا تھا۔ پہلا کام تو کریسنٹ کلب میں ویٹر رابی سے مصری تاج کے بارے میں پتہ کرنا تھا کہ وہ اس نے کہاں رکھا ہوا ہے۔ اسے اپنے قبضے میں لینا تھا۔ اس کے بعد شامی پہاڑی مورچوں کے خلاف یہودی انٹیلی جنس کے ناپاک منصوبے کے متعلق معلومات حاصل کرنا تھیں۔ صرف ایک ہی بات میرے حق میں جاتی تھی اور یہودی ایجنٹ رابی کا پورا اعتماد حاصل کرنے میں میری مددگار تھی کہ مجھے ان کا نیا خفیہ کوڈ معلوم تھا اور اسکندریہ سے اسے میرے بارے میں خفیہ پیغام بھی مل چکا تھا۔ اگرچہ یہ پیغام گھڑی ساز یہودی ایجنٹ ثبت کامل کے بارے میں تھا۔ لیکن اس کی جگہ میں وہاں پہنچ رہا تھا۔

ٹیکسی کریسنٹ کلب کے باہر جا کر رک گئی۔

باہر کچھ دوسری گاڑیاں بھی کھڑی تھیں۔ میں شیشے کے دروازے میں سے گذر کر کلب کے ہال میں پہنچ گیا۔ یہاں ادھر ادھر صوفے لگے تھے۔ باوردی ویٹر ہاتھوں میں ٹرے لئے چل پھر رہے تھے۔ دیواروں پر بھی قالین لٹکے ہوئے تھے۔ ایک جگہ زینہ نیچے جاتا تھا۔ میں نیچے تہہ خانے میں آگیا۔ یہ جگہ الف لیلیٰ کا کوئی کمرہ لگتا تھا۔ شیشے کی نلکیوں والے پردے لٹک رہے تھے۔ پرانی وضع کی کرسیاں اور تانبے کی میزیں بجی تھیں۔ عورتیں اور مرد بیٹھے کافی پی رہے تھے اور دھیمی آوازوں میں باتیں کر رہے تھے۔ یہاں روشنی بھی ہلکی تھی۔ میری آنکھیں درمیانے قد کے گندمی رنگت والے ویٹر رابی کو تلاش کر رہی تھیں۔ میں ایک خالی میز کے پاس بیٹھ گیا۔ ایک ویٹر دوسری جانب سے میری طرف آیا۔ میں نے اسے فوراً پہچان لیا۔ یہ یہودی ایجنٹ رابی تھا۔ اس کے ایک کان میں چاندی کا تنکا پڑا تھا۔ اس نے مجھ سے آرڈر لینا چاہا تو میں نے ایک کاغذ پر اسرائیلی انٹیلی

ں کا پہلے والا کوڈ لکھا اور کاغذ اس کے آگے کر دیا۔

کاغذ پر نظر ڈالتے ہی وہ ایک دم چوکس ہو گیا اور کاغذ کو جلدی سے اپنی جیب میں لنے کے بعد میز پر رومال پھیرتے ہوئے عبرانی زبان میں بولا۔ "تمہیں تو کل صبح آنا ۔ میں نے جیب سے سگریٹ نکال کر سلگاتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

"ہمارا خفیہ کوڈ بدل گیا ہے۔ اس لئے مجھے فوراً آنا پڑا۔ نیا کوڈ میرے پاس موجود ۔ لیکن میں تمہیں اور تم مجھے پہلی بار دیکھ رہے ہو۔ میں نے اپنی شناخت کروا دی ہے می اپنی شناخت کرواؤ اور کاغذ پر یہاں اپنا کوڈ نمبر اور نام لکھ دو"۔

اس کے ہاتھ میں آرڈر لینے والی چھوٹی سی کاپی تھی۔ اس نے کاپی پر کچھ لکھا اور پھاڑ کر میرے آگے رکھ دیا۔ کاغذ پر اس کا خفیہ نام رابی اور خفیہ کوڈ نمبر لکھا تھا۔ میں کاغذ اٹھا کر جیب میں رکھ لیا اور کافی کا آرڈر دیا۔ وہ چلا گیا۔ بس مجھے ایک ہی فکر لگی کہ کہیں اس دوران اسکندریہ سے اصلی یہودی ایجنٹ ثبت کا اسے ٹیلی فون نہ آجائے میں کل صبح تمہارے پاس دمشق پہنچ رہا ہوں۔ رابی فوراً میرے لئے کافی لے آیا اور ر کپ وغیرہ رکھتے ہوئے کہنے لگا۔

"دس منٹ میں تم کافی ختم کر کے باہر آجانا۔ کلب کے مین گیٹ سے د قدم کے لے پر تمہیں ایک سیاہ رنگ کی پرانی گاڑی کھڑی ملے گی۔ ڈرائیور نے سرخ پی کیپ ہو گی۔ اس گاڑی میں سوار ہو جانا۔ وہ تمہیں میرے پاس پہنچا دے گی"۔

یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ میں کافی بنانے لگا۔ دس منٹ میں میں نے کافی ختم کی اور وہیں کے پیسے رکھ کر اٹھا اور کریسنٹ کلب کے باہر آگیا۔ میں نے سڑک پر پیچھے کی طرف ا کچھ فاصلے پر ایک کالے رنگ کی فیئٹ گاڑی کھڑی تھی۔ میں اس کی طرف بڑھا۔ یور نے سرخ پی کیپ پہن رکھی تھی۔ میں دروازہ کھول کر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ میرے تے ہی گاڑی سڑک پر چل پڑی۔ کئی بارونق بازار گذر گئے۔ گاڑی شہر سے باہر کھلے تے میں آگئی تھی۔ یہاں اس نے ایک نہر کا پل عبور کیا اور اس کے بائیں جانب اونچے چے درختوں کے ساتھ چھوٹی سڑک پر چلنے لگی۔ کچھ دور مجھے بے آباد جگہ پر ایک کچی

چار دیواری میں کچھ درخت نظر آئے۔ گاڑی اس کچے احاطے میں جا کر رک گئی۔ میں گاڑی سے نکل آیا۔ سامنے ایک پرانا ایک منزلہ مکان تھا جس کے محرابی دروازے پر کوئی پھول دار بیل چڑھی ہوئی تھی۔ جہاں مجھے رابی دکھائی دیا۔ وہ عام شامی عربوں کے لباس میں تھا۔ وہ مجھے راہداری سے گذار کر ایک چھوٹے سے کمرے میں لے آیا۔ جہاں فرش پر قالین بچھا تھا اور ایک پرانا صوفہ بھی پڑا تھا۔ رابی نے دروازہ بند کر دیا۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ ابھی پستول نکال کر میری طرف مڑے گا اور کہے گا۔

میں جانتا ہوں تم ثبت کال نہیں ہو۔ اسکندریہ سے نمبر ٹو نے فون پر بتا دیا ہے کہ ثبت کال صبح آئے گا۔" اور پھر وہ مجھ پر فائر کر دے گا۔ لیکن ایسی کوئی بات نہ ہوئی۔ اس نے مجھے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور ایک الماری کا تالا کھول کر چمڑے کا تھیلا نکال لایا۔ اس میں سے نیلے رنگ کی ایک چھوٹی نوٹ بک نکالی اور میرے پاس بیٹھتے ہوئے بولا۔

"ہیڈ کوارٹر نے نیا کوڈ کونسا دیا ہے؟ مجھے لکھوا دو اور اسکندریہ والی تمہاری دکان کا کیا بنا؟ تم مصری پولیس سے کیسے بچ کر نکل آئے؟"

میں نے کہا۔ "بس قسمت اچھی تھی عین وقت پر نکل آیا۔ یہ کہانی بعد میں سناؤں گا۔ تم کوڈ لکھو"۔

اور میں نے اسے نئے خفیہ کوڈ کے وہ سارے الفاظ لکھا دیئے جو یہودی ایجنٹ نے اسکندریہ والی دکان کی کوٹھڑی میں ثبت کال کو بتائے تھے اور جنہیں میں نے اسی وقت یاد کر لیا تھا بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ انگوٹھی کے اثر کی وجہ سے وہ از خود مجھے یاد ہو گئے تھے۔ کوڈ نوٹ بک میں درج کر لینے کے بعد رابی نے ایک بار اسے غور سے پڑھا۔ پھر چمڑے کے تھیلے میں بند کر کے تھیلے کو الماری کے نچلے خانے میں رکھ کر تالا لگا دیا۔ نوکر ہمارے لئے کافی لے آیا۔ میں نے رابی سے کہا کہ شارون نے جو مصری کراؤن اسرائیل بھجوانے کے لئے دیا تھا وہ تمہارے پاس موجود ہے کیا

رابی بولا۔ "ہاں وہ اسی الماری میں پڑا ہے۔ ابھی اسے تل ابیب پہنچانا مشکل ہے۔ ایک تو چیکنگ زیادہ ہو گئی ہے دوسرے ہمارا پرانا کوڈ اوپن ہو چکا ہے۔"

میں نے کہا۔ "میرے پاس ایک آدمی ہے جو اسے اسرائیل لے جائے گا۔

"رابی نے کہا۔ ٹھیک ہے وہ تم ابھی لے جاؤ"

مگر میں مصری تاج کے سلسلے میں زیادہ بے تابی ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اس سے شامی پہاڑی والے توپوں کی پوسٹوں کے بارے میں باتیں شروع کر دیں۔ ان مورچوں کے بارے میں اسرائیلی انٹیلی جنس کے ناپاک منصوبوں کی میں زیادہ سے زیادہ اور جلد از جلد تفصیل معلوم کرنا چاہتا تھا۔ اتنے میں ساتھ والے کمرے میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ رابی اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ میں پریشان سا ہو گیا۔ کہیں بھانڈا نہ پھوٹ جائے۔ اور رابی کو معلوم نہ ہو جائے کہ میں اصلی یہودی ایجنٹ نہیں ہوں۔ چار پانچ منٹ بعد وہ پردہ ہٹا کر کمرے میں داخل ہوا اور میری طرف غور سے دیکھنے لگا۔ میرے پاؤں تلے سے جیسے زمین کھسک گئی۔ کیا اسے میرے بارے میں پتہ چل گیا ہے؟

===== ❑ ❑ =====

یہودی ایجنٹ رابی میری طرف غور سے دیکھ رہا تھا۔

یقیناً اسے پتہ چل گیا تھا کہ میں دشمن کا بھیجا ہوا آدمی ہوں۔ میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ وہ بولا۔ "تم بڑے صحیح وقت پر آئے ہو۔ ابھی ایجنٹ نمبر سات کا فون آیا ہے۔ وہ ہمارا ماسٹر سپائی ہے۔ وہ تھوڑی دیر بعد دمشق میں کام کرنے والے سارے اسرائیلی ایجنٹوں کو شامی گن پوسٹوں کے سیکرٹ مشن کے بارے میں بڑے اہم احکامات دینے والا تھا۔ اسے نئے کوڈ کا بالکل علم نہیں تھا اگر وہ پرانے کوڈ کو استعمال کرتا تو شامی انٹیلی جنس کو فوراً خبر ہو جاتی اور صبح تک ہم سب کو پھانسی مل چکی ہوتی۔ میں اسے نیا کوڈ فون پر نہیں بتا سکتا۔ تم فوراً اس کے پاس پہنچو اور نیا خفیہ کوڈ اسے بتا دو۔"

میں نے سکون کا سانس لیا کہ کم از کم میرا راز نہیں کھلا تھا۔ میں نے کہا۔

"مگر میں نے نمبر سات کی شکل نہیں دیکھی"۔

اس نے میری طرف مشتبہ انداز میں دیکھا اور بولا۔

"تم کیسے ایجنٹ ہو کہ تمہیں اتنا بھی نہیں معلوم کہ ہم سارے ایک دوسرے کے نمبر جانتے ہیں شکل اتفاقاً دیکھتے ہیں"۔

میں نے فوراً سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "وہ تو مجھے معلوم ہے مگر یہ خفیہ کوڈ کا معاملہ ہے"۔ رابی نے میرے کندھے کو آہستہ سے تھپتھپا کر کہا۔ "تم اسے اپنا خفیہ کوڈ نمبر بتا دینا۔ پھر اس کا کوڈ نمبر پوچھنا۔ وہ تمہیں جنوبی دمشق میں واقع القاسم شاپنگ پلازہ میں ملے گا۔ وہاں اس کا الجمال سٹور ہے۔ وہ کریم شامی کے نام سے مشہور ہے۔ میں نے بھی اسے

صرف ایک ہی مرتبہ دیکھا ہے۔ میں تمہیں اس کا تھوڑا سا حلیہ بتائے دیتا ہوں"۔

رابی نے مجھے کریم شامی کا حلیہ بتایا اور پھر وہاں سے نکل جانے کو کہا۔ مگر میں مصری شہزادی کا تاج بھی ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔ میں نے رابی سے کہا کہ شارون والا تاج مجھے دے دو تاکہ میں اسے اپنے اعتماد والے آدمی کے ہاتھ اسرائیل پہنچا دوں۔ رابی مجھے اپنا ہی آدمی سمجھتا تھا۔ چنانچہ اس نے کوئی اعتراض نہ کیا اور تاج میرے حوالے کر دیا۔ میں نے اسے سنبھال کر اپنے پاس رکھ لیا اور وہاں سے چل دیا۔ القاسم شاپنگ پلازہ تک پہنچنے میں کوئی دقت نہ ہوئی۔ یہ بڑی بارونق اور ماڈرن قسم کی مارکیٹ تھی جہاں ہر قسم کی دکانیں اور سٹور موجود تھے۔ میں الجمال سٹور پر پہنچ گیا۔ رابی نے مجھے یہودی ماسٹر ایجنٹ کا جو حلیہ بتایا تھا اس حلیے کا ایک درمیانی عمر اور درمیانے قد کا بھاری جسم والا آدمی عربی لباس میں ملبوس کاؤنٹر کے پاس آرام کرسی پر بیٹھا بڑے اطمینان کے ساتھ قہوہ پی رہا تھا۔ میں نے اپنا خفیہ کوڈ نمبر پہلے ہی سے کاغذ کے ایک ٹکڑے پر لکھ رکھا تھا۔ قریب پہنچ کر میں نے خاموشی سے کاغذ اس کے سامنے رکھ دیا۔ شیخ شامی نے جلدی سے کاغذ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور میری طرف دیکھا۔ میں نے عربی میں کہا۔

"اس کاغذ کی دوسری طرف اب تمہیں اپنا کوڈ نمبر لکھنا ہے۔ میں تمہارے لئے ایک خاص پیغام لایا ہوں"۔

اسے رابی کا ٹیلی فون پہنچ چکا تھا۔ شیخ شامی نے چاروں طرف دیکھا۔ پھر کاغذ کی دوسری طرف اپنا کوڈ نمبر لکھ کر کاغذ مجھے دے دیا یہی وہ خطرناک یہودی ماسٹر سپائی تھا جو وہاں شیخ شامی کے فرضی نام سے کاروبار چلا رہا تھا اور یہودی ملک کے لئے جاسوسی کرتا تھا۔ وہ مجھے اپنے اپارٹمنٹ میں لے گیا جو سٹور کے اوپر تھا۔ یہاں وہ اکیلا رہتا تھا۔ میں اس خطرناک یہودی جاسوس سے جتنی جلدی ہو سکے شامی گن پوسٹوں کے منصوبے کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ کیونکہ دن ڈھلنے لگا تھا اور شام کی فلائیٹ سے اسکندریہ کے یہودی ایجنٹ کامل کو نیا کوڈ لے کر وہاں پہنچ جانا تھا اور یوں میرا راز طشت ازبام ہونے کا لمحہ قریب سے قریب تر ہوتا جا رہا تھا۔

میں نے اس ایجنٹ نمبر سات کو نیا کوڈ بتایا اور پھر فوراً ہی کہا کہ اسرائیلی ہیڈ کوارٹر کی طرف سے شامی گن پوسٹوں کے منصوبے میں یہاں کی سیاسی صورتحال کے مطابق کچھ ترمیم اور اضافے کئے گئے ہیں۔ مجھے ماسٹر پلان دکھاؤ تاکہ میں ان میں ترمیم و اضافہ کر سکوں۔"

اس یہودی کو میرے اسرائیلی ایجنٹ ہونے میں کوئی شبہ نہیں تھا۔ چنانچہ اس نے کتابوں کے شیلف میں سے دو چار کتابیں باہر نکال کر کسی جگہ کوئی بٹن دبایا۔ شیلف ایک طرف کھسک گیا اس کے پیچھے لوہے کی چھوٹی سی الماری دیوار میں دھنسی ہوئی تھی۔ اس الماری میں سے اس نے شامی گن پوسٹوں کو تباہ کرنے کا خفیہ اسرائیلی منصوبہ نکال لیا جو ایک موٹے نیلے تہہ کئے ہوئے کاغذ کی شکل میں تھا۔ یہ ماسٹر پلان اس نے میرے سامنے کھول کر رکھ دیا اور بولا۔ "اس میں جو ترمیم و اضافے کرنے ہیں مجھے بتا دو"۔

نیلے کاغذ پر گن پوسٹوں کا پورا نقشہ بنا ہوا تھا اور ان جگہوں کی بھی نشاندہی کی گئی تھی۔ جہاں سے یہودی ایجنٹوں نے اپنی تخریبی کارروائیاں شروع کرنی تھیں۔ میں خوش بھی ہوا اور حیران بھی کہ یہودی انٹیلی جنس نے برادر اسلامی ملک شام کے خلاف کس قدر گھناؤنی سازش تیار کر رکھی تھی۔ میں اس نقشے کو کسی حالت میں بھی وہاں چھوڑ کر نہیں جا سکتا تھا۔ میں ابھی اس پر غور ہی کر رہا تھا کہ اس نقشے کو کس طریقے سے قابو میں کروں کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔

شیخ شامی نے رسیور اٹھا کر بڑی خوش اخلاقی سے اپنا نام بتایا۔ اس کے ساتھ ہی اس کا چہرہ سنجیدہ ہو گیا۔ مگر دوسرے لمحے یہ سنجیدگی بھی غائب ہو گئی۔ وہ ہنس ہنس کر کسی سے عربی میں باتیں کرنے لگا۔ اس نے تین چار بار کہا ٹھیک ہے ٹھیک ہے' تم اوپر آجاؤ سب اچھا ہے میں نے خیال کیا کہ یہ بھی کوئی یہودی ایجنٹ ہی ہو گا۔ شیخ شامی نے فون بند کر دیا۔ کہنے لگا "اپنا ہی آدمی ہے" پھر اچانک اس نے اپنے لبادے کے اندر ہاتھ ڈالا اور دوسرے لمحے پستول تان لیا۔

"جہاں بیٹھے ہو وہیں بیٹھے رہو۔ تمہاری حقیقت کھل گئی ہے۔ تم اسکندریہ کے کامل

نہیں ہو اور یہاں سے تم زندہ بچ کر نہیں جاؤ گے۔"

وسرے لمحے دروازہ کھلا اور سامنے اسکندریہ والا گھڑی ساز اسرائیلی ایجنٹ ثبت ہاتھ میں پستول لئے کھڑا تھا۔ میری طرف دیکھتے چیخ کر کہا۔

"اسے تو ہم نے گلا گھونٹ کر مار دیا تھا۔ یہ زندہ کیسے بچ گیا؟"

شیخ کامل شامی بولا۔ "تمہیں اس کی گردن کاٹنی چاہئے تھی"۔

"اب کاٹ دیتے ہیں"۔

یہ کہہ کر ثبت کامل نے اپنے سائی لینسر والے پستول میں سے اوپر تلے دو گولیاں فائر دیں۔ اب مجھے مرجانے کی اداکاری کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ کیونکہ مجھے وہاں شامی گن پوسٹوں کے پلان کو اپنے ساتھ لے جانا تھا۔ دونوں گولیاں میرے جسم میں گزر گئیں مگر مجھے ذرا سی بھی خبر نہ ہوئی۔ نہ درد ہوا نہ خون نکلا اور نہ جسم پر کسی گولیوں کا نشان ہی بنا۔ میں اپنی جگہ پر ویسے ہی بیٹھا رہا۔ دوسرا یہودی ایجنٹ یہ سمجھا شاید ثبت کامل کا نشانہ خطا ہو گیا ہے۔ اب اس نے اپنے سائی لینسر والے پستول سے ر دھڑا دھڑ چار گولیاں چلا دیں۔ یہ گولیاں بھی میری گردن اور سینے سے نکل گئیں اور ر کوئی اثر نہ ہوا۔ اب تو دونوں گھبرا سے گئے پہلا ایجنٹ چلایا۔ "اس نے بلٹ پروف ٹ پہن رکھی ہے"

اس کے ساتھ ہی وہ مجھے دبوچ کر ہلاک کرنے کی نیت سے میری طرف بڑھے۔ یہ کرشمہ اخناتون کی بیٹی کی دی ہوئی انگوٹھی کا تھا کہ مجھ پر چلائی گئی گولیاں بے اثر رہی ں۔ اس انگوٹھی کی وجہ سے میری طاقت میں بھی کئی گنا اضافہ ہو گیا تھا۔ چنانچہ جب نے ان دونوں کو گردن سے پکڑ کر پیچھے کو دھکیلا تو وہ یوں دیوار سے ٹکرائے جیسے کسی انہیں پوری طاقت سے دیوار کے ساتھ پٹخ دیا ہو۔ وہ منہ کے بل فرش پر بے ہوش ے تھے۔ میں ان اسلام دشمن ایجنٹوں کو زندہ نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ سب سے پہلے میں قشے کو اپنے قبضے میں کیا اور پھر ان دونوں تخریب کاروں کو ختم کر دیا۔

مصری تاج پہلے ہی سے میرے پاس تھا۔ اب نہایت اہم دستاویز وہ نقشہ بھی میرے پاس تھا جسے مجھے حکومت شام کے حوالے کرنا تھا۔ شاپنگ پلازا سے باہر آکر میں نے ٹیکسی پکڑی اور قریبی پولیس سٹیشن کا رخ کیا۔



پولیس سٹیشن پہنچ کر جب میں نے انسپکٹر پولیس سے شامی انٹیلی جنس کے ڈائریکٹر ملنے کی خواہش کا اظہار کیا تو انسپکٹر پولیس نے پہلے تو مجھے سر سے پاؤں تک غور سے ا۔ پھر نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "تمہیں ان سے کیا کام ہے؟"

میں نے کہا۔ "یہ کام میں صرف انہیں ہی بتانا چاہتا ہوں۔"

انسپکٹر نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔ "آپ گورنمنٹ سیکرٹریٹ چلے جائیں۔ میں کی بس یہی مدد کر سکتا ہوں۔"

وہ معذرت کرنے میں حق بجانب تھا۔ ڈائریکٹر انٹیلی جنس کا عہدہ بڑا حساس عہدہ ہے۔ میں وہاں سے نکل کر پبلک کال آفس میں آگیا۔ وہاں ڈائریکٹری سے ڈائریکٹر جنس کا فون نمبر نوٹ کیا اور اس کے آفس میں فون کر دیا۔ سیکرٹری نے جواب دیا کہ ٹنگ میں ہیں۔ پتہ نہیں کب فارغ ہوں گے۔ یہ مجھے ٹالنے کے لئے تھا۔ تب میں ھا سیکرٹریٹ پہنچ گیا۔ یہاں بھی مجھے ڈائریکٹر انٹیلی جنس کو ملنے سے روک دیا گیا۔ مجھ بار بار یہی پوچھا جاتا کہ میں مسٹر جواد فہمی سے کیوں ملنا چاہتا ہوں۔ اس زمانے کے انٹیلی جنس کے سربراہ کا یہی نام تھا۔ میری مشکل یہ تھی کہ میں سوائے مسٹر جواد فہمی دوسرے کسی شخص کو کچھ نہیں بتا سکتا تھا۔ مصری کراؤن میری کوٹ کی ایک جیب تھا اور دوسری جیب میں شامی توپوں کے مورچوں کا وہ نقشہ تھا۔ جسے یہودی تخریب نے بنایا تھا اور جس میں ان جگہوں کی بھی نشان دہی کر دی گئی تھی جہاں جہاں ب کاروں نے بڑے طاقتور بم لگا رکھے تھے۔ ان بموں کو ایک خاص وقت پر بیک

وقت پھٹ کر ان مورچوں کو تباہ کر دیتا تھا۔

میرا شامی خفیہ ایجنسی کے سربراہ سے ملنا بہت ضروری تھا اور وہ لوگ سیکورٹی پیش نظر مجھے اندر نہیں گھسنے دے رہے تھے۔ آخر ایک ترکیب میرے ذہن میں آئی نے سیکورٹی آفیسر سے کہا۔

"میں جواد فہمی کا بڑا قریبی رشتے دار ہوں اور مجھے ان کو ایک بڑا ضروری گھریلو پ دینا ہے۔ میری ان سے فون پر ہی بات کرا دیجئے"۔

سیکورٹی آفیسر نے جواد فہمی کے آفس کا نمبر گھمایا۔ اس کا سیکرٹری ہی بولا۔ سیکو آفیسر نے اسے میری بات بتا کر کہا۔

"چیف سے اس کی دو سیکنڈ کے واسطے بات کرا دو۔ کوئی بڑا اہم گھریلو معاملہ ہے۔"

دوسرے لمحے سیکورٹی چیف نے ریسیور میرے طرف بڑھا دیا اور کہا۔ "چیف ا بولیں گے تم خود ہی جلدی سے انہیں پیغام دے دو"۔

میں نے ریسیور کان سے لگایا ہی تھا کہ دوسری طرف سے کسی مرد کی بھاری آ سنائی دی۔

"کون ہو تم؟ کیا پیغام لے کر آئے ہو؟" میں نے فوراً کہا۔

"سر! میں دمشق کی پہاڑی والی گن پوسٹوں کے سلسلے میں ایک بڑی اہم دستاویز لایا ہو ملک کی سیکورٹی کا معاملہ ہے۔"

دوسری طرف ایک پل کے لئے خاموشی چھا گئی۔ پھر چیف کی آواز آئی۔ "ا سیکورٹی آفیسر کو دو"۔

میں نے جلدی سے ریسیور سیکورٹی آفیسر کے حوالے کر دیا۔ اس نے بڑے اد سے پوچھا۔ "کیا حکم ہے سر؟" ----- جی ----- ٹھیک ہے سر! -----"

ریسیور رکھتے ہوئے سیکورٹی آفیسر اپنی سیٹ سے اٹھ کھڑا ہوا اور میری طرف دیکھ بولا۔

"میرے ساتھ آؤ"۔

وہ مجھے نہ جانے کن کن راہداریوں اور آفس بلاکوں سے گذرتا ہوا ایک پرانی سی عمارت میں لے آیا جس کے بند گیٹ پر دو فوجی رائفلیں لئے کھڑے پہرہ دے رہے تھے۔ ایک فوجی آفیسر بند دروازے کی دوسری جانب بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ ہمیں آتا دیکھ کر اس نے گیٹ کھولنے کا اشارہ کیا۔ وہاں میری تلاشی لی گئی۔ میری ایک جیب سے مصری تاج اور دوسری جیب سے دستاویز نکلی۔ میں نے کہا۔

"یہ دونوں چیزیں مجھے چیف کو پیش کرنی ہیں۔"

دونوں چیزیں میرے پاس ہی رہنے دی گئیں۔ پھر مجھے ایک بڑے کمرے میں داخل کر دیا گیا جس کی دیوار پر شامی صدر کی قد آدم تصویر لگی تھی۔ تصویر کے آگے بہت بڑی میز لگائے ایک لحیم و شحیم آدمی انگریزی سوٹ پہنے بیٹھا فائل میں کچھ لکھ رہا تھا۔ میں کرسی کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ یہ شامی انٹیلی جنس کا چیف جواد فہمی تھا۔ اس نے فائل بند کر کے ایک طرف رکھی اور میری طرف دیکھا۔ بجائے اس کے کہ وہ مجھ سے شامی توپوں کی پوزیشنوں کے بارے میں کچھ پوچھتا وہ مجھے حیرت کے عالم میں تکتا ہی چلا جا رہا تھا۔ جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ پھر وہ کرسی سے اٹھ کر میرے قریب آیا۔ ہاتھ سے میری ٹھوڑی کو اوپر اٹھا کر میرے چہرے کو غور سے دیکھا اور تعجب سے بولا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا تھا کہ وہ میرے ساتھ کیا ڈراما کر رہا ہے۔ آخر میں نے پوچھ ہی لیا کہ بات کیا ہے جناب؟ آپ مجھے اس طرح گھور گھور کر کیوں دیکھ رہے ہیں؟"

وہ تیزی سے اپنی کرسی کی طرف مڑا۔ دراز میں سے ایک فائل نکال کر اسے کھولا اور اس میں سے ایک تصویر اٹھا کر میرے سامنے رکھ دی۔

"اسے دیکھو۔ کیا یہ تمہاری تصویر نہیں ہے؟"

تصویر بلیک اینڈ وائٹ تھی پہلی نظر دیکھنے سے مجھے اپنی تصویر لگی۔ مگر اس کے نیچے

دایان ابراہام لکھا ہوا تھا۔ لیکن میری شکل کے ساتھ غضب کی مشابہت تھی۔ یہ نوجوان سیاہ جرسی پہنے تھا اور کرسی پر ٹانگ پر ٹانگ رکھے بیٹھا تھا۔ میری اور اس کی شکل میں اگر کوئی فرق تھا تو صرف مونچھوں کا تھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی مونچھیں تھیں جب کہ میری مونچھیں نہیں تھیں۔ چیف جواد نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور انٹر کام پر کسی کو کافی لانے کے لئے کہا۔ پھر میری طرف متوجہ ہو کر کہنے لگا۔

"پہلے تم اپنا تعارف کراؤ اور یہ بتاؤ کہ تم ہماری پہاڑی والی گن پوزیشنوں کے بارے میں کیا بات کرنے آئے ہو؟"

میں نے اسے شروع سے آخر تک اپنی کہانی سنا ڈالی اور پھر جیب سے اسرائیلی ایجنٹوں سے حاصل کیا ہوا نقشہ اس کے سامنے رکھ دیا۔ نقشے کو دیکھتے ہی اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ میں نے اسے ان یہودی ایجنٹوں کے ٹھکانے بھی بتا دیئے جو شام میں رہ کر تخریب کاری کر رہے تھے۔ چیف جواد نے فوراً فون پر کسی متعلقہ شخص کو میرے بتائے ہوئے ٹھکانوں کا پتہ بتا کر حکم دیا کہ ان جگہوں پر فوراً چھاپے مار کر دشمنوں کے ایجنٹوں کو گرفتار کیا جائے۔ ساتھ ہی اس نے ڈیفنس کے محکمے کے کسی افسر کو سکریٹ لائن پر بتا دیا کہ دشمن نے پہاڑی والی گن پوزیشنوں پر کہاں کہاں ڈائنا مائیٹ لگا رکھا ہے۔ اتنے میں کافی آگئی۔ چیف نے رسیور رکھا اور میرے لئے کافی بناتے ہوئے بولا۔

"تم نے یہ اطلاعات بروقت پہنچا کر ہمیں ایک بہت بڑی تباہی سے بچا لیا ہے"۔

میں نے کہا۔ "ایک برادر اسلامی ملک کو دشمن کی تخریب کاریوں سے بچانا میں اپنا فرض سمجھتا ہوں"۔

چیف نے میرے ہم شکل کی تصویر کو میرے آگے کھسکاتے ہوئے کہا۔

"تم نے خود دیکھ لیا ہو گا کہ اس شخص کی شکل تم سے کس قدر حیرت انگیز طور پر ملتی ہے"۔

"مگر یہ کون ہے یہ میں نہیں ہوں"۔

اس پر چیف نے تصویر اپنی طرف کر لی اور بولا۔

"یہ ایک بڑا ہی خطرناک اسرائیلی جاسوس دایان ابراہام ہے جس کو ہم نے آج صبح ہی گرفتار کیا تھا مگر اس سے پہلے کہ ہم پوچھ گچھ کرتے اس نے اپنے منہ میں چھپا کر رکھا ہوا زہریلا کیپسول نگل کر خودکشی کر لی۔ اس کی لاش اس وقت بھی سرد خانے میں پڑی ہے۔ یہ ہماری بڑی خوش قسمتی ہے کہ ہم نے ابھی تک اس خطرناک اسرائیلی ایجنٹ کی گرفتاری کا سرکاری طور پر اعلان نہیں کیا تھا۔ ورنہ اب جو منصوبہ میں نے تیار کیا ہے وہ دھرے کا دھرا رہ جاتا۔ ابھی تک اسرائیلی حکومت کو یہی معلوم ہے کہ ان کا ایجنٹ دایان ابراہام زندہ ہے۔"

میں نے اپنے اس ہم شکل میں کوئی دلچسپی نہ لی اور جب کافی کی پیالی خالی کر کے اجازت لینے لگا تو چیف جواد کرسی چھوڑ کر میرے پاس آگیا۔ میرے سامنے والی کرسی آگے کر کے اس پر بیٹھ گیا اور میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر بولا۔

"تم نے برادر اسلامی ملک کے لئے جو کام کیا ہے ہم اس کے لئے تمہارے بے حد مشکور ہیں مگر ہم پر تمہیں ایک اور احسان کرنا ہو گا"۔

"وہ کیا؟" میں نے پوچھا۔ چیف جواد نے دھیمے رازدارانہ انداز میں کہا۔

"تمہیں دایان ابراہام کے روپ میں اسرائیل جانا ہو گا"۔

میں نے چونک کر چیف جواد کی طرف دیکھا۔ وہ بولا۔ "یہ ایک برادر اسلامی ملک کی سالمیت اور بقا کا مسئلہ ہے"

میں چپ ہو گیا۔ وہ بڑا خوش ہوا۔ اس نے مجھے کرسی سے اٹھا کر اپنے گلے لگا لیا اور کہنے لگا۔ "میرے ساتھ آؤ میں تمہیں تمہارے ہم شکل کی لاش دکھاتا ہوں"۔



شامی ڈائریکٹر انٹیلی جنس جواد فہمی مجھے پولیس سٹیشن کے ایک خاص کمرے میں لے گیا۔ جو بے حد ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ یہاں سٹریچر پر سفید چادر سے ڈھکی ہوئی اسرائیلی ایجنٹ دایان کی لاش پڑی تھی۔ فہمی نے لاش کے منہ پر سے چادر ہٹائی تو سب سے پہلے مجھے جو حیرت انگیز احساس ہوا وہ یہ تھا کہ میں مرچکا ہوں اور یہ میری اپنی لاش ہے۔ فرق بس اتنا ہی تھا جو میں پہلے بیان کرچکا ہوں کہ لاش کی مونچھیں تھیں جب کہ میری مونچھیں نہیں تھیں۔ باقی تمام مماثلت حیرت میں ڈالنے والی تھی۔ ناک نقشہ ہو بہو میرے جیسا تھا۔ فہمی نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اب تم خود اندازہ لگا سکتے ہو کہ تم ایک برادر اسلامی ملک کی سالمیت کے واسطے کتنا اہم کردار ادا کرسکتے ہو"۔

اس نے لاش کا منہ چادر سے ڈھانپ دیا۔ ہم ایک دوسرے کمرے میں آگئے جہاں فہمی نے مجھے اسرائیلی ایجنٹ کی آواز کی ٹیپ سنائی۔ اس کی اور میری آواز میں تھوڑا فرق ضرور تھا۔ اس کی آواز ذرا بھاری تھی۔ فہمی بولا۔

"اس کا علاج ہمارے پاس ہے۔ ہم تمہاری آواز میں بھاری پن پیدا کردیں گے۔ مگر سب سے پہلے تمہیں اپنی خوشنودی اور مرضی کا اعلان کرنا ہو گا کہ تم اس مشن کے لئے تیار ہو۔ کیونکہ یہ بہرحال ایک خطرناک مشن ہو گا۔ ابھی ہمیں تمہیں اسرائیلی زبان بھی سکھانی ہو گی"۔

میں نے کہا۔ "اس زبان پر مجھے پورا عبور حاصل ہے۔"

اس پر جواد فہمی خوشی سے اچھل پڑا۔ اس نے مجھے گلے لگالیا اور کہنے لگا۔

"اس سے زیادہ ہماری خوش قسمتی اور کیا ہو سکتی ہے بس اب ہماری اور ایک ن ملک کے جائز مفادات کی خاطر ہاں کہہ دو"۔

میں نے کہا۔ "جب معاملہ ایک مسلمان ملک کا درپیش ہو تو میں کیسے انکار کر سکتا "۔

یہ سنتے ہی شامی انٹیلی جنس کے ڈائریکٹر نے میرا ماتھا چوم لیا اور مرحبا مرحبا کہنے لگا۔ ں کے کمرہ خاص میں آگئے۔ پہلی بات اس نے مجھے یہ کہی کہ آج کے بعد میں اپنی یں بڑھانا شروع کردوں تاکہ اسے اسرائیلی ایجنٹ کی مونچھوں کے مطابق بنایا جائے۔ ں نے ایجنٹ دایان کی پوری فائل کھول کر میرے سامنے رکھ دی۔ اس فائل میں خص کا پورا شناخت نامہ یعنی بائیو ڈیٹا درج تھا۔ وہ کہاں پیدا ہوا۔ کہاں کہاں اس نے حاصل کی۔ کہاں کہاں ملازمت کی۔ پھر کس طرح اسرائیلی سیکرٹ سروس میں آیا۔ ی منگیتر کا کیا نام ہے۔ اس کی منگنی ہوئے کتنی دیر ہو چکی ہے۔ پھر اس کی ایک وڈیو ی مجھے دکھائی گئی مجھے اس کے چلنے پھرنے' بات چیت کرنے اور اٹھنے بیٹھنے کے انداز ہی کرنا تھا۔ فہمی کہنے لگا۔

"یہ سارا ریکارڈ ہم نے اس لئے جمع کر لیا تھا کہ یہ اسرائیل کا ماسٹر سپائی تھا۔ ہمیں بھی وقت اس کی ضرورت پڑ سکتی تھی۔ لیکن اس عیار نے کمال پھرتی کا مظاہرہ تے ہوئے خودکشی کرلی اور ہمیں علم نہ ہو سکا کہ ایک خفیہ زہریلا کیپسول اس نے اپنی اڑھ کے نیچے چھپا کر رکھا ہوا ہے۔ بہرحال اب صورتحال کچھ یوں ہے کہ تمہیں خاص مقام پر لے جایا جائے گا جہاں کم از کم ایک ماہ تک تم اس اسرائیلی ایجنٹ دایان یڈیو فلم دیکھ کر اس کی نقل و حرکت کو کاپی کرنے کی مشق کرو گے۔ وہیں تمہاری ل میں یہ خبر چھپوا دیں گے کہ اسرائیل کا ایک خطرناک جاسوس ہماری قید سے فرار میں کامیاب ہو گیا ہے۔ اس کے بعد تمہارا اصل مشن شروع ہو گا۔ کیا تم اس ے خطرناک منصوبے کے واسطے اپنے آپ کو تیار پاتے ہو؟"

میں اب اسے انکار کیسے کرتا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک برادر مسلمان ملک کی سالمیت کا مسئلہ تھا اور میں اس منصوبے پر دل وجان سے عمل کرنے اور اپنی زندگی تک خطرے میں ڈالنے کو تیار ہو چکا تھا۔ میرے جواب میں فہمی بڑا خوش ہوا۔ مگر مجھے سب سے پہلے ایک کام کرنا تھا۔ اخناتون کی بیٹی کی امانت یعنی اس کا تاج میرے پاس تھا اور وہ مجھے ہر حالت میں اس تک پہنچانا تھا۔ میں نے شامی انٹیلی جنس کے ڈائریکٹر فہمی سے کہا کہ مجھے صرف دو دن کی چھٹی دی جائے۔ میرے پاس کسی کی امانت ہے میں مصر جا کر اس تک پہنچانا چاہتا ہوں۔ اس نے کہا۔

"ضرور جاؤ۔ لیکن کوشش کرنا کہ دو روز میں واپس آجانا۔ اتنی دیر میں ہم دایان کے فرار ہو جانے کی خبر اخباروں میں شائع کرا دیں گے"۔

اور ایسا ہی ہوا۔ جس روز میں تاج لے کر قاہرہ پہنچا اس روز شام کے اخباروں میں یہ خبر چھپ گئی کہ ایک اسرائیلی جاسوس دایان ابراہام دمشق کی جیل سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا ہے اور شامی پولیس اس کی تلاش کے لئے سرتوڑ کوشش کر رہی ہے۔ سورج غروب ہو چکا تھا جب میں سونے کے جڑاؤ تاج کو لفافے میں ڈالے اہرام میں داخل ہوا۔ اس اہرام کو کھلا چھوڑ دیا گیا تھا۔ کیونکہ اس میں سے تمام قیمتی نوادرات نکال لئے گئے تھے۔ میں اہرام کی بھول بھلیوں میں سے گزرتا تہہ خانے میں اتر کر اسی دالان میں پہنچ گیا جہاں اخناتون کی بیٹی کا تابوت موجود تھا۔ مگر اس کی حنوط شدہ لاش وہاں سے اٹھا دی گئی تھی۔ میں نے ٹارچ روشن کر رکھی تھی۔ ابھی میں سوچ ہی رہا کہ کیا کروں کہ دالان کے کونے میں نیلی روشنی سی ہوئی اور دوسرے لمحے اخناتون کی بیٹی ستون کے پیچھے سے نکل کر میرے سامنے آگئی۔ اس نے شہزادیوں ایسا شاہانہ لباس پہن رکھا تھا اور پورے جاہ و جلال میں تھی۔ میں نے اس کی امانت اس کا قیمتی تاج اس کی طرف بڑھایا تو وہ خوش ہو کر بولی۔

"تم نے مجھ پر بڑا احسان کیا ہے"۔

میں نے جواب میں کہا۔ "یہ میرا فرض تھا جسے میں نے پورا کیا۔ اور اب یہ انگوٹھی

بھی میں تمہیں واپس کرنا چاہتا ہوں کیونکہ یہ بھی تمہاری امانت ہے"

اس پر مصری شہزادی مسکرائی کہنے لگی۔

"اب تو تمہیں اس کی زیادہ ضرورت پڑے گی۔ کیونکہ تم اسرائیل میں جس مشن پر جا رہے ہو وہاں قدم قدم پر تمہیں موت کا سامنا ہو گا"۔

اس بات پر مجھے زیادہ حیرت نہ ہوئی کہ مصری شہزادی کو میرے مشن کا پورا علم ہو چکا تھا۔ وہ ایک روح تھی اور روح کو ساری باتوں کا پتہ چل جاتا ہے کہنے لگی۔

"اسے تم اپنے پاس ہی رکھو۔ تم یہ بات بھول گئے تھے کہ یہ انگوٹھی واپس کر دینے کے بعد تم نہ عربی اتنی روانی سے بول سکتے نہ عبرانی-----"

تب مجھے احساس ہوا کہ اس انگوٹھی کا میرے پاس رہنا کس قدر ضروری تھا۔ مصری شہزادی سے رخصت لے کر میں واپس دمشق کی طرف روانہ ہو گیا۔

===== ☐ ☐ =====

جس وقت میں دمشق پہنچا تو اخبارات میں خطرناک اسرائیلی ماسٹر سپائی دایان ابراہام کے جیل سے فرار ہونے کی فرضی نمایاں سرخیوں کے ساتھ شائع ہو چکی تھی۔ یہ میرے بطور اسرائیلی ایجنٹ دایان ابراہام کے' اسرائیل کے ملک میں داخل ہونے کی پیش بندی تھی۔ میرا راستہ ہموار کر دیا گیا تھا میں شامی انٹیلی جنس کے ڈائریکٹر جواد فہمی سے ملا تو اس نے اخبارات کھول کر میرے سامنے رکھ دیئے۔ سگار سلگاتے ہوئے بولا۔

"تمام اخبارات نے تمہارے فرار کی خبر کو بڑا نمایاں کر کے چھاپا ہے"۔

میں نے کہا۔

"میری شکل اسرائیلی ایجنٹ دایان سے اتنی ملتی ہے کہ اب اگر میں باہر نکلا تو خود تمہاری پولیس مجھے گرفتار کر لے گی۔ بلکہ ہو سکتا ہے مجھے خطرناک دشمن کے طور پر گولی بھی مار دی جائے"۔

فہمی مسکرایا۔ "ایسی بات نہیں ہے۔ ویسے بھی اب ہم تمہیں لوگوں کے سامنے نہیں جانے دیں گے۔ کیونکہ یہاں بھی اسرائیل کے خفیہ ایجنٹ اپنی سرگرمیوں میں مصروف ہیں۔ اگر تمہیں کسی نے دیکھ لیا تو ہمارا سارا منصوبہ فلاپ ہو سکتا ہے۔ آج سے تمہیں تمہاری خفیہ کمین گاہ میں رکھا جائے گا۔ جہاں اپنے آئندہ مشن کے واسطے پوری طرح تیار کیا جائے گا"۔

یہ خفیہ کمین گاہ شہر سے باہر پہاڑیوں کے درمیان ایک چھوٹا سا دو کمروں والا مکان تھا جس کے نیچے ایک تہہ خانہ بھی تھا۔ اس تہہ خانے میں الیکٹرانکس کا وہ تمام ساز و سامان موجود تھا جس کی ضرورت تھی۔ جواد فہمی اور اس کے دو نائب افسر وہاں میرے ساتھ

۔ یہاں مجھے اس یہودی ماسٹر سپائی یعنی دایان ابراہام کی ویڈیو فلم دن میں چار مرتبہ ائی جاتی جس کا بھیس بدل کر مجھے اسرائیل میں داخل ہونا تھا۔ اس فلم کی مدد سے میں یان کے اٹھنے بیٹھنے' چلنے پھرنے' بولنے' مسکرانے' سنجیدہ رہنے اور ہاتھوں کی حرکات کو کرنے کی مشق کرتا۔ اسی جگہ میرا گلے کا ایک چھوٹا سا آپریشن کیا گیا جس کے بعد ی آواز قدرے بھاری ہو گئی۔ اب میں بولتا تو میری اور یہودی۔ جاسوس دایان کی واز میں بہت ہی کم فرق محسوس ہوتا۔ مجھے تل ابیب سیکرٹ سروس کے تمام یہودی روں کی تصویریں دکھائی گئیں اور ان کے بارے میں ضروری معلومات فراہم کی گئیں کے ساتھ مجھے رابطہ پڑنے والا تھا۔ حسن اتفاق سے دایان ابراہام کے ماں باپ مر چکے ۔ اس کی صرف ایک بڑی بہن تھی جو کسی دوسرے شہر کے اکیلے مکان میں بیوگی کے گذار رہی تھی۔ جس لڑکی سے دایان جاسوس کی منگنی ہو چکی تھی اس کا نام نادیا تھا اور ل ابیب کے ایک سکول میں استانی تھی۔ مجھے نادیا کی تصویر دکھائی گئی اور اس لڑکی کے ے میں جو ضروری باتیں شامی انٹیلی جنس کو معلوم ہو سکی تھیں مجھے بتا دی گئیں۔ ئیل سیکرٹ سروس کا ایک خفیہ کوڈ تھا جسے شامی انٹیلی جنس والوں نے کسی نہ کسی حاصل کر لیا ہوا تھا۔ مجھے اس خفیہ کوڈ سے بھی آگاہ کیا گیا۔

غرض کہ اس دور افتادہ پہاڑی کمین گاہ میں مجھے ایک مہینہ رکھا گیا اور بڑی سخت ل دی گئی۔ ٹریننگ یہی تھی کہ میں زیادہ سے زیادہ کامیابی اور مہارت کے ساتھ اس ی جاسوس دایان کی حرکات و سکنات کی نقل اتار سکوں جس کی لاش جدید ترین کیمیکلز ریعے ختم کر دی گئی تھی اور اس کی جگہ مجھے دایان ابراہام کے روپ میں تیار کیا جا رہا ھے یہ ساری ہمت شکن ٹریننگ اس لئے دی جا رہی تھی کہ میں بطور یہودی ماسٹر دایان کے اپنا نقلی کردار بالکل اصلی طریقے سے ادا کر سکوں۔ کیونکہ میری ذرا سی طی' معمولی سی بھول چوک بھی فائرنگ سکواڈ کے سامنے کھڑا کر سکتی تھی اور دشمن ہوں سے پھر مجھے کوئی نہیں بچا سکتا تھا۔

اس دوران میری مونچھیں بھی بڑھ آئی تھیں اور انہیں تراش کر مردہ دایان کی

مونچھوں کی طرز کا بنا دیا گیا تھا۔ ایک مہینے کی کڑی مشقوں سے گذرنے کے بعد ایک دن شامی انٹیلی جنس کے کچھ افسر وہاں آئے۔ ان میں جواد فہمی بھی تھا۔ ان لوگوں کے سامنے مجھے بطور یہودی سپائی دایان اپنی کامیاب اداکاری کا مظاہرہ کرنا پڑا۔ سب سے پہلے سکرین میر دایان کی دومنٹ کی فلم دکھائی گئی جس میں اسے جیل کی کوٹھڑی کے اندر ٹہلتے اور اٹھتے بیٹھتے اور پھر ایک شامی افسر سے گفتگو کرتے' اسکے سوالوں کے جواب دیتے دکھایا گیا تھا۔ اس کے بعد میں نے ان افسروں کے سامنے دایان کی پوری اداکاری کا مظاہرہ کیا۔ مجھ سے ویسے ہی انداز میں جواد فہمی نے عبرانی زبان میں پوچھ گچھ کی۔ میں امتحان میں پاس ہو گیا۔ سب نے میری اداکاری اور کامیابی سے دایان کا بہروپ بھرنے کی تعریف کی اور مجھے مبارکباد دی۔

اب میں ایک مفرور اسرائیلی جاسوس کی حیثیت سے یہودیوں کے ملک اسرائیل میں داخل ہونے کے لئے بالکل تیار تھا۔ اب میرے خطرناک مشن کا اصل مرحلہ شروع ہوا یعنی مجھے اس مشن کی بریفنگ کی گئی جس پر میں اپنی جان کی بازی لگا کر صرف دین اسلام اور اپنے برادر اسلامی ملک کی خاطر روانہ ہونے والا تھا۔ مجھے دشمن کا وہ خفیہ کوڈ معلوم کرنا تھا جس کے معلوم ہو جانے کے بعد ان تمام اسرائیلی نیوکلر وار ہیڈ والے میزائیلوں کو تباہ کیا جا سکتا تھا جو دشمن نے قاہرہ دمشق اور بغداد گرانے کے لئے فکس کر رکھے تھے۔ یہ انتہائی خفیہ کوڈ تھا اور اسے کوڈ نمبر 2 کا نام دیا گیا تھا۔ یہ خفیہ کوڈ انتہائی اونچی سطح کے صرف چھ سات اسرائیلی افسروں کو ہی معلوم تھا۔ اسے کمپیوٹر میں فیڈ کر دیا گیا تھا اور اس کی مدد سے صرف ایک سرخ بٹن دبا کر اسلامی ملکوں کے بڑے بڑے شہروں پر دشمن نیوکلر میزائل گرا کر وہاں قیامت کی تباہی مچا سکتا تھا۔ جواد فہمی کہنے لگا۔

"انتہائی کوشش کے باوجود ہم یہ کوڈ نمبر 2 کا ابتدائی سراغ بھی نہیں لگا سکے۔ دایان کی موت اور پھر تمہارے اس کے ہم شکل ہونے کی وجہ سے ہمیں پہلی بار یہ کوڈ معلوم کرنے کا سنہری موقع ملا ہے۔ اگر یہ کوڈ ہم تک پہنچ گیا تو ہمارے اسلامی ملک یہودیوں کی لائی ہوئی بھیانک تباہی سے محفوظ ہو جائیں گے۔ کیونکہ پھر ہم ان تمام میزائیلوں کو ان کے

ٹھکانوں پر ہی بھسم کر سکیں گے"۔

میں نے کہا۔ "انشاء اللہ ایسا ہی ہو گا۔ میں اپنے مسلمان بھائیوں کی خاطر اپنی جان بھی قربان کر دوں گا۔"

فہمی نے فوراً کہا۔

"میں نہیں چاہتا کہ جان قربان کرنے کی نوبت آئے۔ تمہیں انتہائی ہوش مندی کے ساتھ زندہ رہ کر اپنے مشن کو مکمل کرنا اور ہمارے پاس زندہ سلامت واپس آنا ہے۔"

میں نے کہا۔ "ہم حق پر ہیں خدا ہماری مدد کرے گا"۔

سٹیج تیار تھا۔ پردہ اٹھ گیا تھا اور وہ خطرناک ڈراما شروع ہونے والا تھا جس میں مجھے ایک ہم شکل یہودی جاسوس کا اہم ترین فرضی کردار ادا کرنا تھا۔ میرے اس فرضی کردار کی ناکامی نہ صرف میری اذیت ناک موت' بلکہ تین برادر اسلامی ملکوں کے ناقابل تلافی نقصان پر ختم ہو سکتی تھی۔ اب وہ تاریخی رات آ گئی جس کی تاریکی میں مجھے دشمن کی سرحد کے اندر داخل کیا جانا تھا۔ مجھے وہی کپڑے پہنا دیئے گئے جو یہودی ایجنٹ اور ماسٹر سپائی دایان نے گرفتاری کے وقت پہن رکھے تھے۔ وہ خط بھی میری جیب میں تھا جو دایان کی منگیتر نادیا نے ایک ماہ پہلے اسے لکھا تھا جو گرفتاری کے وقت دایان کی جیب سے برآمد ہوا تھا۔ رات کے اندھیرے میں چھوٹے چھوٹے صحرائی ٹیلوں کے عقب میں ایک جگہ جیپ آ کر رک گئی۔



میرے ساتھ شامی ڈائریکٹر انٹیلی جنس جواد فہمی تھا جو خود جیپ چلا کر مجھے ان صحرائی ٹیلوں تک لایا تھا۔ آسمان ستاروں سے بھرا ہوا تھا۔ ہمارے چاروں طرف اندھیرا تھا۔ ستاروں کی دھندلی دھندلی روشنی میں ٹیلوں کی چوٹیوں کے خاکے سے نظر آ رہے تھے۔ گہری خاموشی چھائی تھی۔ مجھے کسی قسم کا اسلحہ نہیں دیا گیا تھا میری شیو بڑھی ہوئی تھی۔ ہم جیپ سے اتر آئے۔ ایک ٹیلے کی آڑ میں کھڑے ہو کر جواد فہمی نے دور ٹمٹمانے والی دو تین روشنیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"یہ اسرائیلی سرحد کی روشنیاں ہیں۔ آگے تمہیں سب کچھ اکیلے ہی کرنا ہو گا۔ ہم تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتے۔ لیکن ہم ہر لمحے تمہاری کامیابی اور تمہاری زندگی کے لئے دعا کرتے رہیں گے۔ تمہیں جو کچھ کرنا ہے تم اچھی طرح جان گئے ہو۔ خدا حافظ اللہ تمہارا نگہبان ہو"۔

اتنا کہہ کر جواد فہمی نے میرے کندھے کو آہستہ سے تھپتھپایا اور تیزی سے مڑ کر جیپ میں بیٹھا اور اسے اسٹارٹ کر کے واپس چل دیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اور مجھے ایک گہری اور پراسرار خاموشی نے گھیر لیا۔ یہ بھی اللہ کی شان اور اس کی رحمت تھی کہ میرے دل سے ہر قسم کا خوف دور ہو چکا تھا۔ میں نے اپنی اصلی شخصیت کو یکسر بھلا دیا تھا اور اپنے آپ کو دایان ابراہام یعنی یہودی ماسٹر سپائی ہی سمجھنے لگا تھا جو شامی جیل سے فرار ہو کر اب اپنے وطن اسرائیل میں داخل ہونے والا تھا۔

میں نے ایک نظر دور ٹمٹماتی روشنیوں پر ڈالی۔ اپنی کامیابی کے واسطے اللہ سے دعا مانگی اور بسم اللہ پڑھ کر ٹیلوں کی اوٹ سے نکل کر اسرائیل کی سرحد کی طرف چل پڑا۔ میرے پاؤں کے نیچے کہیں سخت زمین آجاتی اور کہیں ریت میں پاؤں دھنسنے لگتے۔ صحرائی ٹیلے پیچھے رہ گئے تھے۔ میں اب اس علاقے میں آگیا تھا جو شامی اور اسرائیلی سرحد کے درمیان واقع تھا اور جسے نو مینز لینڈ کہا جاتا ہے۔ گویا خطرناک علاقہ شروع ہو گیا تھا۔ چونکہ اس علاقے کی سیاسی فضا بے حد کشیدہ تھی اس لئے خدشہ تھا کہ کسی طرف سے بھی کوئی گولی مجھ پر فائر ہو سکتی ہے۔ دشمن ملک کی سرحد کی روشنیاں اب قریب آ گئی تھیں۔ میں نے وہ روشنی بھی دیکھی جو سرحدی باڑھ کی ایک اونچی مچان کی سرچ لائٹ سے نکل کر دائرے کی شکل میں گھومتی ہوئی ایک طرف سے دوسری طرف کو جا رہی تھی۔ دور سے کسی جیپ کی آواز بھی آئی۔ یقیناً یہ اسرائیلی سرحدی سکیورٹی فورس کی جیپ تھی جو رات کے وقت بارڈر کا گشت لگا رہی تھی۔ رات بڑی تاریک تھی۔ اندھیرے کی وجہ سے ابھی میں دور سے کسی کو دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ جونہی میں روشنی کے دائرے کے قریب آیا فوراً زمین پر لیٹ گیا اور تیزی سے بارڈر لائن کی طرف رینگنے لگا۔ میری کوشش تھی کہ میں روشنی کے دائرے میں آجاؤں تاکہ مجھے مچان سے دیکھ لیا جائے۔ میں بارڈر کے بالکل قریب آگیا تھا اور مجھے خاردار باڑ صاف نظر آ رہی تھی۔ سرچ لائٹ کی روشنی بائیں جانب سے آتی ہوئی جب مجھ پر پڑی تو میں نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا لئے اور عبرانی زبان میں چلا کر کہا۔

"فائر مت کرنا۔ فائر مت کرنا"۔

مچان پر کھڑے یہودی گارڈز نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ انہوں نے مشین گن کا ایک برسٹ فائر کیا۔ گولیاں تڑ تڑ کرتیں میرے سامنے آکر ریت میں دھنس گئیں۔ میں نے ایک بار پھر زور زور سے ہاتھ ہلاتے ہوئے چیخ کر کہا۔

"فائرنگ مت کرو۔ میں دوست ہوں۔ فائرنگ مت کرو"۔

اس کے ساتھ ہی خاردار تاروں والی دیوار کی جانب سے چار پانچ یہودی فوجی

رائفلیں تانے بھاگتے ہوئے نکلے اور انہوں نے مجھے گھیرے میں لے لیا۔ ایک نے رائفل میری گردن کے ساتھ لگا دی۔ دوسرے نے مجھے پوری طاقت سے ٹھڈا مار کر عربی میں کہا۔

"فلسطینی دہشت گرد"۔

میں نے اپنی اداکاری اور یہودی جاسوس دایان کا کردار ادا کرنے کی ابتدا کرتے ہوئے بڑے غصے سے عبرانی زبان میں کہا۔

"تم احمق ہو گدھے ہو' اپنے اور دشمن کے آدمی میں کوئی تمیز نہیں کر سکتے۔ چلو مجھے اپنے بارڈر سیکورٹی چیف کے پاس لے چلو۔ میرا نام دایان ابراہام ہے کیا تم احمقوں نے شامی جیل سے میرے فرار کی خبر نہیں پڑھی؟"

وہ کچھ گومگو میں پڑ گئے۔ ان میں سے کسی نے اخبار میں کوئی خبر وغیرہ نہیں پڑھی تھی۔ لیکن میرے لہجے میں جو بھرپور اعتماد اور تحکمانہ انداز تھا اس سے وہ کسی حد تک ضرور متاثر ہوئے تھے۔ میری گردن پر لگی ہوئی رائفل کی نالی پیچھے ہٹ گئی۔ انہوں نے اسی وقت میرے دونوں ہاتھ پیچھے کر کے رسی سے باندھ دیئے اور مجھے کھینچتے ہوئے خاردار دیوار کے پاس لے آئے جہاں ایک راستہ اندر جاتا تھا۔ مچان کے اوپر سے کسی یہودی گارڈ نے عبرانی زبان میں پکار کر کہا۔

"یہ فلسطینی دہشت گرد ہے اسے شوٹ کیوں نہیں کرتے؟"

فوجیوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ مجھے گھسیٹتے ہوئے لکڑی کے بنے ہوئے ایک چھوٹے سے کھوکے کے پاس لے آئے جس کے باہر ایک فوجی جیپ کھڑی تھی۔ اندر سے فوراً ایک باوردی فوجی باہر نکل آیا۔ اس نے چلا کر پوچھا۔

"کہاں سے پکڑا ہے اس فلسطینی کو؟ اسے زندہ میرے پاس کیوں لائے ہو۔ اس کے دوسرے ساتھی کہاں ہیں؟"

وہ عبرانی زبان میں گالیاں بکتا میرے پاس آیا اور آتے ہی میرے گال پر اتنی زور سے تھپڑ مارا کہ میری آنکھوں کے آگے تارے ناچنے لگے۔ مگر میں نے انتہائی تحمل سے کام

۔ اور پر اعتماد سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"تم نے جو حرکت کی ہے اس کا نتیجہ تمہیں بھگتنا پڑے گا۔ دن نکلنے سے پہلے پہلے ماری وردی اتر چکی ہو گی۔ تم اپنے عہدے سے ڈس مس ہو چکے ہو گے؟

فوراً ہی ایک فوجی نے کہا۔

"سر! یہ شخص کہتا ہے کہ میرا نام دایان ابراہام ہے اور میں شامی جیل توڑ کر بھاگا ا"۔

لیکن یہ سن کر بھی اس یہودی سیکورٹی آفیسر کے رویے میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ اس مجھے گردن سے پکڑ کر پیچھے کو دھکیلا اور غضبناک ہو کر کہا۔

"مجھ پر تمہاری اس اداکاری کا کوئی اثر نہیں ہو گا۔ میں نے تم ایسے کئی فلسطینی دس اپنے ہاتھ سے شوٹ کئے ہیں جو اسرائیلی بن کر ہمارے ملک میں داخل ہونے کی شش کر رہے تھے"۔

حقیقت یہ تھی کہ اس یہودی سیکورٹی افسر کو یہ علم نہیں تھا کہ میں ان کے ایک ے بڑے جاسوس کا ہم شکل ہوں۔ اس نے دایان ابراہام کا نہ تو نام ہی سنا تھا اور نہ اسے ی دیکھا تھا۔ چنانچہ وہ مجھ پر اعتبار نہ کرنے کے سلسلے میں حق بجانب تھا۔ میں نے انتہائی بردگی کے ساتھ اسے کہا۔

"جب تمہیں معلوم ہو گا کہ میں کون ہوں تو یقیناً تمہارے ہاتھوں کے طوطے اڑ ئیں گے پھر تمہیں اپنے سلوک پر افسوس ہو گا لیکن پھر میں تمہاری کوئی مدد نہ کر سکوں گا تم صرف اتنا کرو کہ حیفہ کے سیکرٹ سروس چیف سے فون پر یا وائرلیس پر میری بات رادو۔ ہو سکتا ہے پھر میں تمہیں معاف کر دوں"۔

میرے لہجے میں اس قدر اعتماد تھا اور اداکاری اتنی کامیاب تھی کہ اس پر کچھ اثر ہو ا۔ پھر بھی اس نے مجھے وہیں کھڑے رہنے دیا۔ میرے ہاتھ بھی نہ کھلوائے۔ صرف اتنا ے کیسے جانتے ہو؟"

مجھے اسرائیل سیکرٹ سروس کا خفیہ ٹاپ کوڈ بتا دیا گیا تھا یہ چار ہندسوں کی شکل میں

تھا۔ میں نے اسے یہ چاروں ہندسے بتائے اور کہا۔

"سیکرٹ چیف کو فون پر یا وائرلیس پر یہ ہندسے بتا دو۔ یہ نیشنل سیکیورٹی کا مسئلہ ہے"۔

وہ یہودی فوجی افسر میری طرف کھا جانے والی نظروں سے دیکھتا ہوا لکڑی کے کھوکھے کے اندر چلا گیا۔ اندر سے اس کی آواز آئی وہ کسی کے ساتھ فون پر بات کر رہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ کھوکے سے باہر نکلا تو گھبرایا ہوا تھا۔ تیز تیز قدم اٹھاتا میرے پاس آیا آتے ہی اس نے سب سے پہلے میرے ہاتھ خود کھولے اور پھر انتہائی معذرت کے انداز میں بولا۔

"میں معافی مانگتا ہوں سر۔ لیکن سر! آپ تو ہم سے زیادہ جانتے ہیں کہ ہمیں یہاں دشمن کے حربوں سے کتنا ہوشیار رہنا پڑتا ہے۔ میں مجبور تھا سر!

میں نے بڑی شان بے نیازی سے اس پر ایک نگاہ ڈالی اور اپنی جیکٹ کے کالر کو اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔

"مجھے اس وقت کافی کی ایک گرم پیالی کی ضرورت ہے"۔

"سر اندر تشریف لے آئیں"۔

===== ❑ ❑ =====

وہ مجھے لکڑی کے کھوکھے کے اندر لے گیا۔

اندر ایک میز کرسی لگی تھی۔ ایک فون پڑا تھا بجلی کا ایک بلب روشن تھا۔ اس نے مجھے کرسی پیش کی اور کافی کا حکم دے دیا پھر بڑی عاجزی اور ادب سے بولا۔

"سر! حیفہ سے سکیورٹی چیف ابھی آپ سے بات کریں گے۔ میں نے حیفہ پولیس انٹیلی جنس چیف کو فون پر آپ کا کوڈ نمبر بتا دیا تھا۔"

وہ ایک بار پھر اپنے سخت رویے کی معافی مانگنے لگا۔ اس نے فوری طور پر حیفہ پولیس انٹیلی جنس سے رابطہ قائم کر کے میرے کوڈ کے ہندسے اسے بتائے تو وہ چونک پڑا تھا۔ کیونکہ یہ ہندسے دشمن ملک کے انتہائی اونچی سطح کی سیکرٹ سروس کی نشان دہی کرتے تھے۔ اس نے اسی وقت مجھے عزت کے ساتھ بٹھانے کا حکم دیا اور خود حیفہ سیکریٹ سروس کے چیف سے رابطہ قائم کر کے مجھ سے بات کرانے کی کوشش میں لگ گیا تھا۔ ابھی میں نے دشمن کی گرم کافی کا ایک گھونٹ ہی لیا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ یہودی فوجی افسر نے جلدی سے رسیور اٹھا کر لیس سر کہا۔ دوسری طرف سے حیفہ کا سیکریٹ سروس کا چیف بول رہا تھا۔ مجھے اس کا نام اور حلیہ دمشق میں ہی بتا دیا گیا تھا۔ یہودی افسر نے جلدی سے فون میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے رسیور کان سے لگاتے ہی عبرانی زبان میں کہا۔

"میں دایان ابراہام بول رہا ہوں"۔

دوسری طرف سے ایک بھاری مردانہ آواز سنائی دی۔

"اپنا کوڈ نمبر بتاؤ"۔

میں نے وہی خفیہ کوڈ کے ہندسے دہرائے اور کہا۔

"شامی جیل سے میرا فرار تقریباً ناممکن تھا۔ مگر قسمت نے میرا ساتھ دیا۔ میں بڑی اہم خفیہ معلومات لے کر آرہا ہوں"۔

دوسری طرف سے آواز آئی۔

"میں نے شالمہ کی سرحدی پوسٹ کو ہدایت کر دی ہے وہاں سے ایک ہیلی کاپٹر تمہیں لینے پہنچ جائے گا۔ بہتر ہو گا کہ تم اسی وقت میرے پاس چلے آؤ۔ میں اپنے گھر پر ہی ہوں اور تمہارا انتظار کر رہا ہوں"۔

"ٹھیک ہے سر!"

یہ کہہ کر میں نے فون بند کیا اور یہودی فوجی افسر سے کہا۔ "مجھے لینے ہیلی کاپٹر آرہا ہے۔ میں نے تمہیں معاف کر دیا ہے"۔

وہ تو میرے آگے بچھ گیا۔ اس نے میرے لئے کافی کی دوسری پیالی بنائی۔ مجھے سگار پیش کیا۔ میرا ذہن اس وقت صرف ایک ہی بات سوچ رہا تھا کہ حیفہ سیکرٹ سروس کے چیف کو مجھے دیکھ کر کوئی شک تو نہیں پڑے گا؟ لیکن میری شکل یہ حقیقت ہے کہ یہودی جاسوس دایان سے اس قدر ملتی تھی کہ خود میں اس کی لاش کا چہرہ اور تصویر دیکھ کر سناٹے میں آگیا تھا کہ کیا دنیا میں ایک شکل کے دو آدمی بھی ہو سکتے ہیں؟ پندرہ بیس منٹ گذرے ہوں گے کہ رات کی خاموشی میں ہیلی کاپٹر کی آواز سنائی دی۔ وہ قریب ہی ایک جگہ اترا دو سرحدی پولیس کے نوجوان باوردی یہودی تیز تیز قدموں سے چلتے کھوکھے میں داخل ہوئے۔ انہوں نے میرا نام پوچھا۔ پھر مجھے سلیوٹ کیا اور پھر اپنے ساتھ لے کر ہیلی کاپٹر کی طرف چل پڑے۔ یہ کافی بڑا ہیلی کاپٹر تھا اور اس کی دونوں جانب مشین گنیں لگی ہوئی تھیں۔ یہ کوئی فوجی ہیلی کاپٹر لگتا تھا۔ جو پولیس کی تحویل میں تھا۔

ہیلی کاپٹر گڑگڑاتا ہوا فضا میں بلند ہوا رات کے پچھلے پہر کے دھندلکے میں ایک جانب روانہ ہو گیا۔ وہاں سے حیفہ کا شہر کافی دور تھا۔ لیکن ہیلی کاپٹر کی رفتار بھی کافی تیز تھی۔

چونکہ مجھے منزل مقصود تک فوری طور پر پہنچانے کے خفیہ آرڈر دیئے گئے تھے اس لئے ہیلی کاپٹر کی سپیڈ معمول سے زیادہ ہی کر دی گئی۔ کوئی پون گھنٹے بعد دور سے حیفہ شہر کی روشنیاں نظر آنے لگیں۔ اب صبح کا اجالا بھی آسمان پر پھیلنے لگا تھا۔ ہیلی کاپٹر شہر کی بائیں جانب سے ہوتا ہوا پہاڑ کے دامن میں ایک کافی بڑی جدید قسم کی کوٹھی کے احاطے میں اتر گیا۔ برآمدے میں ایک آدمی سلیپنگ گاؤن پہنے پہلے سے کھڑا تھا۔ یہ حیفہ سیکرٹ سروس کا چیف ڈیوڈ ہی ہو سکتا تھا۔ جب وہ میری طرف بڑھا تو میں نے اسے پہچان لیا۔ اس کی تصویر مجھے دمشق میں ہی دکھا دی گئی تھی۔ اس نے ایک گہری نگاہ مجھ پر ڈالی جیسے یہ دیکھنے کی کوشش کر رہا ہو کہ میں دایان ابراہام ہی ہوں یا اس کے بھیس میں کوئی دشمن کا ایجنٹ ہوں۔ لیکن دایان میرا اس قدر حیران کن حد تک ہم شکل تھا کہ ڈیوڈ کو ذرا سا بھی شک نہ ہوا۔ اس نے مجھے گلے لگا لیا اور بولا۔

"ہم نے تمہارے فرار کی خبر سن لی تھی۔ ہمیں یقین تھا کہ تم بہت جلد ہمارے پاس آجاؤ گے۔ چلو اندر چلتے ہیں"۔

کوٹھی کا ڈرائینگ روم بڑی نفاست سے سجا ہوا تھا۔ دیوار پر اس زمانے کے اسرائیلی وزیراعظم کی تصویر لگی تھی۔ کارنس پر اسرائیلی پرچم کے قریب ہی ڈیوڈ کی فل وردی میں تصویر فریم میں لگی رکھی تھی۔ کھڑکیوں پر پڑے باریک ریشمی پردوں میں سے دن کی روشنی اندر آرہی تھی۔ صبح ہو چکی تھی۔ ڈیوڈ نے اسی وقت ملازم کو میرے لئے ناشتہ لانے کو کہا اور پھر میرے سامنے صوفے پر بیٹھ کر فون گود میں رکھا اور کسی کا نمبر ملا کر عبرانی زبان میں بولا۔

"سر! دایان پہنچ گیا ہے۔ جی ہاں سر! وہ بالکل ٹھیک ہے۔ آپ بات کر لیجئے۔"

وہ میری طرف فون بڑھاتے ہوئے آہستہ سے بولا۔

"ڈیفنس سیکرٹری تم سے بات کریں گے"

اب یہ حقیقت مجھ پر کھل چکی تھی کہ دایان ابراہام واقعی کوئی بڑی زبردست چیز ہے ورنہ ایک جاسوس کی اتنی زیادہ اہمیت نہیں ہوتی کہ ملک کا سیکرٹری ڈیفنس صبح بستر سے

اٹھ کر اس سے بات کرنے کے لئے تیار ہو جائے۔ اس اسرائیلی سیکرٹری ڈیفنس کے بارے میں مجھے کسی قسم کی بریفنگ نہیں کی گئی تھی۔ ظاہر ہے اس کی ضرورت بھی نہیں تھی کیونکہ آخر مجھے کس کس کے بارے میں بتایا جاتا۔ چند ایک ضروری اور ان لوگوں کے بارے میں مجھے بریف کر دیا گیا تھا جن کی معلومات شامی انٹیلی جنس کو میسر تھیں۔ باقی لوگوں سے مجھے خود حالات کے مطابق نمٹنا تھا۔

میں نے رسیور کان کے ساتھ لگا کر عبرانی طرز کے مطابق صبح بخیر کہا۔ دوسری طرف سے ایک مردانہ آواز نے جواب میں مجھے سب سے پہلے مبارک باد دی اور پھر کہا۔

"تم وہاں سے جو معلومات بھی اڑا کر لائے ہو وہ ہماری ریاست کے واسطے یقیناً بڑی مفید ہوں گی۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ میں اپنے آفس میں ٹھیک وقت پر تمہارا بے تابی سے انتظار کروں گا۔ باقی باتیں ملاقات پر ہوں گی"۔

اس نے ٹیلی فون بند کر دیا۔ اب مجھے یہ فکر لاحق ہو گئی کہ میں اسے کیا بتاؤں کہ میں کیا معلومات اڑا کر لایا ہوں؟ بہرحال میں نے یہی فیصلہ کیا کہ بعض شامی ڈیفنس مورچوں کے بارے میں جھوٹ موٹ رپورٹ پیش کر دوں گا۔ بلکہ اسرائیلی انٹیلی جنس کو جتنا گمراہ کر سکا گمراہ کر دوں گا۔

خفیہ سیکرٹ چیف کے ہاں میں نے شیو بنا کر منہ ہاتھ دھویا۔ مزے سے ناشتہ کیا اور صوفے پر نیم دراز ہو گیا۔ سیکرٹری ڈیفنس کے آفس پورے نو بجے پہنچنا تھا۔ کیونکہ وہی اس کے دفتر آنے کا وقت تھا۔ میں جب اس کے آفس کے بڑے آہنی گیٹ پر پہنچا تو مجھ سے شناختی کارڈ طلب کیا گیا۔ میں نے اپنا نام بتایا تو پھر کسی نے کہیں بھی نہ روکا۔ ان سب کو میرے بارے میں پہلے سے بتا دیا گیا تھا۔ چند لمحوں کے بعد میں اسرائیلی سیکرٹری ڈیفنس کے عالی شان کمرے میں اس کے سامنے موجود تھا۔ وہ مجھے بڑی تیز نظروں سے گھورنے لگا۔ ایک لمحے کے لئے مجھے ایسے لگا جیسے میرا راز کھل گیا ہے۔



لیکن ایسی کوئی بات نہیں تھی۔

وہ مسکراتا ہوا اپنی کرسی سے اٹھ کر میری طرف بڑھا۔ بڑی گرمجوشی سے میرے ساتھ مصافحہ کیا اور مجھ سے میرے فرار کی کہانی سننے لگا جب میں نے اسے اپنے فرار کی زضی کہانی سنا دی تو وہ بولا۔

"جب یہ اطلاع ملی کہ تمہیں شامی پولیس نے پکڑ لیا ہے اور تم سے پوچھ گچھ کی جا رہی ہے تو ہمیں یقین ہو گیا تھا کہ اب تمہارا بچنا محال ہے۔ لیکن جب دمشق ریڈیو پر خبر نی اور ہمارے دوسرے ایجنٹوں نے بھی اطلاع کر دی کہ تم دشمن کی قید سے فرار ہونے یں کامیاب ہو گئے ہو تو ہمیں اطمینان ہوا۔ اب مجھے یہ بتاؤ کہ نمبر6 کے بارے میں تم کیا کیا اہم ترین معلومات لائے ہو"؟

میری جانے بلا کہ نمبر۶ کیا چیز تھی۔ مگر میں مطلق نہ گھبرایا۔ اتنا اندازہ میں نے لگا لیا کہ اگر اسرائیلی نمبر۲ نیوکلیائی میزائلوں کا کوڈ ہے تو نمبر۶ کا تعلق بھی شام کے کسی نیوکلر پروگرام ہی سے ہو گا۔ میں نے بڑے تجربے کار جاسوس کی طرح دروازے کی طرف گھور کو دیکھا اور سیکرٹری سے پوچھا۔

"کیا آپ کو یقین ہے کہ اس وقت ہماری گفتگو کوئی تیسرا آدمی نہیں سن رہا؟"

سیکرٹری ڈیفنس نے میری طرف تعجب سے دیکھا اور کہا۔

"پہلے تو تم نے کبھی اس قسم کے شک شبے کا اظہار نہیں کیا۔ تم تو جانتے ہو کہ میرے آفس کے دروازے کے آگے سے کسی کو گذرنے تک کی اجازت نہیں ہے"۔

مجھ سے ایک بھول ہو گئی تھی مگر میں اس سے نمٹنے کے لئے پوری طرح تیار تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس قسم کی بھول چوک آگے چل کر بھی مجھ سے کہیں نہ کہیں ہونے والی تھی۔ کیونکہ آخر میں اصلی دایان ابراہام نہیں تھا۔ اس کا ہم شکل تھا۔ اور یہ سارا ماحول، سب لوگ میرے لئے اجنبی تھے۔ میں نے جلدی سے کہا۔

"سر! میں جو معلومات آپ کو بتانے والا ہوں اس کا تعلق بڑے حساس ادارے سے ہے۔ اس لئے میں ضرورت سے زیادہ محتاط ہوں"۔

اسرائیلی سیکرٹری ڈیفنس نے مجھے سگار نکال کر پیش کیا میں نے لے لیا اور اسے سلگا رہا تھا کہ وہ بولا۔

"دایان! کیا بات ہے۔ اس بار دمشق میں رہ کر تم سگار پینے لگے ہو؟ تم ہمیشہ سگریٹ پیا کرتے تھے۔"

میں نے تھوڑا سا کھانس کر کہا۔

"سر! میرے گلے میں کچھ خرابی پیدا ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر کو دکھایا تو اس نے کہا کہ یہ ساری خرابی سگریٹ کے کاغذ کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔ اس نے میرے گلے کا ہلکا سا آپریشن بھی کیا۔ اور کہا کہ اگر تمباکو پینا ہی ہے تو سگار پی لیا کرو"۔

"اوہ آئی سی" سیکرٹری نے بھنوئیں تھوڑی سی اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔ "جب ہی تمہاری آواز بھی کچھ کچھ بدلی ہوئی ہے خیر ٹھیک ہے۔ مجھے نمبر ۶ کے بارے میں اپنی معلومات سے آگاہ کرو۔"

میں نے شامی نیوکلیائی ڈیفنس کے بارے میں بڑی نمک مرچ لگا کر دو چار جھوٹی معلومات اسے بتا دیں جس کا اصلیت کے ساتھ دور کا بھی تعلق نہیں تھا۔ اور تعلق ہو بھی نہیں سکتا تھا اس واسطے کہ مجھے خود شامی نیوکلیائی ڈیفنس کے بارے میں ذرہ برابر بھی معلومات نہیں تھیں۔ مگر چونکہ میں اسرائیلی انٹیلی جنس سروس کا کوئی بہت بڑا اور قابل اعتبار جاسوس تھا اور ابھی تک کسی نے مجھ پر شک بھی نہیں کیا تھا اس لئے اس یہودی سیکرٹری نے بھی میری ایک ایک بات کو بڑے غور سے سنا اور ایک کاپی پر بعض پوائنٹ

نوٹ بھی کرتا رہا۔ جب میں اپنی جھوٹی معلومات والی باتیں ختم کر چکا تو اس نے ٹیلی فون کا نمبر گھماتے ہوئے کہا۔

"دایان! تم اتنی اہم معلومات لے کر آئے ہو کہ ہم دشمن کی ساری ڈیفنس پندرہ منٹ میں تہس نہس کر سکتے ہیں"۔

میں دل میں ہنس رہا تھا کیونکہ میں نے اسے جن فرضی شامی زیر زمین نیوکلیائی میزائلوں کے اڈوں کے بارے میں بتایا تھا اس جگہ سوائے سنگلاخ پہاڑیوں کے اور کچھ بھی نہیں تھا۔ اوپر سے میں نے بڑی اہمیت محسوس کرتے ہوئے کہا۔

"یقیناً سر! ہمیں ایسا ہی کرنا ہو گا اس سے پہلے کہ شامی وہاں سے اپنے زیر زمین لگے ہوئے میزائل اٹھا کر لے جائیں ہمیں انہیں تباہ کر دینا ہو گا"۔

"فکر نہ کرو تم دایان!" وہ بولا "ہم انہیں کل تک کی بھی مہلت نہیں دیں گے"

اس نے ٹیلی فون پر کسی بڑے اہم عہدے دار سے ان میزائلوں کے بارے میں بات کی اور کہا کہ میں دوپہر کے وقت تمہارے پاس آ رہا ہوں۔ ہمیں آج ہی پرائم منسٹر سے بات کر کے منظوری لینی ہو گی۔ میں سمجھ گیا کہ میری جھوٹی معلومات پر اسرائیلی بڑا زبردست قسم کا جارحانہ پروگرام طے کر رہے ہیں۔ میں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ مجھے صبح ہونے سے پہلے پہلے پیچھے شامی سیکرٹ سروس کو خفیہ کوڈ کے ذریعے وائرلیس پر پیغام پہنچانا ہو گا کہ صحرائی علاقے میں جو جگہیں میں نے یہودیوں کو بطور شامی نیوکلر ڈیفنس مورچوں کے بتائی ہیں وہاں وہاں گڑھے کھود کر کچھ لوہے کا کاٹھ کباڑ اور بارود کے بکس رکھ دیئے جائیں تاکہ جب اسرائیلی طیارے وہاں بمباری کریں تو بارود کے دھماکے بھی ہوں اور وہاں سے بعد میں ٹوٹا مڑا لوہے کا سامان بھی بکھرا ہوا پایا جائے۔ کیونکہ بمباری کے بعد یقینی طور پر اسرائیلی ایجنٹوں نے وہاں پہنچنا تھا اور نیوکلر پوسٹوں کی تباہی کے اثرات کی اطلاعات بھی پہنچنی تھیں۔ میں نے کرسی چھوڑتے ہوئے کہا کہ میں ساری رات کا جاگا ہوا ہوں اب گھر جا کر سو جانا چاہتا ہوں۔ وہ بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

"ضرور ضرور۔ تمہیں آج پورا دن سونا ہو گا میں شام کو خود تمہارے ہاں آؤں گا۔

پھر کلب چلیں گے۔ وہاں سیکرٹری انٹیلی جنس سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔ میں نے اسے تمہاری اطلاع کر دی ہے۔ اور اس دوران اس سے مل کر اچانک اٹیک کا پروگرام بھی طے کر لوں گا۔ پرائم منسٹر کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔ میرا ڈرائیور تمہیں تمہارے گھر تک چھوڑ آئے گا"۔

اصلی اسرائیلی جاسوس دایان کی جیب سے اس کی منگیتر کا جو پرانا خط برآمد ہوا تھا اس پر اس کے حیفہ والے گھر کا مکمل ایڈریس لکھا ہوا تھا جو مجھے ازبر کرا دیا گیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ سیکرٹری ڈیفنس کے ڈرائیور کو بھی دایان کے گھر کا پتہ معلوم ہو گا۔ پھر بھی گاڑی میں سوار ہونے کے بعد میں نے عبرانی زبان میں ڈرائیور سے پوچھا کہ اسے میرے گھر کا پتہ معلوم ہے ناں ----- اس نے مجھے دایان کے سیکٹر اور مکان کا نمبر بتا دیا۔ یہ وہی تھا جو دایان کی منگیتر کے خط میں لکھا ہوا تھا۔ گاڑی دایان ابراہام کے مکان کی طرف روانہ ہو گئی۔ اتنا مجھے بھی یقین تھا کہ دایان ایک اونچی سطح کا جاسوس تھا۔ چنانچہ اس کے مکان میں جاسوسی کے آلات اور خاص طور پر کوئی نہ کوئی وائرلیس سیٹ ضرور ہو گا۔ اسی وائرلیس سیٹ پر مجھے پیچھے دمشق میں ضروری پیغام پہنچانا تھا جس کا تعلق صحرا کے نیوکلر میزائلوں والے فرضی ٹھکانوں سے تھا۔



میرا اندازہ بالکل درست نکلا۔ اس یہودی جاسوس کے مکان کے تہہ خانے میں خفیہ پیغام رسانی کا جدید ترین وائرلیس سیٹ موجود تھا۔ مجھے الماری کے ایک دراز میں سے خفیہ کوڈ کی کاپی بھی مل گئی۔ مگر مجھے اس کوڈ کی ضرورت نہیں تھی۔ کیونکہ مجھے اپنے خفیہ کوڈ میں دمشق کو پیغام پہنچانا تھا۔ میں نے دایان کی الماری کی ساری فائلیں دیکھ ڈالیں مگر مجھے وہ فائل نہ ملی جس کی مجھے تلاش تھی اور جسے حاصل کرنے کے لئے مجھے دشمن کے علاقے میں بھیجا گیا تھا۔ یہ ٹیز سیکرٹ فائل نمبر۲ تھی۔ اس میں ان اسرائیلی میزائلوں کے ہارڈروں کی تفصیل درج تھی جو انہوں نے مسلم عرب ممالک خاص طور پر شام پر گرانے کے لئے نصب کر رکھے تھے۔

مجھے سب سے پہلا کام یہ کرنا تھا کہ پیچھے دمشق کی خفیہ ایجنسی کو خبردار کر دوں کہ وہ صحرا میں ان جگہوں پر زمین کے اندر کچھ گولہ بارود اور لوہے کا سکریپ وغیرہ دبا دیں جن کے بارے میں میں نے اسرائیلی سیکرٹری ڈیفنس کو بتایا کہ وہاں نیوکلیائی میزائل لگے ہوئے ہیں۔ چنانچہ میں نے الماری میں سے دایان کا وائرلیس سیٹ نکال کر سامنے رکھ لیا۔ اسے آن کر کے دمشق کی فریکو-نسی ملائی اور خفیہ کوڈ نمبر کو تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد دہرانے لگا۔ فوراً ہی دوسری طرف سے مجھے جواب مل گیا۔ میں نے دمشق کو اچھی طرح سے ساری بریفنگ کر دی۔ میں نے وائرلیس سیٹ بند کر کے اسی طرح الماری میں رکھ دیا۔ اب میں مطمئن تھا کہ اسرائیلی حکومت مجھ پر شک نہیں کر سکے گی۔ دوسرے دن اسرائیلی طیاروں نے عین اسی جگہ صحرائی ٹھکانوں پر سینکڑوں بم گرائے جو میں نے بتائی

تھی۔ وہاں شامی حکومت کی ہدایت پر گولہ بارود اور لوہے کے ٹوٹے پھوٹے ٹکڑے چھپا دیئے گئے تھے۔ بم گرنے کے بعد زمین میں دبایا ہوا بارود دھماکوں سے پھٹنے لگا اور لوہے کے بیکار ٹکڑے ادھر ادھر بکھرنے لگے۔ اسرائیلی پائیلٹ بمباری کے بعد جو فضائی تصویریں اپنے ساتھ لائے انہیں دیکھ کر سیکرٹری ڈیفنس اور اسرائیلی وزیر دفاع کے چہرے خوشی سے کھل اٹھے۔ وہ یہی سمجھ رہے تھے کہ یہ سکریپ شامی میزائلوں کے ٹکڑے ہیں۔ اور انہوں نے شامی میزائلوں کے ٹھکانوں کو تباہ کر دیا ہے۔ حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ اس واقعے کے بعد میری حیثیت مزید بڑھ گئی اور میرے عہدے میں بھی ترقی کر دی گئی۔

اب مجھے سیکریٹ فائل نمبر ۲ کی تلاش تھی۔ میرے لئے اسرائیلی محکمہ ڈیفنس کے سیکریٹ ڈیپارٹمنٹ میں جانا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ یہ میں نے معلوم کر لیا تھا کہ جو میزائل اسرائیل نے مسلم عرب شہروں کو تباہ کرنے کے واسطے لگائے ہوئے ہیں ان کو چلانے والے نظام خفیہ کوڈ کی یہ مطلوبہ فائل ملٹری کے سکریٹ ڈیپارٹمنٹ کے تہہ خانے میں ہے جہاں چوبیس گھنٹے ڈیوٹی پر گارڈ موجود ہوتا ہے یعنی ہر چھ گھنٹے بعد ایک گارڈ چلا جاتا ہے اور اس کی جگہ دوسرا گارڈ آجاتا ہے۔ میں نے سیکرٹری ڈیفنس سے بھی کہا کہ میں کچھ سیکریٹ فائلیں چیک کرنا چاہتا ہوں۔ یہ میں پہلے بھی بیان کر چکا ہوں کہ جس اسرائیلی ایجنٹ کا میں نے روپ بھرا ہوا تھا بلکہ جس کا میں ہم شکل تھا' وہ ان کی سکریٹ سروس کا ٹاپ کا ایجنٹ تھا چنانچہ مجھے فوراً اجازت مل گئی۔ میرا آئی ڈی کارڈ اور خفیہ کمپیوٹر کارڈ بنا دیا گیا تھا۔

چنانچہ میں بڑی آسانی سے سنٹرل انٹیلی جنس ڈیپارٹمنٹ کے تہہ خانے میں پہنچ گیا۔ یہ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جو چاروں طرف سے بند تھا۔ اس میں نہ کوئی کھڑکی تھی نہ کوئی روشندان تھا۔ دیواروں کے ساتھ لوہے کی الماریاں لگی تھیں۔ یہ مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ جس الماری میں خفیہ میزائلوں کے نظام کی فائل نمبر ۲ ہے اس کا رنگ نیلا ہے۔ یہاں صرف ایک یہودی گارڈ پہرہ دے رہا تھا۔ نیلے رنگ کی الماری بائیں جانب والی دیوار کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ گارڈ نے مجھے سیلوٹ کیا۔ وہ میری شکل اور مرتبے سے واقف تھا۔

ہرے پاس وہ کمپیوٹر کارڈ موجود تھا جس کو پنچ کرنے سے الماری کھل جاتی تھی۔ میں نے رڈ کو الماری کے باہر لگے چھوٹے سے والٹ میں ڈال کر دبایا تو الماری کے تالے کے ھلنے کی ہلکی سی آواز سنائی دی۔ میں نے الماری کھول دی۔ اس کے اندر اوپر سے نیچے ب تین خانے تھے جن میں کچھ ویڈیو اور آڈیو ٹیپیں اور فائلیں بھری ہوئی تھیں۔ میں وہیں کھڑے کھڑے اپنی مطلوبہ فائل کی تلاش شروع کر دی۔ تھوڑی ہی دیر میں مجھے فائل مل گئی۔ اس کے باہر سیاہ عبرانی الفاظ میں فائل نمبر ۲ لکھا ہوا تھا۔ میں نے وہ اکیلی ل نکالنی مناسب نہ سمجھی۔ اس کے ساتھ دو چار مزید فائلیں نکال کر میز پر رکھ دیں اور ؤل پر بیٹھ کر ان کا مطالعہ کرنے لگا۔ اس وقت میری جیب میں ایک مائیکرو فلم والا بے حساس اور چھوٹا سا کیمرہ بھی تھا جو سگریٹ لائٹر میں لگا ہوا تھا۔ گارڈ مجھ سے دو تین م کے فاصلے پر پتھر کے بت کی طرح پہرے پر کھڑا تھا۔ کبھی کبھی وہ میری طرف دیکھ لیتا میں نے فائل نمبر ۲ کو کھولا تو میری روح خوش ہو گئی۔ اس کے اندر اسرائیلی نیوکلیائی ائلوں کے نظام کا سارے کا سارا نقشہ ایک پورے صفحے کی شکل میں موجود تھا۔ مجھے صفحے کی فوٹو اتارنی تھی۔ فائل کا یہ صفحہ میرے سامنے کھلا تھا۔ میں نے ایک جیب میں سگار نکال کر ہونٹوں میں دبایا اور دوسری جیب میں سے کیمرے والا لائٹر نکال لیا۔ میں ظاہر کر رہا تھا جیسے میں اپنے کام میں اتنا مصروف ہوں کہ مجھے سگار سلگانا بھی یاد نہیں ر حقیقت یہ تھی کہ میں نے اپنے لائٹر میں لگے خفیہ بٹن کو دبا دیا تھا اور اس کے اندر ہوئے کیمرے کی آنکھ نے میزائلوں کے نقشے کی چھ سات تصویریں کھینچ لی تھیں۔ تب نے سگار سلگا کر لائٹر جیب میں رکھا اور فائل کو بند کر دیا۔ پھر باقی کی فائلوں کو بھی جوڑ اٹھایا اور واپس الماری میں رکھ کر الماری کو بند کر کے لاک کر دیا۔

میں نے اپنا کام ختم کر لیا تھا۔ جب میں تہہ خانے سے نکلنے لگا تو یہودی گارڈ نے ایک ر پاؤں فرش پر مار کر مجھے سیلوٹ کیا۔ ایک بار تو میں ڈر گیا۔ مگر فوراً ہی سنبھلا اور یاں چڑھ کر اوپر والے کمرے میں سے ہوتا ہوا آفس کی عمارت کے برآمدے میں آیا۔ میں جلدی سے جلدی اپنے مکان پر پہنچ کر کیمرے کی فلم کو ڈیویلپ کر کے یہ

دیکھنا چاہتا تھا کہ فائل کے صفحے کی تصویریں اتری بھی ہیں کہ نہیں۔ میری گاڑی پارکنگ لاٹ میں کھڑی تھی۔ جونہی میں گاڑی کی طرف بڑھا سامنے سے ایک نوجوان یہودی عورت میری طرف مسکراتی ہوئی آئی اور میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بولی۔

"ڈیئر! اوہ ڈیئر۔ میں حیرانی سے اسے تکنے لگا۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔ لیکن آخر انسان ہوں۔ بھول گیا کہ میں جس شخص کے بھیس میں ہوں یہ اس کی کوئی قریبی عزیز بھی ہو سکتی ہے۔ میری بدقسمتی کہ میرے منہ سے نکل گیا "میڈم! میں نے تمہیں پہچانا نہیں" اس عورت کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا کہنے لگی۔ "دایان ڈیئر! تم اپنی منگیتر کو بھی نہیں پہچانتے؟" میرے پاؤں تلے سے ایک بار تو زمین نکل گئی۔



میں جس کا ہم شکل تھا اس کی منگیتر میرے سامنے کھڑی تھی۔ اب وہ میری منگیتر بھی تھی۔ اور میں نے اسے نہیں پہچانا تھا۔ مجھ سے ایک بہت بڑی غلطی ہو گئی تھی۔ لیکن مجھے اس کی تصویر دمشق کی خفیہ سروس والوں نے نہیں دکھائی تھی اور میں کوئی پیشہ ور جاسوس بھی نہیں تھا۔ میں تو اسلامی اخوت اور ایک برادر اسلامی ملک کی محبت کی وجہ سے یہ سب کچھ کر رہا تھا۔ پھر بھی ذرا سی غلطی مجھے فائرنگ سکواڈ کے سامنے کھڑا کر سکتی تھی۔ میں نے ایک لمحے کے اندر اپنے آپ کو سنبھالا۔ اس کا نام اب مجھے یاد آ گیا تھا۔ میں نے سخت افسوس کے انداز میں اپنا ہاتھ ماتھے پر مارا اور اس کا نام لے کر کہا۔

"مائی ڈیئر! اب تمہیں اندازہ ہو گیا ہو گا کہ دشمن نے مجھے جیل میں کیسی کیسی اذیت دی ہے۔ انہوں نے میرے دماغ کو کچھ اس طرح سے بجلی کے جھٹکے دے کر برین واش کیا ہے کہ میں پہلی نظر میں کسی کو بھی نہیں پہچان سکتا۔ اس کا ثبوت تمہیں ابھی مل گیا ہے کہ میں اپنی جان سے زیادہ عزیز منگیتر کو بھی نہیں پہچان سکا"۔

میں نے اسے اپنے ساتھ گاڑی میں بٹھا لیا اور اس کے ساتھ اپنی قید کے زمانے کی باتیں کرنے لگا۔ ساتھ ہی ساتھ میں اپنی منگیتر نادیا کے چہرے کی بھی سٹڈی کرتا جاتا تھا۔ کہ اسے مجھ پر کہیں کوئی شک تو نہیں ہو گیا۔ میں تو اسی نتیجے پر پہنچا کہ اسے مجھ پر شک نہیں ہوا۔ کیونکہ وہ مجھ سے گھل مل کر باتیں کرنے لگی تھی۔ وہ بتانے لگی کہ تمہاری یاد میں میں نے کتنی پریشانی سے یہ دن گذارے۔ پھر جب یہ خبر سنی کہ تم جیل سے فرار ہو کے ہو تو روز دعائیں مانگتی کہ تم خیریت سے یہاں پہنچ جاؤ۔ گاڑی دایان کے بنگلے یعنی میرے

گھر کی طرف جا رہی تھی۔ ایک چوراہے میں پہنچ کر نادیا نے کہا۔

"ڈیئر! مجھے یہیں اتار دو۔ آنٹی کی خبر لینے ہسپتال جانا ہے مجھے' میں کل تمہارے پاس آؤں گی۔ دوپہر کا کھانا ہم اکٹھے ہی کھائیں گے"۔

میں نے گاڑی ایک طرف کر کے روک لی۔ وہ دروازہ کھول کر اتری اور مسکرا کر ہاتھ ہلاتی فٹ پاتھ پر چل پڑی۔ میں نے گاڑی آگے بڑھالی۔ سوچنے لگا کہیں میرا راز فاش تو نہیں ہو گیا؟ مگر اب چاہے جو کچھ بھی ہو مجھے جتنی جلدی ہو سکے فائل نمبر ۲ کی فلم ڈیولپ کر کے حیفہ میں مقیم اپنے ایک سیکرٹ ایجنٹ تک پہنچانی تھی جس کا پورا پتہ مجھے دے دیا گیا تھا اور جس کی تصویر بھی مجھے دکھا دی گئی تھی۔

بنگلے میں آتے ہی میں نے نوکر کو کافی تیار کرنے کو کہا اور خود تہہ خانے میں اتر گیا۔ یہاں ایک چھوٹا سا کیبن تھا جہاں اصلی جاسوس دایان فلمیں وغیرہ ڈیولپ کیا کرتا تھا۔ ہر قسم کا سامان موجود تھا۔ میں نے کیبن بند کر کے بتی بجھائی اور بہت ہی دھیمی لال روشنی میں لائٹر کے اندر سے فلم نکال کر اس کی ڈیولپنگ شروع کر دی۔ تمام مرحلوں میں سے گذارنے کے بعد میں نے فلم کو کیمیاوی لیکوڈ میں سے نکال کر دیکھا تو میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ سگریٹ فائل نمبر ۲ کے خفیہ بلیو پرنٹ کی ساری کی ساری تصویریں موجود تھیں۔ میں نے ان تصویروں کو وہیں ضائع کر دیا اور فلم کے نیگٹو کے کیپسول کو سیاہ کاغذ میں لپیٹ کر اپنی جیکٹ کے کالر کے اندر والے ایک خفیہ سوراخ میں چھپا دیا۔

اب مجھے شہر میں مقیم اپنے خفیہ ایجنٹ کے پاس پہنچ کر یہ فلم اس کے حوالے کرنی تھی۔ یہی میرا دشمن کے ملک میں سب سے اہم مشن تھا۔ میں تہہ خانہ بند کر کے اوپر ڈرائینگ روم میں آگیا۔ ملازم نے کافی لگا دی ہوئی تھی۔ میں کافی بنا رہا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ کئی اندیشے میرے دل میں جاگ پڑے۔ میں نے ریسیور اٹھایا دوسری طرف میری منگیتر بول رہی تھی۔ "ہیلو دایان! آنٹی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے کل مجھے اسے دوسرے ہسپتال میں لے جانا ہو گا۔ کیوں نہ ہم آج ڈنر پر اکٹھے ہوں۔ کیا خیال ہے؟"

میں نے حامی بھر لی۔

نادیا کی آواز آئی۔ "میں سات بجے تمہارے پاس پہنچ جاؤں گی۔ پھر ہم کسی اچھے سے ریستوران میں بیٹھ کر کھانا کھائیں گے اور باتیں بھی کریں گے۔"

اس نے فون بند کر دیا میں نے گھڑی دیکھی۔ شام کے سات بجنے میں ابھی دو تین گھنٹے باقی تھے۔ میرے پاس اتنا وقت تھا کہ میں مائیکرو فلم اپنے ایجنٹ تک پہنچا دوں۔ میں نے جلدی سے کافی کا گھونٹ بھرا اور باہر نکل گیا۔ اپنے ایجنٹ کا ایڈریس خفیہ کوڈ میں میری ڈائری میں لکھا ہوا تھا۔ میری گاڑی تیزی سے شہر کی سڑکوں پر سے گذرتی ہوئی اس ڈیپارٹمنٹل سٹور کے چوراہے میں پہنچ گئی جس کے بارے میں مجھے بتایا گیا تھا کہ وہاں سے دائیں جانب مڑنا ہے۔ میں نے گاڑی دائیں جانب موڑ دی۔ یہ سڑک شہر کی گنجان آبادی کی طرف جاتی تھی۔ میں نے جیب سے نوٹ بک نکال کر ایجنٹ کا پورا ایڈریس دیکھا۔

تھوڑی دیر بعد میری گاڑی ایک چھوٹی سی گلی کے پاس آگئی۔ گاڑی کو میں نے ایک طرف اندھیرے میں پارک کر دیا۔ گلی میں صرف ایک بتی جل رہی تھی۔ جس کی وجہ سے وہاں صرف کونے میں ہی تھوڑی سی روشنی تھی۔ باقی گلی اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ ہمارے ایجنٹ کی اس گلی میں پرانی کتابوں کی دکان ہے۔ میں گلی میں پیدل چل پڑا۔ گلی خالی خالی تھی۔ صرف اوپر مکانوں میں کہیں کہیں روشنی ہو رہی تھی اور کسی وقت کسی عورت یا بچے کی آواز سنائی دے جاتی تھی۔ گلی میں تقریباً ساری دکانیں بند تھیں۔ صرف ایک دکان کھلی تھی جس کے باہر عبرانی زبان میں پرانی کتابیں لکھا ہوا تھا۔ بڑی ہی بوسیدہ دکان تھی۔ ایک طرف کو جھکی ہوئی الماریوں میں کتابیں زبردستی بھری ہوئی تھیں۔ فرش پر بھی پرانی کتابوں کے ڈھیر لگے تھے۔ ایک ادھیڑ عمر کا آدمی پرانی سی میز کے پیچھے بیٹھا ٹیبل لیمپ جلائے کسی خستہ حال کتاب کے اوراق بڑی احتیاط سے پلٹ رہا تھا۔ اس کا حلیہ یہودی پادریوں ایسا تھا۔ چھوٹی سی داڑھی اور سر پر گول ٹوپی۔ آنکھوں پر نظر کی عینک۔ ایش ٹرے میں پاس ہی بجھا ہوا سگار اور چائے کی خالی پیالی پڑی تھی۔ میں دکان میں کتابیں دیکھنے لگا۔ اس نے بھی مجھے گاہک سمجھتے ہوئے کوئی توجہ نہ دی۔ یہ وہی شکل تھی جس کی تصویر مجھے دمشق میں دکھائی گئی تھی۔ یہی وہ اپنا ایجنٹ تھا جس کو مجھے سگریٹ

فائل کی مائیکرو فلم دینی تھی۔

ابھی میں اپنے ایجنٹ سے بات کرنے کے لئے آگے بڑھا ہی تھا کہ گلی میں بھاری قدموں کی آوازیں سنائی دیں پھر اچانک پولیس کے چار مسلح سپاہی دکان میں گھس آئے۔ ایجنٹ نے چہرہ اٹھا کر بڑے سکون سے پولیس کے سپاہیوں کی طرف دیکھا۔ ان کے ساتھ ایک خفیہ پولیس کا انسپکٹر بھی تھا۔ میں پریشان سا ہو گیا مگر بڑے اطمینان سے ایک طرف کھڑا رہا۔ یہودی خفیہ انسپکٹر نے اپنے ایجنٹ کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ "تمہیں ہمارے ساتھ چلنا ہو گا"۔

ایجنٹ نے بڑے اعتماد کے ساتھ پوچھا۔

کیا تمہارے پاس میرے وارنٹ ہیں؟ کیا تم مجھے بتاؤ گے کہ مجھے کس لئے گرفتار کیا جا رہا ہے؟"

یہودی انسپکٹر نے جیب سے اس کی گرفتاری کا کاغذ نکال کر اسے دکھایا۔ ایجنٹ نے پوچھا۔ "میرا جرم کیا ہے؟"

انسپکٹر بولا۔ "یہ تمہیں پولیس اسٹیشن پہنچ کر معلوم ہو جائے گا"۔

اپنے ایجنٹ کو سپاہی اپنے حصار میں لے کر دکان سے باہر نکلے تو یہودی انسپکٹر میری طرف متوجہ ہوا۔

"تم کون ہو؟"

میں نے بے نیازی سے جواب دیا کہ میں پرانی کتابیں دیکھنے آیا تھا۔ یہودی انسپکٹر نے مجھ سے میرا آئی ڈی کارڈ طلب کیا۔ میں اپنا آئی ڈی کارڈ اسے دکھانا نہیں چاہتا تھا مگر صورت حال ایسی بن گئی تھی کہ مجھے اپنا کارڈ دکھانا ہی پڑ گیا۔ کارڈ پر میری تصویر تھی اور خفیہ سروس کی مہر لگی تھی۔ یہودی انسپکٹر نے بڑے ادب سے کارڈ مجھے واپس کیا اور سلام کر کے دکان سے نکل گیا۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ ڈنر کا وقت قریب آ رہا تھا۔ گلی سے باہر آیا تو دیکھا کہ یہودی پولیس اپنے ایجنٹ کو جیپ میں بٹھا کر لئے جا رہی تھی۔ یہ خطرے کا سگنل تھا۔ میں گاڑی میں بیٹھا انجن سٹارٹ کیا اور اپنے بنگلے کی طرف روانہ ہو گیا۔

===== ❑ ❑ =====

میری منگیتر نادیا سات بجے شام میرے بنگلے پر پہنچ گئی۔

میں نے رسمی طور پر اس کی آنے کی خیریت پوچھی اور پھر ہم گاڑی میں بیٹھ کر شہر کے ایک ریستوران کی طرف چل پڑے۔ یہ ریستوران نادیا کی پسند تھی اور مجھ سے پہلے وہ اپنے اصلی منگیتر دایان کے ساتھ اکثر وہاں کھانا کھانے آتی رہی تھی۔ میں نے ریسٹوران میں داخل ہونے کے بعد ایسی اداکاری کی جیسے میں پہلے کئی بار اس جگہ آتا رہا ہوں۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ میں وہاں کے بیروں اور سکیورٹی والوں کی شکلیں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ ہم ایک میز پر جا کر بیٹھ گئے۔ نادیا نے مینو میری طرف کر دیا جس پر اس رات کے کھانوں کے نام درج تھے۔ میں نے سارڈین مچھلی کا آرڈر دیا تو نادیا نے چونک کر مجھے دیکھا۔ وہ اپنی بڑی بڑی آنکھیں جھپکاتے ہوئے بولی۔

"دایان! معلوم ہوتا ہے دمشق انٹیلی جنس نے تمہارا کھانے کا ذوق بھی تبدیل کر دیا ہے۔ تم تو سارڈین مچھلی کو سخت ناپسند کرتے تھے۔"

ان چھوٹی چھوٹی باتوں کا میں کہاں تک خیال رکھ سکتا تھا۔ مجھے اصلی دایان کی کئی ذاتی پسند ناپسند کی باتوں کا علم نہیں تھا۔ میں بالکل نہ گھبرایا۔ اور وہی برین واشنگ کا بہانہ بناتے ہوئے نادیا سے کہا۔ "تم ٹھیک کہتی ہو ڈیئر یہ برین واشنگ کا ہی اثر ہے۔ اب مجھے سارڈین مچھلی بری نہیں لگتی"۔

سکریٹ فائل نمبر ۲ کی مائیکرو فلم میرے کوٹ کے کالر کے اندر اسی طرح حفاظت سے پڑی تھی۔ یہ فلم میں اپنے پرانی کتابوں والے ایجنٹ تک نہ پہنچا سکا تھا۔ میرے دل

میں رہ رہ کر یہ خیال اٹھ رہا تھا کہ پولیس اسے پکڑ کر لے گئی ہے۔ ادھیڑ عمر کا کمزور سا آدمی ہے۔ کہیں اسرائیلی پولیس کے تشدد سے گھبرا کر اپنے سارے راز نہ اگل ڈالے۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ میں اسرائیلی سی آئی اے کا سب سے ٹاپ کا جاسوس ہوں اور اس پوزیشن میں ہوں کہ اپنے ایجنٹ کی مدد کر سکوں۔ چونکہ میں اصلی جاسوس دایان نہیں تھا بلکہ ہم شکل ہونے کی وجہ سے اس کا کردار ادا کر رہا تھا۔ اس لئے قدرتی طور پر یہ خیال پہلے میرے ذہن میں نہیں آیا تھا۔ میں ریستوران سے جلدی اٹھ کھڑا ہوا۔ نادیا ابھی بیٹھنا چاہتی تھی مگر میں نے اسے کہا کہ مجھے سی آئی اے ہیڈ کوارٹر میں ایک ضروری کام یاد آگیا ہے۔ وہ بادل نخواستہ میرے ساتھ چل پڑی۔ میں نے اسے اس کے بنگلے کے باہر اتارا اور خود اسرائیلی سی آئی اے کے ہیڈ کوارٹرز کی طرف گاڑی ڈال دی۔

اس وقت رات کے نو بج چکے تھے۔ سڑکوں پر روشنی تھی اور بلند عمارتوں میں بھی روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ سی آئی اے کا ہیڈ کوارٹر شہر کے شمالی کونے پر ایک پارک کے عقب میں واقع تھا۔ اس کا آہنی جنگلے والا بڑا گیٹ بند تھا۔ گارڈ ڈیوٹی پر کھڑا تھا مگر میرے لئے وہاں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ اپنا آئی ڈی کارڈ ہی کافی تھا۔ اس وقت ڈپٹی ڈائریکٹر سی آئی اے مسٹر ساول اپنے کمرے میں موجود تھا۔ معلوم ہوا کہ شام کو جو شامی جاسوس پکڑا گیا ہے اس سے پوچھ گچھ ہو رہی ہے۔ اسرائیلی ڈپٹی ڈائریکٹر نے میرے لئے کافی منگوائی اور مجھے سگار پیش کرتے ہوئے کہا۔

"کتابوں کی دکان میں تمہاری موجودگی سے کم از کم ہمیں حیرانی نہیں ہوئی۔ کیونکہ ہمیں معلوم تھا کہ تم بھی اس شامی ایجنٹ کے پیچھے لگے ہوئے ہو"۔

اس نے خود میرے بچاؤ کا جواز پیدا کر دیا تھا۔ میں نے سگار سلگانے کے بعد اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔

"مجھے اپنے خاص مخبروں کی زبانی معلوم ہو چکا تھا کہ یہ شخص جو پرانی کتابوں کی دکان کرتا ہے دشمن کا جاسوس ہے مگر ابھی تک میں کوئی ثبوت حاصل نہ کر سکا تھا"۔

ساول نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ثبوت ہمارے پاس موجود ہے"۔

یہ کہہ کر اس نے میز کی دراز سے فائل نکالی۔ اسے ایک خاص جگہ سے کھول کر میرے آگے رکھ دی۔

"یہ دیکھو ثبوت۔ دمشق میں شاید تم نے ان میں سے کچھ چہروں کو دیکھا ہو"۔

فائل میں بڑے سائز کی بلیک اینڈ وائٹ ایک فوٹوگراف تھی جس میں پرانی کتابوں کی دکان والا ہمارا ایجنٹ دمشق میں شامی خفیہ ایجنسی کے چیف کے آفس میں بیٹھا اس سے باتیں کر رہا تھا۔ دو ڈپٹی چیف بھی موجود تھے۔ میں ان سب کو جانتا تھا۔ گرفتار شدہ شامی مسلمان جاسوس کو موت کی سزا سنانے کے لئے اتنا ثبوت ہی بہت تھا۔ مگر کسی جاسوس کو ویسے ہی موت کی سزا نہیں دے دی جاتی۔ خوفناک اذیتیں دے کر اس کے اندر چھپے ہوئے سارے راز اگلوانے کی کوشش کی جاتی ہے اور اذیت کے ایسے انتہائی تکلیف دہ لمحوں میں کسی لمحے اس کی روح پرواز کر جاتی ہے۔ میرے سامنے سب سے پہلا کام یہ تھا کہ ان سنگدل یہودیوں کی قید سے اپنے ایجنٹ کو کسی طریقے سے فرار کراؤں اور اگر ہو سکے تو فائل نمبر ۲ کی فلم بھی اس کو دے کر بارڈر پار کرا دوں۔ میرے لئے یہ کام آسان ضرور تھا مگر خطرناک بہت تھا۔ ذرا سی بے احتیاطی اس کے ساتھ مجھے بھی موت کے منہ میں لے جا سکتی تھی۔ میں نے فائل واپس کر دی پھر ادھر ادھر کی باتوں کے بعد میں نے ڈپٹی چیف سے کہا۔

"یہ بڑا ٹاپ کا شامی جاسوس ہے"۔

"ماسٹر سپائی ہے دایان یہ"۔ ڈپٹی چیف نے کرسی کے ساتھ ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔

میں اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ میں اس قسم کا تاثر دینا چاہتا تھا۔ جیسے میرا ذہن کوئی اہم گتھی سلجھانے میں مصروف ہے۔ میں نے رک کر ڈپٹی چیف کی طرف دیکھا اور کہا۔

"اس آدمی کے پاس عربوں کی ڈیفنس کے بڑے اہم راز ہوں گے۔ ہمیں اس بات کا خاص خیال رکھنا ہو گا کہ کہیں یہ خودکشی نہ کر لے"۔

ڈپٹی چیف نے پر اعتماد لہجے میں کہا۔

"اس کا ہم نے پورا بندوبست کر لیا ہے۔ اس کے آس پاس کوئی ایسی چیز نہیں رہنے دی کہ جس سے وہ اپنی جان لے سکے۔ اب وہ صرف اپنا سانس روک کر ہی خودکشی کر سکتا ہے"۔

"وہ ایسا نہیں کرے گا" میں نے نفی میں سر ہلا کر کہا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ ڈپٹی چیف نے فائل دراز میں رکھ دی میں نے سگار ایش ٹرے میں مسلتے ہوئے کہا۔

"میں اس شامی جاسوس سے تنہائی میں کچھ پوچھ گچھ کرنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ میں اس کے ملک کے بارے میں یہاں سب لوگوں سے زیادہ تجربہ رکھتا ہوں۔"

ڈپٹی چیف کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ شامی جاسوس اسی بلڈنگ کے نیچے ایک تہہ خانے میں بند تھا۔ وہ مجھے تہہ خانے میں لے آیا۔ یہاں چھت کے ساتھ ایک کمزور روشنی والا بلب جل رہا تھا۔ پرانی کتابوں کی دکان والا ہمارا ایجنٹ چٹائی پر سر جھکائے بیٹھا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ ابھی اس پہ تشدد نہیں کیا گیا۔ ایک یہودی پولیس انسپکٹر سٹول پر بیٹھا اس سے پوچھ رہا تھا۔ ہمیں دیکھ کر انسپکٹر اٹھ کر پرے ہو گیا۔ میں اس بات کی تسلی کر لینا چاہتا تھا کہ وہاں کوئی خفیہ مائیکرو فون نہیں لگایا گیا ہے۔ میں نے ڈپٹی چیف کو ایک طرف لے جا کر کہا۔ "ہمیں یہاں خفیہ مائیکرو فون ضرور لگا دینا چاہئے تاکہ اس شامی جاسوس کے تنہائی میں اپنے آپ سے باتیں کرنے کی آواز بھی ریکارڈ ہو جائے۔" ڈپٹی چیف بولا۔ "اس کا ہمیں خیال ہی نہیں آیا۔ میں صبح سب سے پہلے یہی کام کروں گا۔ تم فکر نہ کرو"

جب مجھے اطمینان ہو گیا کہ میں تنہائی میں شامی جاسوس سے جو باتیں کروں گا وہ ہمارے سوا دوسرا کوئی نہیں سن سکے گا تو میں نے یہ کہہ کر ڈپٹی چیف اور انسپکٹر کو باہر بھجوا دیا کہ میں اکیلے میں اس شخص سے کچھ پوچھ گچھ کرنا چاہتا ہوں۔

جب دونوں چلے گئے اور تہہ خانے میں صرف میں اور اپنا شامی ایجنٹ ہی رہ گیا تو میں نے سٹول پر بیٹھتے ہوئے اس کی طرف جھک کر اس کا اور اپنا مشترکہ کوڈ ورڈ دہرایا اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ میں نے اسے گریبان سے پکڑ کر اپنی طرف کیا اور کان میں آہستہ سے عربی زبان میں کہا۔

"بالکل خاموش رہنا"۔

شامی جاسوس کے لئے اس سے بڑی خوشی کی بات اور کیا ہو سکتی تھی کہ میں ان کا اپنا آدمی نکلا تھا۔ میں نے ابھی تک اس کا گریبان پکڑ رکھا تھا۔ پھر زور سے اسے پیچھے کی طرف دھکا دیا اور مصنوعی سخت لہجے میں ہلکی سی گالی دے کر کہا۔

"شیطان کی اولاد تم اس تہہ خانے سے زندہ بچ کر نہیں جا سکتے۔ ہاں اگر تم ہمیں شامی حکومت اور عربوں کے ڈیفنس کے وہ راز بتا دو جو ہم تم سے پوچھنا چاہتے ہیں تو نہ صرف یہ کہ ہم تمہیں آزاد کر دیں گے بلکہ تمہیں اتنی دولت دے کر فرانس کے کسی شہر میں پہنچا دیں گے جہاں تم ساری زندگی عیش و آرام سے گذار سکو گے"۔

پرانی کتابوں والا شامی جاسوس عجیب خالی خالی سی نظروں سے میری طرف تکنے لگا۔ میں نے جو کوڈ ورڈ بولا تھا وہ شامی انٹیلی جنس کا خاص ترین کوڈ ورڈ تھا۔ کہاں میرا رویہ اتنا سخت تھا کہ وہ تذبذب میں پڑ گیا تھا۔ میں سٹول سے اٹھ کر جیسے انتہائی غصے کی حالت میں چھوٹے سے تہہ خانے میں ٹہلنے لگا پھر لپک کر شامی جاسوس کو گریبان سے پکڑا۔ اسے جھنجھوڑ کر اپنے قریب کیا اور عربی میں آہستہ سے کہا۔

"تم خوش قسمت ہو کہ میں یہاں موجود ہوں۔ خبردار اپنے کسی ردعمل سے یہ ظاہر نہ ہونے دینا کہ تمہاری مصیبت کم ہو گئی ہے۔ اب تم مجھے اپنا کوڈ ورڈ بتاؤ میں نے اپنا کوڈ تمہیں بتا دیا ہے۔"

اس نے دھیمی آواز میں اپنا وہ کوڈ ورڈ دہرایا جو مجھے دمشق سے آتے ہوئے بتایا گیا تھا۔ اب اس میں کوئی شک و شبہہ نہیں رہا تھا کہ یہی وہ اپنا خاص ایجنٹ ہے جس کے ذریعے مجھے فائل نمبر ۲ کی انتہائی اہم اور خفیہ مائیکرو فلم دمشق پہنچانی تھی یہ فلم اس وقت بھی میرے کوٹ کے کالر میں محفوظ پڑی تھی۔ اس خیال سے کہ کسی خفیہ جگہ سے مجھے کوئی دیکھ نہ رہا ہو میں نے زور سے شامی ایجنٹ کے منہ پر ایک تھپڑ مار دیا۔ وہ لڑکھڑا کر پیچھے کو گرا اور ایک ہاتھ سے گال سہلاتے ہوئے میری طرف عجیب نظروں سے دیکھنے لگا۔

میں بلند آواز میں چلایا۔

"ہم تم سے وہ سارے راز اگلوا لیں گے جن کی ہمیں ضرورت ہے۔ تم اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہو؟"

ساتھ ہی میں نے زیر لب کہا۔ "یہ میرے ڈرامے کا بڑا ضروری حصہ ہے میں کل تمہیں یہاں سے تمہارے فرار کی سکیم بتا دوں گا؟" پھر میں اونچی آواز میں اسے برا بھلا کہتا تہہ خانے سے باہر نکل گیا۔

اپنے بنگلے میں آکر میں اسی سوچ میں پڑ گیا کہ شامی ایجنٹ کو اسرائیل کی قید سے کیسے نکالا جائے اور پھر کس جانب سے شام کی سرحد پار کرائی جائے؟ میں نے شام کی سرحدوں کے ساتھ ملے ہوئے اسرائیلی بارڈر کا نقشہ نکال کر اپنے سامنے رکھ لیا۔ پھر خیال آیا کہ اپنے ایجنٹ کو بھی بارڈر کے بارے میں بہت کچھ پتہ ہو گا۔ یہ کام اس سے مل کر ہی طے ہو سکے گا۔ اب صرف یہ مسئلہ حل کرنا تھا کہ وہ تہہ خانے سے کس طرح باہر آئے گا۔

اس کا حل بھی نکل آیا۔ وعدے کے مطابق میں تیسرے پہر ضروری پوچھ گچھ کا بہانہ بنا کر اپنے ایجنٹ کے تہہ خانے میں پہنچ گیا۔ انٹیروگیشن کے دوران اس پر ٹارچر کیا گیا تھا جس کی وجہ سے اس کی ایک آنکھ سوجی ہوئی تھی۔ میں نے کرخت لہجے میں بڑی سختی کے ساتھ اس سے باتیں شروع کر دیں اسی دوران اس سے پوچھا۔ "کیا تم اکیلے بارڈر کراس کر جاؤ گے؟" "ہاں"۔ اس نے دھیمی آواز میں کہا۔ میں نے اونچی آواز میں اسے گالی دی اور ساتھ ہی دھیمی آواز میں کہا۔

"میرے پاس مائیکرو فلم ہے وہ تمہیں اپنے ساتھ لے جانی ہو گی"۔

اس نے اپنی سوجی ہوئی آنکھ کو ہاتھ سے دباتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے اسے گردن سے پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا۔ اور آہستہ سے اپنی مٹھی میں دبائی ہوئی پرچی اس کے ہاتھ میں پکڑا دی۔ پھر اسے دھکا دے کر گرایا اور بڑبڑاتا ہوا باہر چل دیا۔ جو پرچی میں نے اسے دی تھی اس پر میرے بنگلے کا ایڈریس بھی تھا اور ساتھ ہی لکھا تھا کہ آج رات ساڑھے دس بجے کے بعد تہہ خانے اور اوپر سیڑھیوں والے گیٹ کے دونوں سنتری بے ہوش ہوں گے۔ یہاں سے نکل کر سیدھے میرے ایڈریس پر پہنچ جانا۔

مجھے معلوم تھا کہ گارڈ اور گیٹ کے پہرے داروں کو رات کے ساڑھے دس بجے اس خیال سے گرم کافی دی جاتی ہے کہ ڈیوٹی کے دوران انہیں نیند نہ آئے۔ میرے لئے ان کی کافی میں بے ہوشی کی دوائی ملا دینا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ یہ کافی اسرائیلی خفیہ کے ڈپٹی چیف کے سائیڈ والے کمرے میں تیار ہوتی تھی۔ اس رات میں کام کا بہانہ بنا کر دفتر میں ہی پرانی فائلوں کی ورق گردانی کرنے بیٹھ گیا۔ دس بجے تو سائیڈ روم میں گیا جہاں بجلی کے چولہے پر رکھے کافی پاٹ میں کافی گرم ہو رہی تھی۔ بے ہوشی کا بڑا زود اثر اور بے ذائقہ سفوف کیپسول کی شکل میں میری مٹھی میں تھا۔ ملازم باتھ روم میں تھا۔ میں نے کیپسول کھول کر سفوف کافی پاٹ میں گرا دیا۔ اور دبے پاؤں کمرے سے باہر آگیا۔ دوسری جانب سے برآمدے میں نکلا اور اپنی گاڑی میں بیٹھ کر واپس اپنے بنگلے کی طرف روانہ ہو گیا۔

مجھے اپنے منصوبے کی کامیابی کا سو فیصد یقین تھا۔ میرا ملازم میرا کھانا پکانے کے بعد مین دروازے کو لاک کر کے جا چکا تھا۔ میں نے تھوڑا سا کھانا گرم کر کے کھایا۔ پھر سوائے برآمدے کے کوٹھی کے سارے کمروں کی بتیاں گل کر دیں اور اپنے بیڈ روم کی کھڑکی تھوڑی سی کھول کر اپنی نظریں گیٹ پر جما دیں۔ اپنے ایجنٹ کو اسی راستے سے آنا تھا۔ خطرہ یہی تھا کہ شامی ایجنٹ سے کہیں کوئی بھول چوک نہ ہو جائے۔ پھر سارے کا سارا منصوبہ دھرے کا دھرا رہ سکتا تھا۔ یہی سوچ کر دل کو تسلی دیتا رہا کہ اپنا ایجنٹ کوئی اناڑی نہیں ہے۔ تربیت یافتہ ہے اس قسم کے حالات سے خوش اسلوبی کے ساتھ گذر جانے کی اسے باقاعدہ ٹریننگ ملی ہوئی ہے۔

میرا خیال درست نکلا۔ شامی ایجنٹ میرے بنگلے پر پہنچ گیا۔ وہ گیٹ میں داخل ہونے کی بجائے دیوار پھاند کر باغیچے میں آیا تھا۔ میں اسے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اسے ہدایت کر دی تھی کہ کچن والی کھڑکی کھلی ہو گی۔ چنانچہ وہ کچن کی طرف بڑھا۔ میں بھی کچن میں آگیا۔ اس نے کھڑکی بند کر دی اور بولا۔

"میں پیدل ہی آگیا ہوں مجھے ان سارے راستوں کا پتہ ہے"۔

"پیچھے کوئی گڑبڑ تو نہیں ہوئی؟"

میں نے تشویش کے ساتھ پوچھا۔ اس نے کہا۔ "بالکل نہیں کافی پیتے ہی گارڈ بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ میں تہہ خانے سے نکل کر اوپر آیا تو سیڑھیوں کے گیٹ والا سنتری اور اس کے ساتھ دوسرا سنتری بھی بے ہوش پڑا تھا۔ میں نے دوڑ کر عقبی دیوار پھلانگی اور اندھیرے میں تمہارے بنگلے کی طرف چل پڑا۔ یہ سارے علاقے میرے دیکھے بھالے ہیں"۔

میں اسے اپنے بیڈ روم میں لے گیا۔ جیکٹ میں سے مائیکرو فلم والا کیپسول نکال کر اس کے حوالے کیا۔ "یہ فائل نمبر2 کی مائیکرو فلم ہے۔ اسے تمہیں ہر حالت میں دمشق پہنچانا ہے۔ اب مجھے یہ بتاؤ کہ تم یہاں سے کیسے فرار ہو گے؟"

اپنے ایجنٹ نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "میرے لئے یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے پہلے تم مجھے کچھ کھانے کو دو۔ بھوک سے برا حال ہو رہا ہے۔"

میں کچن کی طرف جانے لگا تو پلنگ کے پاس رکھے ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ میں ایک پل کے لئے وہیں ساکت ہو گیا۔ پھر لپک کر رسیور اٹھایا۔ دوسری طرف سے اسرائیلی انٹیلی جنس کے ڈپٹی چیف کی گھبرائی ہوئی آواز آئی۔

"شامی جاسوس فرار ہو گیا ہے دایان۔ تم فوراً میرے بنگلے پر پہنچو"۔

===== ❑ ❑ =====

اپنے ایجنٹ کی نظریں مجھ پر لگی تھیں۔ میرے چہرے کے تاثرات سے اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے میں نے اسرائیلی ڈپٹی چیف سے کہا۔

"سر! میں ابھی آ رہا ہوں۔ آپ سارے شہر کی ناکہ بندی کا حکم دے دیں"۔

میں نے رسیور رکھ دیا۔ اپنے ایجنٹ نے مسکرا کر کہا۔

"وہ لوگ اب میری گرد کو بھی نہیں چھو سکتے۔ چاہے وہ سارے ملک کی ناکہ بندی کر لیں"۔

میں نے جیکٹ صوفے پر سے اٹھا کر پہنتے ہوئے کہا۔

"تم نیچے تہہ خانے میں چلے جاؤ۔ مجھے ابھی ہیڈ آفس پہنچنا ہے۔ تمہارے فرار نے وہاں کھلبلی مچا دی ہے"۔

ایجنٹ کہنے لگا۔ "یہ وقت تہہ خانے میں چھپنے کا نہیں مجھے رات کی تاریکی کا فائدہ اٹھا کر یہاں سے نکل جانا ہو گا۔"

"مگر تم اس وقت کہاں جاؤ گے؟"

میرے اس سوال پر ایجنٹ نے بڑے اطمینان کے ساتھ صوفے سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"اس کی تم فکر نہ کرو۔ میں جانتا ہوں مجھے اس وقت کہاں جانا ہو گا۔ تم صرف مجھے کوئی پستول اور کچھ گولیاں دے دو۔"

میں نے اسے الماری میں سے پستول اور گولیاں نکال کر دے دیں اسے کہا کہ وہ کچھ کھا کر جائے۔ ایجنٹ بولا۔

"شیر جہاں جاتا ہے اپنی خوراک پیدا کر لیتا ہے۔ میں اب پنجرے سے باہر ہوں تم فکر نہ کرو اگر میں مر بھی گیا جب بھی یہ مائکرو فلم دمشق پہنچ جائے گی"۔

اس نے پستول اور گولیاں اپنی قمیض کے اندر چھپا لیں اور کھڑکی میں سے بنگلے کے عقبی باغ میں کودا اور اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ میں اس مسلمان حریت پسند شامی کے اعتماد اور جذبے سے بڑا متاثر ہوا۔ جس قوم کے بوڑھوں میں ایسا جذبہ اور ناقابل شکست اعتماد ہو وہ ایک نہ ایک دن اپنے مقاصد میں ضرور کامیاب ہو جاتی ہے۔

بہرحال اب مجھے اسرائیلی انٹیلی جنس کے ڈپٹی چیف کے پاس پہنچنا تھا۔ میں نے گاڑی نکالی اور اس کے بنگلے کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہ سلیپنگ سوٹ میں ٹیلی فون گود میں رکھے پریشانی کی حالت میں بیٹھا خدا جانے کہاں کہاں ٹیلی فون کر رہا تھا اور سخت لہجے میں ہدایات دے رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے فون ایک طرف رکھ دیا اور پریشانی کے عالم میں بولا۔

"یہ سب گارڈ نااہل ہیں۔ گدھے ہیں ان کی وجہ سے میری نوکری بھی خطرے میں پڑ گئی ہے"۔

"مگر وہ فرار کیسے ہوا؟"

ڈپٹی چیف غضب ناک لہجے میں بولا۔

"کسی نے کافی میں بے ہوشی کی دوا ملا دی تھی۔ سب گارڈز بے ہوش ہو گئے۔ میں نے سب کو معطل کر دیا ہے۔ مگر دایان اس شامی ایجنٹ کا پکڑا جانا بہت ضروری ہے۔ تم کچھ کرو۔ مجھے اسرائیلی پولیس پر کوئی بھروسہ نہیں ہے"۔

میں بھی یونہی پریشانی دکھانے کے واسطے بے چینی سے ٹہلنے لگا۔ پھر آہستہ سے میز پر مکا مارا اور کرسی پر بیٹھ گیا جیسے کچھ سوچ رہا ہوں۔ دراصل میں یہ سوچ رہا تھا کہ کونسی ایسی ترکیب ہو کہ اسرائیلی پولیس اور سی آئی ڈی کے کمانڈوز کو کم از کم ایک دن کے لئے غلط راستے پر ڈال دیا جائے۔ اپنے ایجنٹ کی گفتگو سے مجھے ایک اشارہ ضرور ملا تھا کہ وہ لبنان کی طرف سے اسرائیل کی سرحد پار کرے گا۔ چنانچہ میں یہودی پولیس کو لبنان کی

سرحد کی طرف جانے سے روکنا چاہتا تھا۔ میں نے ڈپٹی چیف کی طرف دیکھا اور فضا میں انگلی کھڑی کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے یقین ہے وہ عمان کی طرف سے سرحد پار کرے گا دو روز پہلے اس بارڈر پر مجھے فلسطینی جاسوسوں کی سرگرمیوں کی اطلاع ملی تھی"۔

ڈپٹی چیف نے اسی وقت پولیس کمانڈوز کے چیف کو فون پر ہدایت کی کہ عمان کی سرحد پر فورس روانہ کر دی جائے۔ اس طرح میں نے اپنی حکمت عملی سے یہودی پولیس اور نیم فوجی دستوں کو لبنان کی سرحد سے دور کر دیا تاکہ اپنا ایجنٹ نسبتاً محفوظ حالات میں بارڈر کراس کر جائے۔ اس کے بعد میں اپنے بنگلے پر واپس آگیا۔ راستے میں مجھ محسوس ہوا کہ ایک گاڑی میرا پیچھا کر رہی ہے۔ یہ چھوٹی گاڑی ڈپٹی چیف کے بنگلے سے میرے نکل آنے کے بعد ہی میرے پیچھے لگ گئی تھی۔ پہلے تو میں نے یہی خیال کیا کہ کوئی شخص رات کے وقت کسی کلب سے نکل کر اپنے گھر واپس جا رہا ہو گا۔ لیکن جب میں نے مسلسل اسے اپنے پیچھے پیچھے آتے دیکھا تو سڑک پر ایک جگہ گاڑی روک لی۔ میرا خیال تھا کہ میرے تعاقب میں آنے والی گاڑی بھی رک جائے گی۔ مگر وہ رکی نہیں۔ بلکہ ایک چھوٹی سڑک کی طرف گھوم گئی۔ میں نے دو چار منٹ وہاں کھڑے رہ کر انتظار کیا پر وہ گاڑی پھر نمودار نہ ہوئی۔ میں اپنے بنگلے کی طرف چل پڑا۔ لیکن اب بہت محتاط ہو گیا تھا۔ اسرائیلی انٹیلی جنس نے اپنے کسی آدمی کو میرے پیچھے لگا دیا تھا۔ اس کا مطلب صاف تھا کہ انہیں مجھ پر کچھ نہ کچھ شک ضرور پڑ گیا ہے۔ میں کوئی تربیت یافتہ جاسوس نہیں تھا۔ اس لئے مجھ سے کوئی نہ کوئی غلطی ہو سکتی تھی جو میرے لئے زندگی کی آخری غلطی ثابت ہوتی۔ بنگلے پر آتے ہی میں نے تمام بتیاں بجھا دیں اور صرف بیڈ روم کا ٹیبل لیمپ جلتے رہنے دیا اور کپڑے بدل کر سب سے پہلے نیچے تہہ خانے میں گیا۔ وہاں الماری میں رکھے ہوئے وائرلیس سیٹ کا جائزہ لیا پھر تہہ خانہ بند کر کے اوپر ڈرائنگ روم میں آگیا۔ یہاں اندھیرا تھا۔ باہر باغیچے میں روشنی ہو رہی تھی۔ میں نے کھڑکی کا پردہ ہٹا کر گیٹ کی طرف دیکھا۔ گیٹ بند تھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ ایک طرف میری کار گیراج میں کھڑی تھی۔ مجھے

ایسے لگا جیسے کوئی سایہ گیراج سے نکل کر کچن کی طرف تیزی سے بھاگا ہے۔ میں نے الماری میں سے اپنا دوسرا پستول نکالا اور کچن کی طرف آگیا۔ کچن کا دروازہ بند تھا۔ میں ایک طرف چھپ کر کھڑا ہوگیا۔ مجھے یقین تھا کہ یہ وہی شخص ہے جو گاڑی میں میرا پیچھا کر رہا تھا۔ وہ پراسرار انسانی سایہ اس طرف آکر خزاں جھاڑیوں کے اندھیرے میں کہیں غائب ہو گیا تھا۔ میں نے سوچا ہو سکتا ہے وہ بنگلے کے پیچھے باغ میں آگیا ہو۔ برآمدے کی طرف سے جانے کی بجائے میں بیڈ روم کے غسل خانے کے پچھلے دروازے سے نکل کر باغ میں آیا تو اچانک پستول کے فائر کا دھماکہ ہوا اور گولی میرے بالکل قریب دروازے کی چوکھٹ میں گھس گئی۔ میں جلدی سے نیچے ہو گیا اور جدھر سے گولی آئی تھی اس طرف اوپر تلے چار پانچ فائر کر دیئے۔ مجھے کسی کے دوڑنے کی آواز آئی۔ میں اس کے پیچھے دوڑا۔ ایک سایہ دیوار پھاند کر دوسری طرف جاتا دکھائی دیا میں اس کی طرف لپکا۔ دیوار پر چڑھ گیا مگر دوسری طرف سوائے اندھیرے کے اور کچھ نہیں تھا۔



اب اس میں کسی شک شبے کی گنجائش نہیں رہی تھی کہ اسرائیلی انٹیلی جنس کو مجھ پر شک پڑ گیا ہے۔ لیکن سوال یہ تھا کہ اس پراسرار شخص نے مجھ پر پستول کا فائر کیا تھا۔ اگر اسرائیلی مجھے ہلاک ہی کرنا چاہتے تھے تو وہ بڑی آسانی سے دن کے وقت ایسا کر سکتے تھے۔ وہ کسی بھی وقت مجھے کسی سے مروا سکتے تھے۔ میں ان کے ملک میں تھا۔ اور دن کا بیشتر حصہ ان کے ساتھ گذارتا تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ کوئی چور اٹھائی گیرا تھا اور مجھے لوٹنے کے لئے میرے پیچھے لگا تھا۔؟

اگر ایسی بات ہوتی تو اسے مجھ پر فائر کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ میں نے تو باغیچے میں اس دیکھا ہی نہیں تھا۔ نہ میں اسے پکڑنے کی غرض سے اس کی طرف دوڑا تھا۔ صورت حال کچھ عجیب معمے کی شکل اختیار کر گئی تھی۔ ان تمام واقعات پر غور کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ مجھے اب وہاں سے بوریا بستر گول کر کے نکل جانا چاہئے۔ ویسے بھی میرا جو اہم ترین مشن تھا میں اس میں کامیاب ہو چکا تھا۔ یعنی اسرائیلی ڈیفنس اور آفینس کی مائیکرو فلم میں نے دمشق کی طرف روانہ کر دی تھی۔ اگر دیکھا جائے تو اب میرا وہاں کوئی کام نہیں تھا۔ حالات بھی غیر موافق رخ اختیار کرنے لگے تھے۔ چنانچہ میں نے فیصلہ کر لیا کہ اب وہاں سے نکل چلنا چاہئے۔

مگر واپس روانہ ہونے سے پہلے میں وائرلیس پر دمشق سے رابطہ قائم کر کے یہ ضرور معلوم کر لینا چاہتا تھا کہ کیا ان کو میری بھجوائی ہوئی خفیہ مائیکرو فلم مل گئی ہے۔ اس کے لئے مجھے مزید ایک دن انتظار کی ضرورت تھی تا کہ اپنا ایجنٹ بارڈر کراس کر کے دمشق

پہنچ جائے۔

دوسرے دن میں اپنے دفتر آگیا۔ ضروری کاغذات دیکھے میں نے کسی کو نہ بتایا کہ رات میرے بنگلے پر آکر کسی نے مجھ پر قاتلانہ حملہ کیا تھا۔ اچانک میری منگیتر نادیا کا ٹیلی فون آگیا۔ کہنے لگی۔

"دایان! آج موسم بڑا خوبصورت ہے۔ چھوڑو دفتر کے کام کو۔ میں پالز کیفے میں تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔ کچھ دیر بیٹھ کر کافی پئیں گے۔ باتیں کریں گے پھر دفتر واپس چلے جانا"۔

میں اسے انکار نہیں کر سکتا تھا۔ اس واسطے کہ کہیں میری بے اعتنائی اسے بھی کسی شک شبے میں نہ ڈال دے اور میں فرار ہونے سے پہلے ہی پکڑ لیا جاؤں۔ میں نے کہا "میں ابھی پہنچ رہا ہوں"۔

پالز کیفے ایک بڑے پر فضا مقام پر تھا۔ نادیا موسم بہار کا لباس پہنے باغ میں پام کے درختوں کے نیچے میرا انتظار کر رہی تھی۔ اس نے کافی کا آرڈر دیا اور موسم کے بارے میں باتیں شروع کر دیں۔ پھر اچانک میرے چہرے پر نظریں جما دیں۔ اور چند سیکنڈ تک مجھے گھورتی رہی۔ پھر بولی۔

"دایان! کیا بات ہے تمہارے بارے میں ڈیپارٹمنٹل خفیہ انکوائری کیوں شروع ہو گئی ہے؟"

میں چونک سا گیا۔ مگر چہرے پر کسی قسم کا تاثر نہ آنے دیا۔ یونہی بے نیازی سے سر کو ہلاتے ہوئے کہا۔

"ایسی انکوائری محکمے کے ہر افسر کی ہر سال ہوا کرتی ہے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے"۔

میں نے یونہی کہہ دیا۔ نادیا نے ذرا قریب ہو کر کہا۔

"مجھے چیف کی طرف سے خاص طور پر ہدایات پہنچائی گئی ہیں کہ میں تمہاری نقل و حرکت پر اپنی نظر رکھوں اور پھر انہیں رپورٹ دوں یہ بات مجھے بتانی نہیں چاہئے تھی مگر

تمہاری محبت سے مجبور ہو کر تمہیں کہہ دی آخر یہ لوگ ایسا کیوں کر رہے ہیں؟"

یہ سن کر مجھے پکا یقین ہو گیا کہ میں اسرائیلی انٹیلی جنس کی نظروں میں آگیا ہوں اور کسی نہ کسی وجہ سے انہیں مجھ پر شک پڑ چکا ہے اب میری خیریت اسی میں تھی کہ جتنی جلدی ہو سکے وہاں سے بھاگ نکلوں۔ میں نے نادیا کی یہ کہہ کر تسلی کر دی کہ یہ ایک معمول کی کارروائی ہوتی ہے اور ہر خفیہ افسر کی اسی طرح خفیہ انکوائری کی جاتی ہے۔ خاص طور پر ایسے لوگوں کی جو دشمن کے ملک میں قید کاٹ چکے ہوں۔ نادیا چپ ہو گئی۔ مگر لگتا تھا کہ اسے میری بات کا یقین نہیں آیا۔ اب مجھے اسے یقین دلانے کی اتنی ضرورت بھی نہیں تھی۔ کیونکہ میں وہاں سے فرار کا پروگرام دل میں پکا کر چکا تھا۔ مجھے صرف رات ہونے کا انتظار تھا۔

باقی کا سارا دن میں نے اپنے دفتر میں ہی گذار دیا۔ شام کو بنگلے پر آگیا۔ رات کے کھانے پر ڈپٹی چیف مجھ سے ملاقات کرنے آگیا۔ وہ مجھ سے مفرور شامی ایجنٹ کی تلاش کے بارے میں باتیں کرتا رہا۔ مگر میں نے محسوس کیا کہ اس کی نظریں بھی کچھ کچھ بدلی ہوئی تھیں۔ میں اس بات پر بڑا حیران تھا کہ اگر انہیں مجھ پر شک پڑ گیا ہے تو مجھے گرفتار کیوں نہیں کرتے۔ بعد میں پتہ چلا کہ جس یہودی جاسوس یعنی دایان کا میں نے بھیس بھرا ہوا تھا اسے اسرائیلی وزیر دفاع کی خاص مراعات حاصل تھیں اور وہ اس کے رشتے داروں میں سے تھا۔ اس لئے بغیر کسی ثبوت کے مجھ پر کوئی بھی ہاتھ نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔

اور ثبوت انہیں اسی رات مل گیا۔

ایسا ہوا کہ رات کو وہاں سے فرار ہونے سے پہلے میں نے سوچا کہ وائرلیس سیٹ میرے پاس ہے اور دمشق سیکریٹ سروس کا کوڈ بھی مجھے معلوم ہے تو کیوں نہ جانے سے پہلے ان سے بات کر کے فائل نمبر ۲ کی مائیکرو فلم کے بارے میں پوچھ لوں؟ اس طرح مجھے اطمینان حاصل ہو جائے گا کہ ہمارا شامی ایجنٹ بھی خیریت سے دمشق پہنچ گیا ہے اور خفیہ فلم بھی دمشق والوں کو مل گئی ہے۔

میں نے وہاں سے فرار ہونے کا پورا پروگرام بنا لیا ہوا تھا۔ اس مقصد کے واسطے میں

نے اپنی گاڑی گیراج سے نکال کر بنگلے کی پچھلی دیوار کے ساتھ کھڑی کر رکھی تھی۔ ضرورت کرنسی' ریوالور گولیاں اور پانی سے بھری ہوئی پلاسٹک کی بوتل بھی ساتھ رکھ لی تھی۔ جب رات کے ٹھیک بارہ بجے تو میں نے سیاہ رنگ کی جیکٹ پہنی۔ کمر کے ساتھ ریوالور اور پانی کی بوتل والی بیلٹ باندھی اور تہہ خانے میں اتر گیا تاکہ دمشق والوں سے وائرلیس پر بات کر سکوں۔ میں نے وائرلیس سیٹ کھول کر خاص فریکوئنسی ملائی اور کوڈ لفظ دہرانے لگا۔ مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ میرے بنگلے کے آس پاس ایک فرلانگ کے گھیرے میں اسرائیلی پولیس کی دو مائیکرو ویگنیں کھڑی ہیں جس کے اندر بیٹھے پولیس افسر اپنے اپنے سیٹوں پر میرے وائرلیس سگنل سن رہے ہیں۔ اور ان کے لئے یہ معلوم کرنا کہ یہ سگنل میرے بنگلے سے آ رہے ہیں کوئی مشکل بات نہیں تھی۔

===== ❑ ❑ =====

یہ بات میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی کہ اسرائیلیوں کو دمشق کا خفیہ کوڈ معلوم ہو گیا ہوا ہے اور وائرلیس پر میں جو پیغام دوں گا یا بات کروں گا اسرائیلی خفیہ پولیس اسے سمجھ جائے گی۔ جونہی دمشق کے ساتھ وائرلیس پر میرا رابطہ ہوا میں نے کوڈ زبان میں ان سے شامی ایجنٹ اور فائل نمبر۲ کی مائیکرو فلم کے بارے میں دریافت کیا کہ آیا یہ دونوں چیزیں ان کے پاس پہنچ گئی ہیں۔

پولیس ویگن میں وائرلیس سیٹوں کے آگے بیٹھے یہودی خفیہ افسروں نے جونہی میرے یہ سگنل سنے تو انہوں نے میرے سگنلز کی راہنمائی میں گاڑیاں میرے بنگلے کی طرف بڑھا دیں۔ پولیس کی پوری مسلح گارڈ ان کے ساتھ تھی۔ مجھے کچھ خبر نہیں تھی کہ میرا راز فاش ہو چکا ہے اور اسرائیلی پولیس میرے بنگلے کے قریب پہنچ چکی ہے۔ دمشق والوں کی جانب سے جونہی مجھے اشارہ ملا کہ دونوں مطلوبہ چیزیں انہیں مل گئی ہیں میں نے وائرلیس سیٹ کو وہیں چھوڑا اور تہہ خانے کی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر والی منزل میں آ گیا۔ اس وقت تک اسرائیلی پولیس کی دونوں گاڑیاں میرے بنگلے کے باہر آ گئی تھیں۔ بس یہ لوگ محض اس وجہ سے مار کھا گئے کہ انہیں پتہ ہی نہیں تھا کہ میں نے اسی رات وہاں سے فرار ہونے کا پروگرام طے کر رکھا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ سگنل دینے کے بعد میں اپنے بنگلے پر ہی رہوں گا۔ ادھر میری ایک خوش قسمتی یہ بھی ہوئی کہ ڈرائینگ روم کی کھڑکی کے قریب سے گذرتے ہوئے میری نظر یہودی پولیس کی ایک گاڑی پر پڑ گئی جو بنگلے کے گیٹ سے پیچھے ایک طرف کھڑی تھی۔

میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ فوراً سمجھ گیا کہ میرے سنگلز پکڑ لئے گئے ہیں۔ بس پھر کیا تھا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں کہ میں کیسے غسل خانے کے دروازے میں سے نکل کر پچھواڑے کے باغیچے میں پہنچا اور کیسے میں نے چشم زدن میں دیوار پھاندی اور دوسری طرف پہلے سے کھڑی کی ہوئی گاڑی میں بیٹھ کر اسے سٹارٹ کیا اور وہاں سے پوری رفتار کے ساتھ بھاگ نکلا۔ یہودی پولیس یہی سمجھی کہ یہ کسی دوسری کوٹھی میں سے نکلی ہوئی گاڑی کی آواز ہے۔ کیونکہ اگر میرے بنگلے سے کوئی گاڑی نکلتی تو مین گیٹ میں سے نکلتی جو کہ بند تھا۔ بس میری خوش نصیبی تھی کہ میں نے شروع رات ہی میں اپنی گاڑی بنگلے کی پچھلی دیوار کے ساتھ کھڑی کر دی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ کس طرف سے نکل کر مجھے کہاں جانا ہے۔ گاڑی کی ٹینکی میں نے پیٹرول سے بھروا لی تھی۔ شہر کی سڑکیں روشن تھیں۔ اور خالی خالی بھی تھیں۔ میں وہاں سے نکلتا چلا گیا۔ یہ بات میرے ذہن میں تھی کہ تھوڑی دیر بعد ہی پولیس میرے بنگلے میں داخل ہو جائے گی اور جب انہیں معلوم ہو گا کہ میں وہاں نہیں ہوں اور تہہ خانے میں وائرلیس سیٹ کھلا پڑا ہے تو وہ سمجھ جائیں گے کہ میں فرار ہو چکا ہوں اور اس کے ساتھ ہی بارڈر پر پوری سکیورٹی فورس کو چوکس کر دیا جائے گا۔ مجھے اس کی پرواہ نہیں تھی۔ کیونکہ مجھے اس کے باوجود دشمن کے علاقے سے راتوں رات نکل جانا تھا۔ اگر میں پکڑ لیا جاتا تو معاملہ مشکل ہو جاتا۔ لیکن اب میں آزاد تھا۔ اگرچہ میں دشمن کے ملک میں تھا مگر اسرائیل کا بارڈر کافی طویل ہے اور میں اس کے نازک اور حساس مقامات سے واقف تھا۔

شہر سے باہر نکلتے ہی میں نے گاڑی ریتلے میدان میں ڈال دی۔ یہاں کہیں کہیں کھیت تھے اور الگ الگ آبادیاں بھی تھیں۔ جہاں روشنی ہو رہی تھی۔ میں ان آبادیوں سے نکلتا چلا گیا۔ پھر اونچے نیچے چھوٹے بڑے خشک سنگلاخ ٹیلوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ان علاقوں میں بارشیں نہ ہونے کے برابر ہوتی ہیں اور آسمان اکثر بادلوں سے پاک رہتا ہے اور رات کے وقت جب ستارے نکلتے ہیں تو ان کی بڑی روشنی ہوتی ہے۔ یہ روشنی میری راہ نمائی کر رہی تھی۔ یہاں کوئی باقاعدہ سڑک اب نہیں تھی۔ ٹیلوں کے درمیان

کچے راستے پر میں گاڑی لئے چلا جا رہا تھا۔ میں جس شہر سے نکلا تھا وہ ایک سرحدی شہر تھا۔ اس کا بارڈر پچاس ساٹھ میل کے بعد شروع ہو جاتا تھا جو جنوب سے شمال کی طرف سینکڑوں میل تک چلا گیا تھا۔ مجھے اس کے درمیان میں ایک جگہ سے بارڈر کراس کرنا تھا۔ ابھی اسرائیلیوں نے پورے بارڈر پر خاردار تار نہیں لگائے تھے۔ سارے کا سارا بارڈر کھلا تھا مگر سکیورٹی فورس کا بڑا سخت انتظام تھا۔ ہر لحہ بارڈر سکیورٹی فورس کی گاڑیاں گشت کرتی رہتی تھیں اور کوئی سایہ بھی نظر آ جاتا تو فائر کھول دیا جاتا تھا۔

ایک خاص بلند ٹیلہ میری نشانی تھی۔

اس ٹیلے کے دامن میں پہنچ کر میں نے گاڑی کھڑی کر دی۔ اب میرا زندگی اور موت کا سفر شروع ہونے والا تھا۔ ابھی میں بارڈر سے دو تین کلومیٹر پیچھے تھا۔ میں اللہ کا نام لے کر اس ویران سنگلاخ علاقے میں چل پڑا۔ میں نے اپنی سمت کو ستاروں کے حساب سے متعین کر رکھا تھا۔ کیونکہ میرے پاس کوئی قطب نما نہیں تھا۔ ستارے خود میرے قطب نما تھے۔ اس راستے سے میں صرف ایک بار گذرا تھا اور مجھے معلوم تھا کہ کوئی آدھ گھنٹہ چلنے کے بعد بائیں جانب پتھروں کا بنا ہوا ایک اونچا گول ستون آئے گا۔ اس ستون کے اوپر بارڈر فورس کی پہلی چوکی تھی۔ جہاں دو مشین گنیں لگی ہوئی تھیں اور رات کو یہاں سے کسی کسی وقت سرچ لائیٹ بھی پھینکی جاتی تھی۔ یہاں کچھ دور تک خاردار تاروں کے گچھے پھیلا دیئے گئے تھے۔ مجھے اس چیک پوسٹ والے ستون سے اپنے راستے کا تعین کرنا تھا۔ اس ستون پر کوئی بتی روشن نہیں کی گئی تھی۔

میں ستاروں کی روشنی میں پوری طرح سے چوکس ہو کر چلتا چلا گیا میرا اندازہ بالکل صحیح نکلا۔ آدھے گھنٹے بعد مجھے ستاروں کے پس منظر میں وہ ستون ایک لاٹ کی طرح اوپر کو اٹھا ہوا نظر آ گیا۔

میں نے وہیں بیٹھ کر دس منٹ آرام کیا۔ پانی پی کر تازہ دم ہوا اور جیکٹ کی جیب میں سے ریوالور نکال کر اس کے میگزین کو چیک کیا۔ اس کے بعد اٹھا اور دائیں جانب جہاں زمین اونچی نیچی تھی چلنے لگا۔ میں خاردار تاروں کی آخری حد سے آگے جانا چاہتا تھا۔ اب

میرے کانوں میں سکیورٹی فورس کی گاڑیوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ ہر ایک ڈیڑھ منٹ کے بعد کوئی گاڑی پٹرول کرتی کچھ فاصلے پر سے گذر جاتی تھی۔ میں اسے دیکھ نہیں سکتا تھا۔ اونچی زمین کی منڈیر ختم ہوئی تو دور مجھے گاڑیوں کی روشنی بھی نظر آنے لگی۔ میں چیک پوسٹ کے ٹاور کو پیچھے چھوڑ کر خاردار تاروں سے کافی آگے نکل آیا تھا۔

مجھے ستاروں کی روشنی میں کچھ فاصلے پر سفید سفید برجیاں نظر آرہی تھیں جو اسرائیلی سرحد کا نشان تھا۔ اس سے آگے نومیزلینڈ تھی اور پھر عمان کی سرحد شروع ہو جاتی تھی۔ ان برجیوں کے پاس سے سکیورٹی فورس کی گاڑی منٹ ڈیڑھ منٹ کے بعد گذر جاتی تھی۔ ایک تو گاڑی کی اپنی ہیڈ لائٹیں تھیں اور دوسرے گاڑی کے اندر سے بھی اردگرد سرچ لائٹ پھینکی جاتی تھی۔ یہاں سے مجھے رینگ کر نکلنا تھا۔ یہ کام اتنا آسان نہیں تھا۔ ہر قدم پر موت منہ پھاڑے کھڑی تھی۔ ذرا سی بے احتیاطی یا پیٹرول گاڑی کی روشنی مجھ پر گولیوں کی بوچھاڑ کا باعث بن سکتی تھی۔ مگر اب میرے سامنے دوسرا کوئی راستہ بھی نہیں تھا۔ اگر آگے موت تھی تو پیچھے بھی میرے لئے موت کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ آگے یہ امید ضرور تھی کہ اگر بارڈر پار کر گیا تو پھر اپنی دنیا کی جنت میں داخل ہو جاؤں گا۔ میں اپنی اس وقت کی ذہنی کیفیت کو الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔

یہاں زمین کہیں ریتلی تھی اور کہیں پتھر کی طرح سخت تھی۔ اونچی نیچی بھی تھی۔ مگر یہاں گڑھے یا کھائیاں وغیرہ بالکل نہیں تھیں۔ آدمی پر اگر دور سے روشنی پڑے تو وہ نظر آسکتا تھا۔ میں زمین پر اوندھا لیٹ گیا۔ اور میں نے آہستہ آہستہ آگے کی طرف رینگنا شروع کر دیا۔ میں اس طرح رینگ رہا تھا جیسے آدمی پانی میں تیرتا ہے میرا ٹارگٹ دو سرحدی برجیوں کے درمیان تھا۔ اب صورتحال یہ تھی کہ بارڈر کی کچی سڑک پر سے اگر ایک گاڑی گذر جاتی تو پیچھے کی جانب سے دوسری گاڑی کی روشنی نظر آنے لگتی تھی۔ بلکہ اس کی روشنی سڑک پر بھی پڑتی تھی۔

میں برجیوں سے کوئی تیس پینتیس قدم پیچھے زمین پر خاموشی کے ساتھ اوندھا پڑ گیا۔ اور حالات کا بغور جائزہ لینے لگا۔ ہر گاڑی کے درمیان میرے اندازے کے مطابق ڈیڑھ

منٹ کا وقفہ پڑتا تھا۔ میرے سامنے ایک ہی راستہ تھا کہ جب ایک گاڑی گذر جائے تو جتنی جلدی اور جتنی تیزی سے ہو سکے میں بارڈر کراس کر جاؤں۔ کیونکہ پیچھے سے آنے والی گاڑی کی جو روشنی سڑک پر پڑتی تھی وہ ہر سیکنڈ کے بعد تیز ہوتی جاتی تھی۔ میرے پاس صرف چار یا چھ سیکنڈ ہی باقی رہ جاتے تھے۔ یہاں کوئی چانس نہیں تھا۔ آزادی یا موت والا معاملہ تھا۔ دوسرا کوئی راستہ نہیں تھا۔ جونہی ایک جیپ سامنے سے گذر کر ذرا دور ہوئی میں جتنی تیزی سے رینگ سکتا تھا رینگتا ہوا بارڈر لائن پر آگیا۔ پیچھے سے آنے والی گاڑی کی روشنی ابھی بہت مدھم تھی۔ یہی دو چار سیکنڈ میرے پاس تھے۔ آج بھی جب وہ سین میری آنکھوں کے سامنے آتا ہے تو میں حیران ہو جاتا ہوں کہ میں نے سرحد کیسے پار کر لی۔

مجھے کچھ معلوم نہیں کہ اس وقت میرے اندر اعتماد اور طاقت کہاں سے آگئی تھی۔ میں رول کرتا اپنے آپ کو لڑھکتا ہوا بارڈر لائن کراس کر گیا جونہی میں ریت کی ایک ڈھیری کے نشیب میں آیا اسرائیلی سکیورٹی فورس کی پچھلی گاڑی تیزی سے میرے قریب سے گذر گئی۔ اب میں دو ملکوں کی سرحدوں کی درمیانی پٹی یعنی نومیزلینڈ میں تھا۔ یہاں بھی میں کھڑے ہو کر دوڑ نہیں سکتا تھا۔ اس طرح دونوں طرف سے مجھ پر فائرنگ ہو سکتی تھی۔ میں کہنیوں کے بل رینگتا چلا گیا۔ جب عمان کی سرحد کے قریب پہنچا تو مجھ پر ایک فائر آیا۔ جارڈن کی سرحدی چوکی کے کسی سپاہی نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ تب میں نے عربی میں بلند آواز سے چیخ کر کہا کہ میں فلسطینی کمانڈو ہوں۔ میں مسلمان ہوں۔ اس پر سرحدی پوسٹ سے آتا فائر رک گیا۔ کچھ سپاہی دوڑتے ہوئے مجھ تک آئے اور مجھے اٹھا کر لے گئے۔ انہیں بہت جلد معلوم ہو گیا کہ میں اسرائیلی نہیں ہوں۔ دوسرے روز میں شامی انٹیلی جنس چیف کے دمشق ہیڈ کوارٹر میں بیٹھا تھا اور مجھے میرے مشن کی کامیابی پر ہر طرف سے مبارکباد مل رہی تھی۔ اور میں دل میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کر رہا تھا کہ اس نے مجھے برادر اسلامی ملک کی خدمت کا موقع دیا اور میرے وطن پاکستان کے وقار اور عزت میں اضافہ ہوا۔

اس وقت تک قائداعظم محمد علی جناح کی قیادت میں پاکستان دنیا کے نقشے پر ایک آزاد اسلامی مملکت کے طور پر ابھر چکا تھا۔ پاکستان میرا وطن تھا۔ میرا پاک وطن۔